دبستانِ گوشدہ

ادب اور کلچر

ڈاکٹر محمد علی اثر

دبستانِ گولکنڈہ

ادب اور کلچر

(مرتّبہ)

ڈاکٹر محمد علی اثر

(ناشر)

الیاس ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد

کلچر کے بارے میں اگرچہ کہ بعض کتابوں اور رسالوں میں چیدہ چیدہ مواد مل جاتا ہے لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ اس موضوع کے تحت چند اہم مضامین اور مقالات کو منتخب کر کے یکجا کیا جائے، اسی احساس کے پیش نظر راقم الحروف نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ مضامین کے انتخاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ گولکنڈہ کی ادبی خدمات اور سماجی و تہذیبی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے۔ مجھے امید ہے کہ قدیم اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

میں استاد محترم پروفیسر غلام عمر خاں، صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا تعارف تحریر فرمایا اور وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے میری رہنمائی کی۔

جناب محمد علی زیرک صاحب پرو پرائٹر الیاس ٹریڈرس بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں، جنھوں نے اس کتاب کو خصوصی دلچسپی اور توجہ سے شائع کیا ہے۔ جناب وقار خلیل اور عزیزی محمد افسر خاں نے اس کتاب کی اشاعت کے مختلف مراحل میں میرا ہاتھ بٹایا ہے جس کے لئے میں ان کا بھی سپاس گذار ہوں۔

محمد علی اثر

۱۹/جون ۱۹۸۱ء

اس کے ہمراہ ایک اجنبی بھی ہے جو جادوگر معلوم ہوتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دھوکا دے میں آپ کا نمک خوار ہوں اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ شہزادے کو اپنی بے پناہ قوت سے روک دیں۔ بادشاہ یہ سن کر خوش ہوتا ہے اور وہم کو گلے لگا کر کہتا ہے کہ "میں تمہاری وفاداری سے بہت خوش ہوں تم فوج بھیج کر دل اور نظر کو قید کر لو" اور وہ سب لوگ قید کر لیے جاتے ہیں۔

اس قید سے نظر کے نکلنے کی ایک صورت سامنے آتی ہے اس کے پاس وہ انگوٹھی ہے جو شہزادی حسن نے اسے دی تھی اور جس کی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص اسے منہ میں رکھ لے وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ نظر اس انگوٹھی کو منہ میں رکھ کر قید سے باہر آتا ہے اور شہر دیدار پہونچتا ہے۔ گھومتا پھرتا ایک باغ میں پہونچتا ہے اور وہاں چشمہ آب حیات دیکھتا ہے اس کے دل میں آب حیات پینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ پانی پینے کے لئے جیسے ہی منہ کھولتا ہے، انگوٹھی چشمے میں گر جاتی ہے اور چشمہ غائب ہو جاتا ہے۔ اب وہ سب کو نظر آنے لگتا ہے۔ رقیب جو اس کی تلاش میں پھر رہا ہے اسے پکڑ لیتا ہے، خوب مارتا ہے اور قید کر دیتا ہے اس قید میں وہ لٹ کے بال جلاتا ہے اور لٹ آکر اسے قید سے نکال لیتی ہے اور شہر دیدار واپس لے جاتی ہے۔ وہاں شہزادی حسن سے وہ اپنا سارا حال بیان کرتا ہے۔ شہزادی افسردہ ہو کر کہتی ہے کہ وہ تو دل سے ملنے کے لئے ایک ایک ___ دن گن رہی تھی۔ پھر وہ غمزہ کو بلاتی ہے اور اسے اپنے عشق کا راز بتاتی ہے، اور اسے کہتی ہے کہ تم غمزہ کے ساتھ جاؤ اور جلد سے جلد دل کو میرے پاس لے کر آؤ۔

ادھر عقل بادشاہ نے نظر کے فرار ہونے کے بعد قلعے پر سخت پہرہ لگوا دیا اور حکم دیا ہے کہ نظر جہاں کہیں ہو اسے فوراً قید کر لیا جائے۔ عقل کا دست راست جہد اپنے بیٹے توبہ کو نظر بند رکھنے اور گرفتار کرنے پر مقرر کرتا ہے۔ ادھر غمزہ اور نظر جو مسلسل سفر میں ہیں، جب چلتے چلتے تھک جاتے ہیں تو ایک جگہ آرام کرتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں۔ یہ جگہ توبہ کے گھر سے قریب ہے صبح کو ان کی موجودگی کی خبر توبہ کو ہوتی ہے اور وہ اپنی فوج کے ذریعے غمزہ و نظر

کا محاصرہ کرلیتا ہے۔ جنگ ہوتی ہے۔ غمزہ اور نظر توبہ کی فوج کو شکست دیتے ہیں اور اس کا قلعہ بھی لوٹ لیتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں قلندروں کا بھیس بدل کر شہر عافیت پہونچتے ہیں یہاں کا بادشاہ ناموس غمزہ کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ دونوں فاتح اب شہر تن کی طرف بڑھتے ہیں۔ غمزہ دعائے سیفی اپنے لشکر پر پھونک دیتا ہے اور سارا لشکر ہرنوں میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

ادھر توبہ شکست کے بعد بادشاہ عقل کے پاس پہونچتا ہے اور اس سے غمزہ کی بہادری کا ذکر کرتا ہے۔ عقل دل کو قید سے رہا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شہزادی حسن کی فوج بہت زبردست ہے تم اس سے کیسے جیت سکتے ہو۔ شہزادہ دل اس نصیحت کو نہیں سنتا اور مجبور ہوکر عقل کو فوج دے کر اسے شہزادی حسن کے شہر کا محاصرہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ یہاں سے قصے کا مرکز نظر کے بجائے دل ہوجاتا ہے۔ وہ حسن کے باپ عشق کی فوج پر حملہ کرنے کے لئے نکلتا ہے۔ اس کی فوج عقل کی فوج ہے اور اس کا سردار صبر ہے۔ یہ فوج ابھی تھوڑی دور ہی جاتی ہے کہ غمزہ کی فوج جو ہرنوں کی صورت میں ہے، سامنے آتی ہے۔ دل عقل کے حکم سے ان ہرنوں کا پیچھا کرتا ہے اور دھوکا کھاکر جنگل میں پہونچ جاتا ہے۔ اس وقت نظر اور غمزہ جو دل کو حسن کے پاس لے جانے کے لئے آرہے ہیں، آپس میں صلاح مشورہ کرکے یہ طے کرتے ہیں کہ انھیں شہر دیدار واپس چلا جانا چاہئے اور وہاں دل کا انتظار کرنا چاہئے۔

عقل، دل اور ان کی فوجیں ہرنوں کا پیچھا کرتے کرتے شہر دیدار کے قریب پہونچ جاتے ہیں۔ اس وقت غمزہ اور نظر حسن کے پاس پہونچ کر مشورہ کرتے ہیں اور طے پاتا ہے کہ حسن اپنے باپ عشق کو اطلاع دے وہ عشق کو خط لکھتی ہے اور عقل کی فوج کشی کا حال بیان کرتی ہے۔ عشق خط پڑھ کر آگ بگولہ ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ عقل کی یہ ہمت کہ میری بیٹی کے ملک پر حملہ کرے! اور اپنے سپہ سالار مہر کو حکم دیتا ہے کہ وہ جفا، مشقت اور درد کو ساتھ لے جائے

اور ایسا حملہ کرے کہ عقل کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ مہر کی فوج کثیر ہے۔ عقل اسے دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ غمزہ قامت، زلف عشق کی طرف سے لڑتے ہیں دل بہت پریشان نظر آتا ہے اسے خوف ہے کہ اس جنگ کی وجہ سے وہ حسن سے اور بھی دور ہو جائے گا۔ مگر خوشبوئی نام کی عورت اس سے آکر کہتی ہے کہ "پریشان مت ہو میں تمہاری مدد کروں گی۔

جنگ ہونے چار دن گزر جاتے ہیں۔ دونوں طرف کی فوجیں جمی ہوئی ہیں۔ حسن اب پریشان ہوتی ہے اور اپنے خادم خال سے مشورہ کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی بہن کو کوہ قاف سے بلوائے وہ بہادر بھی ہے اور عقل مند بھی وہ عاشقوں پر ظلم کرنا جانتی ہے۔ آپ دونوں مل کر یقیناً شکست فاش دے سکتی ہیں۔ خال عنبر کا ایک دانہ آگ پر رکھتا ہے اور حسن کی بہن آموجود ہوتی ہے۔ حسن اپنی بہن سے اپنے عشق کا حال بیان کرتی ہے اور کہتی کہ وہ دل کو دل سے چاہتی ہے مگر اس کا باپ عقل ہمارے درمیان حائل ہے حسن کی بہن کہتی ہے کہ اس کے پاس ایک تیرانداز ہلاک نامی ہے۔ وہ یہ جنگ فتح کر سکتا ہے۔

اب مہر اور ہلاک مل کر حملہ کرتے ہیں ہلاک زخم پر زخم کھاتا عقل کی فوجوں کو چیرتا چلا جاتا ہے۔ وہ دل کے بھی تیر مارتا ہے اور دل زخمی ہو کر گر پڑتا ہے۔ وہ اسی حالت میں دل کو اٹھا کر میدان جنگ سے باہر لے آتا ہے۔ عقل یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی فوج بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ عقل بھی غائب ہو جاتا ہے اور تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتا حسن کی فتح ہوتی ہے اور دل اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔ وہ بے ہوش ہے۔ حسن کے سامنے ہوش میں آتا ہے۔ زخموں سے چور اور تکلیف سے نڈھال ہے۔ دل کو اس عالم میں دیکھ کر حسن اپنی رازداں دائی ناز سے کہتی ہے کہ وہ دل سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ دل کو جلانے کی کوئی ترکیب کرو۔ ناز جواب دیتی ہے کہ فکر مت کرو۔ ادھر جنگ کے بعد مہر عشق بادشاہ کے پاس پہنچتا

ہے اور جنگ کا حال بیان کرتا ہے کہ بادشاہ عقل فرار ہو گیا ہے اور اس کا بیٹا دل گرفتار کر لیا گیا ہے۔ عشق یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ لاتوف عقل سے جو کام نہیں ہو سکتا تھا وہ اسے کرنے چلا تھا۔ اچھا ہوا اپنے کئے کی سزا پائی اور حکم دیتا ہے کہ دل کے گلے میں طوق ڈال کر اسے قید کر لیا جائے اور عقل جہاں بھی ہو گرفتار کیا جائے۔ ناز غمزہ اور عشق دل کی کڑی نگرانی کریں۔

مہر حسن کے پاس آکر بادشاہ عشق کا فرمان سناتا ہے۔ ناز حسن کو مشورہ دیتی ہے کہ صبر کرو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔ دل کو کہیں چھپا دیا جائے۔ چنانچہ دل کو چاہ ذقن میں چھپا دیا جاتا ہے۔ اسی کنویں میں آب حیات کا چشمہ بھی ہے اب حسن اور دل کے ملنے کی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ سالار مہر کی بیٹی ساحرہ ہے وہ دل کو آب حیات کے چشمے کے پاس کے جھجے پر لے جانے کا وعدہ کرتی ہے۔ حسن کی سہیلی زلف دل کو کنویں سے نکالتی ہے۔ وفا بھی وہاں آجاتی ہے اور دل کو سمجھاتی ہے کہ حسن نے مجبور ہو کر تمہیں کنویں میں چھپایا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو عشق تمہیں مروا دیتا۔ حسن تم کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اور پھر زلف اور وفا دل کو دلکش باغ میں لا کر چھوڑ جاتی ہیں یہاں کی فضا کا دل پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ بے خبر سو جاتا ہے۔

وفا حسن کو بتاتی ہے کہ دل باغ میں ہے وہ دوڑ کر اس کے پاس آتی ہے اور خوشی سے رونے لگتی ہے اس کے آنسو دل کے چہرے پر گرتے ہیں اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں دل کو جھجے میں لا کر رکھا جاتا ہے اور حسن اس سے روز ملتی ہے خیال وفا اور تبسم اس کا دل بہلاتے رہتے ہیں۔

یہاں ایک اور قصہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ رقیب کی بدذات بیٹی غیرا جو حسن کے پاس رہتی ہے دل پر عاشق ہو جاتی ہے۔ وہ سحر بھی جانتی ہے لہذا روپ بدل کر حسن کی صورت میں

آجاتی ہے اور خیال وفا اور تبسم کو حکم دے کر دل کو وصال کے چھجے میں بلواتی ہے اور اس سے ہم آغوش ہو جاتی ہے خیال یہ خبر حسن کو پہونچاتی ہے۔ حسن یہ سن کر زار و قطار رونے لگتی ہے وصال کے چھجے میں آکر غیر کو دل سے ہم آغوش دیکھتی ہے اور غیر سخت سست کہتی ہے۔ غیر سحر کے زور سے نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ حسن کو دل کی بے وفائی پر بھی غصہ آتا ہے اور حکم دیتی ہے کہ اسے غضب کے قید خانے میں ڈال دو۔ اور سخت نگرانی کرو۔ اُدھر غیر اپنے والد رقیب کے پاس پہونچ کر اپنا حال بیان کرتی ہے۔ وہ سحر کے ذریعے دل کو اڑا لاتا ہے اور ہجراں نام کے قلعے میں قید کر دیتا ہے یہاں دل پچھتاتا ہے۔ کبھی اپنے باپ عقل کو یاد کرتا ہے اور کبھی حسن کے حکم پر تعجب کرتا ہے۔ غیر اس کی حالت غیر دیکھ کر نادم ہوتی ہے اور حسن کو خط لکھتی ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہے اور دل کو معصوم بتاتی ہے حسن خط پڑھ کر شرمندہ ہوتی ہے اور اس طرح حسن و دل میں صفائی ہو جاتی ہے۔

پھر قصے کا خاص پلاٹ سامنے آتا ہے جو عقل و عشق کی جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ عقل کی فوج شکست کھا چکی ہے لیکن اس کا سپہ سالار صبر شہر ہدایت میں چلا جاتا ہے۔ اس کی فوج کا ایک سپاہی ہمت فوج لے کر پھر شہر دیدار کی طرف بڑھتا ہے لیکن تھوڑے کے بعد بہ ہے پاتا ہے کہ جنگ سے صلح بہتر ہے۔ اب ہمت عشق بادشاہ سے ملاقات بڑھاتا ہے۔ اس کو بہت سی کہانیاں سناتا ہے اور عقل بادشاہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ عشق ہمت کی باتوں سے خوش ہو کر کہتا ہے کہ وہ عقل کو اپنا وزیر بنائے گا۔ عشق جیسے بادشاہ کے پاس عقل جیسا وزیر ہونا چاہیئے۔ ہمت کہتا ہے کہ ہم نے عقل کو گمراہ کر دیا تھا ورنہ یہ سب کچھ نہ تھا۔ چنانچہ پھر عقل کے پاس جاتا ہے۔ عقل بھی عشق سے صلح مناسب سمجھتا ہے اور عشق کے پاس آتا ہے عشق اس کی بڑی قدر و منزلت کرتا ہے اب حسن و دل کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ جاتی۔ رہا آب حیات کی تلاش کا مسئلہ تو ایک دن نظر ہمت اور دل شراب کے نشے میں مست باغ میں گئے ہیں تو انھیں آب حیات کا چشمہ نظر

آتا ہے۔ چشمے کے پاس ایک بزرگ بھی نظر آتے ہیں۔ ہمت دل سے کہتا ہے کہ یہ حضرت خضر ہیں دل ان کی قدم بوسی کرتا ہے۔ خضر اسے دعائیں دیتے ہیں اب حسن و دل ہنسی خوشی ایک ساتھ رہتے ہیں۔" ایکس پر ایک صدقے ایکس پر ایک بلہار" بھر وجہی بتاتے ہیں کہ ان کے ہاں نو بیٹے پیدا ہوئے۔ ان بیٹوں میں سے سب سے بڑا بیٹا یہ "کتاب" ہے" لایق قابل مستند" جس کا ہر باب ہے۔

ملّا وجہی کا مقصد اپنے زمانے کی معاشرت یا اخلاق کی تصویر پیش کرنا نہیں ہے لیکن "سب رس" میں ایک ایسی دنیا ضرور سامنے آجاتی ہے جو محض فرضی نہیں ہے۔ "سب رس" کے مطالعے سے یہ بات سامنے آجاتی کہ اس کلچر میں بادشاہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کا دربار ساری سرگرمیوں کا مرکز ہے جہاں سے مختلف جانباز و جانثار اہم مہمات پر نکلتے ہیں۔ اس دور کی مختلف رسمیں اور تقریبات بھی "سب رس" میں ملتی ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اس کلچر میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ بادشاہ کا اہم ترین وصف عدل ہے اور فیاضی اس کی دوسری صفت ہے۔ رعایا کی غم گساری بھی بادشاہ کا فرض ہے۔ چنانچہ فریادیں سنتا اور رعایا کی خبر گیری کرتا نظر آتا ہے بادشاہ کی تلوار اور گھوڑے کی اس لئے تعریف کی جاتی ہے کہ یہ بادشاہت کی قوت کی علامتیں ہیں۔ رعایا بادشاہ کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ سارا معاشرہ آقاؤں اور خادموں میں بٹا ہوا ہے۔ جن اخلاقی اوصاف کی سب سے زیادہ قدر ہے وفا، جانبازی اور جانثاری ہیں مرد اور عورت کا تعلق بھی خاص نوعیت کا حامل ہے۔ مرد کی صفات میں قناعت و صبر کو اہمیت حاصل ہے۔ عورتوں کی صفات بھی تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

تاریخی اعتبار سے "سب رس" کی اہمیت دوہری ہے اولاً یہ کہ "خالص اور بے میل" تمثیل کے لحاظ سے ہمیشہ کی طرح یہ آج بھی منفرد ہے۔ ثانیاً یہ کہ "سب رس" اردو نثر

کا پہلا "ادبی" کارنامہ ہے اگر اس کی نثر کا مقابلہ جانم کی "کلمۃ الحق" سے کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ "سب رس" کا اسلوب بیان ادبی و علمی اسلوب کے دائرے میں آتا ہے اور "کلمۃ الحق" کی نثر اس صفت سے عاری ہے اور اس کی اہمیت صرف اولیت کی وجہ سے ہے۔ "کلمۃ الحق" میں تو نے مجموعے انداز میں مخصوص صوفیانہ خیالات کو بیان کیا گیا ہے جبکہ "سب رس" میں قرون وسطیٰ کے اس عالمگیر قصے کو موضوع فکر بنایا گیا ہے جو اس وقت کی ساری مہذب دنیا میں مقبول و معروف تھا۔ اس کے علاوہ سب رس کی زبان ایسے نئے لسانی و تہذیبی عناصر کے امتزاج سے بنی ہے جو اس دور میں ایک بالکل نئی چیز ہے اور جس کے سہرے فسانہ عجائب طلسم ہوشربا اور فسانہ آزاد کی نثر سے ملے ہوئے ہیں اس نئے اظہار بیان پر خود وجہی نے بھی اظہار افتخار کیا ہے اور اپنے اسلوب کی یہ خوبی بتائی ہے کہ اس میں نظم و نثر کی خصوصیات کو گھلا ملا کر ایک نئی لطافت اور ایک نئی ادا پیدا کی گئی ہے۔ یہ پہلی آواز ہے جو اسلوب بیان اور طرز ادا کو خاص اہمیت دے رہی ہے اب سے پہلے نثر کا مقصد صرف محض عوام تک اپنی بات پہونچانا تھا۔ اس میں اسلوب کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن "سب رس" میں اسلوب کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے دیکھئے وجہی ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔

"آج لگن اس جہان میں ہندستان میں ہندی زبان ہوں، اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر، گلا کوئی نیں بولیا۔ اس بات کوں"

"اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات میں نیں گھولیا یوں غیب کا علم نیں کھولیا۔"

وجہی کی عبارت میں یہ رنگینی جہاں شاعرانہ زبان کے استعمال سے پیدا ہوئی ہے۔ وہاں مقفیٰ و مسجع عبارت سے بھی اس کے حسن و دلکشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ سارا فن شعوری

فن ہے اور اس کا تعلق ان آرائشی فنون سے گہرا ہے۔ جن کے نمونے ہم خطاطی بیل بوٹوں اور نقش و نگار کی صورت میں مسلمانوں کے فن تعمیر میں دیکھتے ہیں "سب رس" میں فارسی نثر کے برخلاف جملے چھوٹے چھوٹے ہیں اور اس کا سبب وہ آہنگ ہے جو قافیے کے ذریعے وجہی پڑھنے یا سننے والے کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے جملے اگر طویل ہوتے تو قافیے سے پیدا ہونے والا آہنگ، احساس فاصلے کے سبب کمزور پڑ جاتا ہے اسی لئے جملے چھوٹے ہیں اور ان کے اندر بات چیت کا سا لہجہ در آیا ہے یہ طرز "وضاحت" سے زیادہ بیان کرنے کے لئے موزوں ہے اس بات کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجیے۔ وجہی عقل کے موضوع پر روشنی ڈال رہا ہے۔

عقل نور ہے، عقل کی دوڑ بہوت دور ہے۔ عقل ہے تو آدمی کہواتے عقل ہے تو خدا کون پاتے۔ عقل اچھے تو تمیز کرے برا اور بھلا جانے، عقل اچھے تو آپس کوں ہور دوسرے کوں پچھانے۔ عقل نے میر، عقل تے پیر، عقل نے بادشاہ عقل تے وزیر، عقل نے دنیا، عقل تے دولت، عقل تے چلتی سلطانان کی سلطنت۔

یہ طرز ادا ساری کتاب میں عام ہے۔ لفظوں کی ترتیب بالکل اسی طرح قافیے کے زیر اثر ہے جس طرح شعر میں ہوتی ہے آہنگ کا احساس بھی لفظوں کی ترتیب کو متاثر کر رہا ہے اگر قافیے کا التزام نہ رکھا جاتا تو اس جملے میں "عقل سوں چلتی خدا کی خدائی، جتنی عقل اتنی بڑائی" الفاظ کی یہ ترتیب بھی باقی نہ رہتی یہ اہتمام "سب رس" کی ہر سطر پر ہر جملے میں موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد علی اثر

غواصی ـــ دبستانِ گولکنڈہ کا ایک عظیم سخنور

ملک الشعراء ملا غواصی قدیم اردو کا ایک نامور اور عظیم المرتبت شاعر ہے، لیکن دکن کے دوسرے شاعروں کی طرح اس کے تفصیلی حالاتِ زندگی پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کا سنہ ولادت، تعلیم و تربیت، عمر، سنہ وفات، مدفن اور خاص طور پر آخری زمانے کے حالات کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ درمیانی زندگی کے بارے میں کچھ واضح نقوش ضرور مل جاتے ہیں۔

قطب شاہی تاریخوں، تذکروں یا غواصی کے ہم عصر شاعروں کے کلام سے اس کی زندگی کے بارے میں جو کچھ مواد مل سکا ہے۔ اسے ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" اور "کلیاتِ غواصی" میں مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں میر سعادت علی رضوی نے "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" میں ڈاکٹر غلام عمر خاں نے "میناستونتی" میں اور راقم الحروف نے "غواصی شخصیت اور فن" میں یکجا کر دیا ہے۔

متذکرہ بالا کتب اور غواصی کے کلام کی اندرونی شہادتوں کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ، غواصی ابراہیم قطب شاہ کے عہد ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء تا ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۱ء میں پیدا ہوا۔ عمر میں محمد قلی قطب شاہ اور اسد اللہ وجہی سے چھوٹا تھا۔ اس کی

ابتدائی زندگی عسرت میں بسر ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد ۹۸۹ھ/ ۱۵۸۰ء تا ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۵ء میں اس نے شاعری کا آغاز کیا۔ اور پھر اس نے سلطان محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کا عہد حکومت (۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۵ء-۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء) غواصی کی شاعری کا عہد زریں ہے۔ اس بادشاہ نے نہ صرف اس کی سرپرستی کی، اپنے دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا اور ۱۶۳۵ء میں اپنے سفیر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا بلکہ اس کو "فصاحت آثار" کا لقب بھی عطا کیا۔ جس کا ذکر غواصی نے اپنے ایک قصیدہ میں اس طرح کیا ہے ؎

ہزار شکر کہ خوش ہو کے یو شہہ عارف　　خطاب منجے کوں دیا ہے "فصاحت آثاری"

غواصی حضرت میراں سید شاہ حیدر ولی اللہ (متوفی ۱۰۳۳ھ) کا مرید تھا[1]۔ جنکی مدح میں اس نے متعدد اشعار لکھے ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

حیدر جو میرا پیر ہے کہ سرفرازی کی نظر　　ہوا یک تیزی سار منج غواص کوں تینر کیک

اے پیر دستگیر جو حیدر رتا ہے ناتو　　منجے کوں کہاں وہ جبیب جو ہے تیوں تجے سارو

غواصی کو اس کی زندگی ہی میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی اس کی "شکر افشانی" کے چرچے صرف دکن ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندستان میں ہونے لگے تھے اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے سبب "طوطیان ہند" اس کے "شکرستان" کی جانب رغبت کرنے لگے۔ غواصی کو اپنی شہرت اور مقبولیت کا بخوبی احساس تھا وہ کہتا ہے ؎

ضرب علی میں یو مہ ہوں میراں کیرا منظور رہوں　　غواصی ہو مشہور رہوں اس سلطنت کے بھار میں

طوطیاں سب ہند کے رغبت کریں تیوں آج خوش　　شکرستاں ہو غواصی شکر افشانی کیا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے "غواصی شخصیت اور فن"

ڈاکٹر محمد علی اثر

دبستانِ گولکنڈہ کا سماجی اور ادبی پس منظر

قطب شاہی حکمرانوں کے عہد میں گولکنڈہ میں جس ثقافت اور تمدن کو فروغ ہوا وہ حقیقتاً صرف ایک تسلسل تھا ان سماجی اقدار اور ثقافتی روایات کا جن کی آبیاری سرزمین دکن میں پہلی بار بہمنی حکمرانوں نے کی تھی۔ بہمنی بادشاہوں نے جنوبی ہند کی سرزمین کو پہلی بار نئی ادبی اور تہذیبی روایات سے آشنا کیا۔ سیاسی سطح پر بہمنی بادشاہوں کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے دکن کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو ہر وقت برسر پیکار رہتی تھیں، ایک انتظامی وحدت میں منسلک کیا، جس کی وجہ سے جنوبی ہند میں امن و امان اور خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد بہمنی دربار نے علوم و فنون اور کمال و ہنر کی سرپرستی کے لئے ایسی شہرت حاصل کی کہ ترکستان، ایران، اور مشرق متوسط کے صاحبان علم و فضل قدر دانی کی توقع میں دکن آنے لگے۔ بہمنی بادشاہوں نے جن میں اکثر علوم و فنون کے غیر معمولی قدر داں گذرے ہیں، مختلف ممالک کے اہل کمال کی سرپرستی کی اور صحیح معنوں میں دکن کی سرزمین پر بین الاقوامی تہذیب و تمدن کی شمع روشن کی۔

غالباً اسی مقبولیت کی وجہ سے شمالی ہند کے مستند تذکرہ نگار میر حسن میر تقی میر اور قیام الدین قائم نے اپنے تذکروں میں غواصی کا ذکر کیا ہے جبکہ دکنی کے دوسرے بلند پایہ شاعر مثلاً محمد قلی قطب شاہ ملک الشعراء وجہی وغیرہ ان تذکروں میں جگہ نہ پا سکے۔

غواصی نے غزل، قصیدہ، مثنوی رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن بہ حیثیت مثنوی نگار اور غزل گو وہ قدیم اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا ہے۔ اس کی تینوں مثنویاں (۱) میناستونتی (۲) سیف الملک و بدیع الجمال اور (۳) طوطی نامہ دکنی کی شاہکار مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔

میناستونتی کا قصہ ہندوستانی اصل کی ایک عشقیہ کہانی سے ماخوذ ہے، گذشتہ چند برسوں میں اس مقبول عوامی کہانی کی ایک سے زاید ادبی تخلیقیں منظر عام پر آئی ہیں جن میں قدیم اودھی ادبیات میں داؤد کی "چنداین" اور میاں سادھن کی "مینا سیت" بنگالی میں دولت قاضی کی "ستی مینا ولور چندرانی" اور فارسی میں حمیدی کا "عصمت نامہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں، غواصی نے قصہ کے ماخذ کے متعلق لکھا ہے ؎

رسالہ اتفاقاً فارسی یو ادل ، کیا نظم دکنی سنتے بے بدل

اس وقت تک فارسی میں اس قبیل کا صرف ایک ہی قصہ حمیدی کا "عصمت نامہ" منظر عام پر آیا ہے اس لئے گمان غالب ہے کہ "عصمت نامہ" ہی "میناستونتی" کے قصہ کا ماخذ ہے، غواصی کی یہ مثنوی ایک فارسی قصہ پر مبنی ضرور ہے لیکن شاعر نے اصل قصے کا من وعن ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اس نے قصہ کا صرف ڈھانچہ مستعار لیا ہے، قصہ کی تفصیلات اور اس کے آب و رنگ میں اس نے آزادی کے ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔

غواصی کی دوسری مثنویوں کو سامنے رکھ کر "میناستونتی" کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ لگانا

دشوار نہیں کہ یہ غواصی کی ابتدائی کوشش ہے لیکن اس کے باوجود زبان و بیان اور کمالِ فن کے اعتبار سے سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کی طرح یہ مثنوی بھی دکنی شاعری میں ایک نمایاں مقام کی مستحق ہے۔ دکنی کے دوسرے شعراء کی طرح غواصی کے کلام میں مقامی ماحول، مقامی روایات اور مقامی قصوں کی جھلکی پائی جاتی ہے "مینا ستونتی" کے قصہ کا انتخاب شاعر کی حقیقت پسندی اور ایک صحت مند رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس مثنوی میں اپنے عہد کی نسوانی زبان، محاورے اور روزمرہ کے وافر نمونے موجود ہیں۔ غواصی نے اس مثنوی میں عورتوں کی بول چال کا بڑا صحیح نمونہ پیش کیا ہے عورتوں کے محاورے، روزمرہ، ضرب الامثال اور ان کے کوسنے یا بد دعا دینے کے انداز کی متعدد مثالیں اس مثنوی میں موجود ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کبی بھا گو نہی جلو تیرا بھاگ — جو کھاتی توں اپنی جوانی کی آگ
بلا میرے پیو کی پڑو تج اپر — لڑو سانپ بچھو ترا جیو جگر
مرو نار او پاپنی استری — جن ایک چھوڑ دوجے اپر من دھری
نھنا کام یو نا کروں تو جو نڈا — سڑوں گی ترت اپنے سرتے مونڈا

سیف الملوک و بدیع الجمال۔ سیف الملوک و بدیع الجمال کا قصہ الف لیلیٰ کے فارسی ترجمے کے ایک مشہور افسانے پر مبنی ہے۔ اس میں مصر کے شہزادے سیف الملوک اور راجنہ کی شہزادی بدیع الجمال کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ سیف الملوک و بدیع الجمال کا قصہ اگرچہ کہ الف لیلیٰ کے فارسی قصے سے ماخوذ ہے لیکن شاعر نے اس مثنوی کا دکنی زبان میں لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ صرف قصہ کا ڈھانچہ مستعار لیا ہے اور جگہ جگہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر اس قصہ کو بڑی حد تک اچھا بنا دیا ہے۔ قرون وسطیٰ کی دیگر داستانوں کی طرح اس مثنوی میں بھی مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی ہے۔ جبکہ یہ عناصر غواصی کی دوسری مثنویوں میں بالکل مفقود ہیں اس مثنوی میں

کی مرقع کشی اور سراپا نگاری کے بڑے دلکش نمونے بھی موجود ہیں شہزادی بدیع الجمال کے حسن کی تعریف میں غواصی کا حسن بیان ملاحظہ کیجیئے۔

عجب نور کیرا اتھا مکہ پہ تاب — کہ قربان اس مکہ پہ لک آفتاب
دیکھیا جوں چندر اس مونڈی کا ڑ کر — سیتا ہیرن اسمان کے پھاڑ کر
تارے دیکہ اس کا جھل نور سب — لئے ہات شرمندہ ہو چور سب
کلیاں سب چمن کے دیکھ اس بھان کوں — کیا چاک اپنے گریبان کوں
دیکھ اس کے نین بن کے نرگس تمام — ہوے ہوش درتے تھے کھس کھس تمام
دیکھت اس کے پیچان بھرے کنڈلال — سب آئے تھے کل برزمیں سنبلاں
کہ اونار ادتار یکج حور تھی — نہ یکج حور دو عین سمدور تھی

طوطی نامہ۔ طوطی نامہ کا قصہ قدیم زمانے کی مشہور سنسکرت تصنیف "شکاسب تتی" (طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں) کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے "شکاسب تتی" کو سب سے پہلے مولانا ضیاء الدین نخشبی نے فارسی میں منتقل کیا تھا، نخشبی نے ستر کہانیوں میں سے صرف باون کا انتخاب کیا تھا۔ غواصی کے طوطی نامہ کا ماخذ نخشبی کا طوطی نامہ ہی ہے۔ غواصی نے بھی اختصار سے کام لیتے ہوئے باون کہانیوں میں سے صرف پینتالیس کو منتخب کیا ہے۔ غواصی دبستان دکن کا پہلا شاعر ہے۔ جس نے فارسی "طوطی نامہ" کو دکنی کا جامہ پہنایا۔ قصے کی جزئیات، انسانی نفسیات کی تصویر کشی اور مناظر قدرت کے بیان میں غواصی نے اپنی قادر الکلامی اور شاعرانہ کمال کا اس درجہ مظاہرہ کیا ہے کہ قدیم اردو کا یہ عظیم فن پارہ محض سنسکرت یا فارسی کا ترجمہ ہی نہیں رہ جاتا بلکہ بڑی حد تک ایک اچھی تصنیف کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ طوطی نامہ غواصی کی شاہکار مثنوی ہے، مینا ستونتی کی طرح یہ مثنوی بھی ہندوستانی اصل کے قصہ پر مبنی ہے۔ مثنوی کے قصہ میں ایک ایسی عالمگیر کشش موجود ہے جس سے ہر شخص ہر زمانے میں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اس مثنوی کا شمار دنیا کی اعلیٰ ترین ادبی کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

غواصی نے طوطی نامہ میں ہر باب کے آغاز میں التزاماً غروب آفتاب کی تصویر اور اختتام میں عورتوں کے مکر و فریب کی طرف اشارہ کیا ہے جن کے مطالعہ سے شاعر کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

جگا جوت سورج اتم ذات کا — جو کر سیر سب دن سماوات کا
ڈبیا جا کے مغرب کے ظلمات میں — لگے دیپنے جوں دیوے رات میں
سورج یوں بچہ جوں اسمان پھیر — کیا قصد مغرب کے جنگل کی دھیر
ہرن چاند کا اپنے پچیاں سوں مل — جو مشرق کے صحرا تھے آیا نکل
شکر تے اگرچہ ہے عورت مٹھی — ولے سر بسر زہر کی ہے گٹھی
غواصی اگر نار کھانک پہ آئے — تو سچ بات کوں جھوٹ کریوں ہرائے

جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصی دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے غزل کے میدان میں قطب شاہی عہد کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ عادل شاہی دور کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کو پہونچ سکتا ہے۔ اس کے دیوان میں بھرتی کے شعر یا اشعار کی تعداد بہت کم ہے جن میں گہرا تاثر نہیں پایا جاتا۔

غواصی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی، روانی اور بے ساختگی ہے لیکن جو چیز اس کو دکنی شعرا میں منفرد مقام بخشتی ہے اور اردو کے صف اول کے شعرا میں لا کھڑا کرتی ہے وہ تاثر کی فراوانی سوز و گداز اور نغمگی و موسیقی ہے۔ غواصی بنیادی طور پر جذبات و احساسات کا شاعر ہے جذبات کی موثر ترجمانی اور قلبی واردات کی فن کارانہ عکاسی کی وجہ سے غواصی کا سارا کلام غنائیت کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے عجب ہے کہ باوجود انتہائی سادگی کے کلام میں بلا کا اثر ہے۔ تاثر کے ساتھ ساتھ اس کے کلام میں سوز و لشتریت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ ہر درد بھرے دل کو غزل کے ساز پر کچھ اس طرح چھیڑتا ہے کہ سننے والا بھی اپنے دل کے تاروں میں ارتعاش محسوس کرے۔

عشق کی آگ میں جل کے راکھ ہونا   عشق بازی میں چاک چاک ہونا
خاک ہونا تو سچ ہے آخر کوں   خاک نا ہوے یکیچ خاک ہونا
اے سجن رخ کوں یاد کر پل پل   رووں ایس میں ایچ میں ڈھل ڈھل

غواصی نے اپنے کلام میں مقامی ماحول کی بھر پور عکاسی کی ہے اس کی غزلوں میں ہندوستانی ماحول ہندستانی معاشرت ہندوستانی تصورات یہاں کے سبزہ وگل مناظر قدرت رہن سہن کے مقامی طور طریقے کی مکمل تصویریں ملتی ہیں۔ غواصی کے یہاں یہ ہندوستانیت محض زبان و بیان تک محدود نہیں بلکہ اس کے خیال سوچنے کے انداز اور طرز اظہار میں بھی جھلکتی ہے۔ اردو کے اکثر غزل گوشاعروں کی طرح اس نے ہندستان میں رہ کر شیراز و اصفہان کے راگ نہیں الاپے بلکہ اس کے کلام میں ہندستانی اقدار اور ہندستانی روایات کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کے کلام میں حسن و عشق کے وہی مضامین اپنائے گئے ہیں جو ہندوستانی ذوق کے مطابق ہوں۔ غواصی کی غزلوں میں محبوب کی جنس مبہم نہیں رہتی وہ اپنے معشوق کے لئے ہمیشہ صیغہ تانیث استعمال کرتا ہے اور اس کو بر ملا انداز سے نار، دھن، سہیلی سندری وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔ غواصی کی محبوبہ ہندوستان ہی کی پیداوار ہے ہندستانی فضا میں سانس لیتی ہے اس کے خط و خال، چال ڈھال، رفتار و گفتار، طرز فکر اور بناؤ سنگھار میں بھی مقامی ماحول کے اثرات نمایاں ہیں۔

غواصی ایک باکمال مثنوی نگار اور بلند پایہ غزل گو ہی نہیں، ایک کامیاب قصیدہ نگار بھی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نصرتی کے بعد غواصی دکنی اسکول کا سب سے بڑا قصیدہ گو ہے جہاں تک قصائد کی تعداد تنوع اور دکنی شاعری کی روایات و رجحانات کی پاسداری کا تعلق ہے غواصی کو ہی فوقیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

محمد قلی کی شاعری

سلطان محمد قلی کو بچپن ہی شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ جس کی خاطر اس نے اردو اور فارسی شعرا کے کلام کا بھی مطالعہ کیا۔ یوں تو کلیات میں اکثر شاعروں کے نام نظر سے گذرتے ہیں لیکن اس کو سب سے زیادہ خواجہ حافظ کے کلام سے لگاو تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ خواجہ حافظ کی شاعری اس کی طبیعت کے مناسب تھی۔ اس لئے وہ دیوان حافظ کا گویا حافظ تھا' غزلیات حافظ کے ترجموں کے علاوہ کلیات محمد قلی میں سینکڑوں شعر حافظ ہی کی طرز میں موجود ہیں۔ حافظ کے بعد کلیات محمد قلی میں انوری' خاقانی' نظامی' عنصری' ظہیر' محمود اور فردوسی کے نام ملتے ہیں افسوس ہے کہ محمد قلی کے طویل قصیدے اور مثنویاں دستیاب نہیں ہوئیں ورنہ یہ معلوم ہوتا کہ اس پر ایران کے کس قصیدہ گو شاعر کا رنگ غالب ہے' اور مثنویوں میں اس نے کس کی تقلید کی ہے۔ البتہ ایک قصیدۂ بسنت میں اس نے اپنے شعر کو خاقانی کا شعر قرار دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ خاقانی کے رنگ کو پسند کرتا تھا وہ کہتا ہے کہ ؎

نزاکت شعر کے فن میں خدا بخشا ہے تجکوں معانی شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانی

(۱) شعرا کے کلام [illegible] کے علاوہ محمد قلی نے فارسی ترجمہ مثنویوں کا بھی

اپنے عشق و عاشق کے سلسلہ میں مطالعہ کیا ہوگا کیونکہ شاہنامہ کے علاوہ اکثر عشقیہ قصوں مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں، خسرو، یوسف زلیخا وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اور بہ سبب کلام اس نے علم حاصل کرنے کی خاطر نہیں پڑھا بلکہ اپنی شاعری کے شوق میں۔ اور شاعری کا یہ شوق محض عشق و عاشقی کی خاطر تھا۔ کیونکہ وہ جگہ جگہ اس کا ذکر کرتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ میں نے شعر گوئی میں جو کچھ ترقی کی یا شاعری میں کمال پیدا کیا وہ صرف اپنے معشوق کے حسن و خوبی کی تعریف و توصیف کرنے کے سلسلہ میں حاصل ہوا۔ حسینوں نے مجھے شعر گوئی کی طرف راغب کیا اور چونکہ بادشاہ ہونے کی وجہ سے زیادہ مہ جبینوں سے سابقہ پڑتا تھا اس لئے شعر گوئی کے نئے نئے مہجات اور اسباب پیدا ہوتے جاتے تھے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

ناناں گھر سیاں نرلیاں وار یا جو تیرے نانوں پہ　　سو جاے کر اسمان پر ہر اک یکن نا را ہوا
تمہارے وصف کہنے تھے ہوا منج شعر نورانی　　او شعراں کوں پڑیا سب شاعر الم عبید وہم نورد

یہ تو شاعری میں کمال حاصل کرنے کے اسباب تھے۔ اب وہ اپنی عشق عاشقی کا اثر اپنی شاعری پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کا درد دل اس کے اشعار میں بھی نمایاں رہتا ہے اگرچہ محبت کا میٹھا میٹھا درد عاشقوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے لیکن بے صبری اور اضطراب بھی تو عشق ہی کی خصوصیتیں ہیں جن کی وجہ سے ہر گھڑی عاشق کے داغ ہائے سینہ پر نمک پاشی ہوتی رہتی ہے۔ تاہم عاشق کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی زبان سے کوئی سخن تلخ نہ نکلے اسی وجہ سے اس کے کلام میں لوچ اور شیرینی پیدا ہونے لگتی ہے۔ عشقیہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی اور شیرینی ہی ہے۔ اور یہ دونوں خصوصیتیں محمد قلی کے کلام میں نمایاں ہیں۔ وہ اپنی اس خصوصیت کا ذکر یوں کرتا ہے ؎

مٹھائی کے باتاں تجھے جھوڑ تا نمک　　جے چاکھے کہے ہے نمک سوں شکر
مٹھائی کے بچن تے منجے نا بات　　دے سب شعر میں میٹھائی افزوں

یہی شیرینی اور سادگی اس کی مقبولیت عامہ کا بہت بڑا باعث تھی۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ محض بادشاہ ہونے کی وجہ سے اس کے زمانہ کے لوگوں نے اس کے کلام کی غیر معمولی قدر و منزلت کی۔ اسلوب کی فطری شیرینی کے علاوہ ایک اور سبب اس کی شاعری کی مقبولیت کا خود محمد قلی کی نظر میں موجود تھا۔ اور وہ مذہبی موضوعوں پر شعر لکھنا ہے۔ عشق عاشقی کے بعض نہایت عریاں مضامین کے ساتھ صوفیانہ مسائل کی ترجمانی اور خاص کر نبیؐ و آل نبیؐ کی مدحت و منقبت میں محمد قلی نے جو کمال حاصل کیا ہے وہ اردو شاعروں میں اسی کے لیے مخصوص ہے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس طرح ہر رنگ میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کر سکتا تھا۔ اس کی معاملہ بندی دیکھنے کے بعد یہ خیال تک نہیں پیدا ہوتا کہ ایسا رند مشرب اور بے باک آزادہ روش شاعر بیسیوں پاک مذہبی نظمیں بھی لکھ سکے گا۔ اور بزرگوں کی مدح سرائی کے وقت اتنا محتاط اور جوش عقیدت سے لبریز ہو جائے گا۔ اس خوبی کی وجہ سے بھی اس کی شاعری کو غیر معمولی مقبولیت اور وسعت حاصل ہو گئی اور خود اس کو بھی اس اہمیت کا احساس ہے ؎

سدا تو مدح نبیؐ و علیؐ کی کہتا ہے   قطب شہ شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست

شعر تیرا معانی صدقہ نبیؐ   لکھ لیتے پانے ہات گلنے بیلات

محمد قلی بھی اکثر باکمالوں کی طرح اپنے کمال کی قدر و منزلت چاہتا ہے لیکن وہ خود بادشاہ تھا اور دوسرے باکمالوں کی قدرومنزلت کرتا تھا اس لیے وہ اپنی قدر و منزلت میں زر و جواہر کی جگہ سچی تعریف و تنقید مانگتا ہے۔ وہ اپنے کلام کے سچے خریداروں کا خواستمند ہے اور کہتا ہے کہ دو گھوڑے ہاتھوں سے میرا ایک ڈردانہ زیادہ قیمتی ہے۔ اس کی قدر و قیمت معمولی شاعر اور سخن فہم نہیں کر سکتے۔ اگرچہ وہ ایک بڑا بادشاہ تھا۔ لیکن شاعر بھی بہت بڑا تھا اس لیے بادشاہت اس کو شاعرانہ فخر و تعلی سے محروم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی نزاکت بیانی، جدت آفرینی، جودت طبع، اور استادی و صاحب کمالی کا اکثر شعروں میں دعویٰ کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا دعویٰ بہت کچھ

حق بجانب بھی تھا۔ اس قبیل کے چند شعر یہ ہیں ؎

قطب شہ بنی؟ صدقے آپی کیا ہے نوا طرح جگ میں ایچی کوں مرصع
شعر تیرا درو گوہر ہے معانی سب میں شعر حافظ کے سہا وبرا ہے تاج پرویز
کرتے ہیں دعوے شعر کے سب اپنی طبع سوں بخشا فصیح شعر معانی کے تیں خدا

یہ واقعہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اردو شاعری کو بالکل نئی طرح سے مرصع کر دیا ہے اس سے قبل زیادہ تر مذہبی نظمیں لکھی جاتی تھیں۔ اس نے ہر قسم کے موضوعوں پر پوری قوت کے ساتھ طبع آزمائی کی اور اردو شاعروں کے لئے نئے نئے میدان عمل پیدا کر گیا۔ ابھی ایک شعر میں اس نے اپنے شعر کو حافظ کے اشعار پر ترجیح دی ہے لیکن وہ اسی پر قلع نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھ کر عام دعوئ استادی کرتا ہے اور خود کو نہ صرف اپنے زمانہ کے شاعروں کا استاد بلکہ خاقانی و نظامی کا بھی استاد سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

قطب زماں سب شاعراں کا شعر میں شاگرد ہے صدقے نبی باندیا کمر جیوں لشکر پایں لشکری
خاقانی و نظامی کا قطب شہ ہے شاگردؔ تمہارے کی کہانیاں ہتے سناتی منجکوں

ایک قصیدے میں اس نے خود کو اپنے زمانہ کا انوری قرار دیا ہے اور مختلف جگہوں پر اپنے زمانہ کا شاہ یعنی شاعر دوراں لکھا ہے یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا سچا شاعر تھا کیونکہ اس نے اپنے عہد کی جتنی صحیح اور کامل ترجمانی کی ہے اس دور کے کسی شاعر نے نہیں کی۔

لہ شاگرد کے لفظی معنی شاہ کے گرد رہنے والے۔ اس لفظ سے استاد کا مفہوم لیا جاتا تھا۔ (ڈاکٹر زور)

ڈاکٹر محمد علی اثر

اردو غزل قطب شاہی عہد میں

غزل اردو شاعری کا سب سے اہم ادبی اور تہذیبی سرمایہ ہے اس لئے غزل کا مطالعہ دراصل ایک مخصوص تہذیب، ایک مخصوص معاشرتی نظام اور مخصوص تاریخی اور سماجی حالات کا مطالعہ ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی

"ہماری تہذیب غزل میں اور ہماری غزل تہذیب میں ڈھلی ہے دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے یہی سبب ہے کہ ہماری تہذیب کی روح غزل میں اور غزل کی روح ہماری تہذیب میں بے نقاب نظر آتی ہے۔

(جدید غزل ص۱۱)

ہر زمانے میں لوگ غزل سے دلچسپی لیتے رہے ہیں اور ہر دور میں اس کے سر پر شہرت و مقبولیت کا تاج رکھا گیا۔ اردو میں شعر و ادب کی ابتدائی نشوونما کا سہرا دکن کے سر ہے۔ دبستانِ دکن کے قدیم ادبی ورثہ میں اگرچہ کہ مثنوی کی صنف نہایت مقبول رہی ہے لیکن فارسی شاعری کے اتباع میں قدیم دکنی شعراء نے ابتدا ہی سے غزل پر بھی توجہ کی ہے اردو میں غزل کے اولین نقوش کب ابھرنے شروع ہوئے اس کا

بہمنی خاندان کے آٹھویں فرماں روا فیروز شاہ بہمنی کو ہندستان کی تاریخ میں اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے پہلی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین یگانگت، اتحاد اور اخوت پیدا کرنے کی ایک مثبت کوشش کی واقعہ یہ ہے کہ جس تہذیب کو آگے چل کر ہندالمانی تہذیب کا نام دیا گیا اسکی بنیو دکن میں فیروز شاہ بہمنی کے ہاتھوں پڑی۔ بعد کو انھیں خطوط پر مغل فرماں روا اکبر اعظم، قطب شاہی فرماں روا محمد قلی قطب شاہ اور عادل شاہی حکمران علی عادل شاہ ثانی نے ہندستان میں بسنے والے ان دو اہم طبقات کے مابین، یکجہتی، اتحاد، اور رواداری پیدا کرنے کی کامیاب تحریک چلائی۔

قطب شاہی عہد حکومت میں جو سماجی ماحول گولکنڈہ میں موجود تھا اس کو بہمنی عہد میں نشوونما پائے ہوئے دکنی سماج کی ایک ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے۔ گولکنڈہ کے پہلے فرماں روا سلطان قلی کا عہد (۱۵۱۸ء — ۱۵۴۳ء) اس نوعمر سلطنت کے استحکام کا زمانہ تھا۔ سلطان قلی اس علاقے کے لئے کوئی نیا فرماں روا نہیں تھا، گولکنڈہ کی آزادی سے قبل اس نے تلنگانہ کے علاقہ میں چوبیس سال گورنر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ علوم و فنون اور تعمیر و تنظیم سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس نے ایک طرف تو عوام کا دل موہ لیا تھا اور دوسری طرف بہمنی دربار میں اس کا شمار ایسے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا جو بیک وقت صاحب علم و فضل بھی تھے اور میدان کارزار کے سورما بھی۔ یہی سبب تھا کہ محمود شاہ بہمنی نے اسے صاحب سیف و قلم کے خطاب سے نوازا تھا۔ سلطان قلی تلنگانہ کے عوام میں "بڑے ملک" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا (عبدالمجید صدیقی، تاریخ گولکنڈہ۔ حیدرآباد۔ صفحہ (۳۳۷)) اس کو شعر و ادب سے کہاں

قطعی طور پر تعین مشکل ہے ۔ بہمنی عہد کا وہ دور جس میں اردو میں تصنیف و تالیف کی روایت پڑنی شروع ہوئی ۔ اردو ادب کی تاریخ کا تاریک دور ہے اس عہد کی عام تاریخ کے بارے میں کافی مواد فارسی تاریخوں میں مل جاتا ہے لیکن قدیم مورخین بالعموم زبان اور شعر و ادب کی نشو و نما کے تذکرے سے عاری ہوتی ہیں پھر جہاں تک اس دور کی شاعری کا تعلق ہے وہ ایک ایسی زبان کی شاعری ہے جو پہلی مرتبہ بولی کے مرحلے سے آگے بڑھ کر زبان کی منزل میں داخل ہو رہی تھی ۔ اس لئے فطری طور پر اس عہد کے مورخین یا مصنفین نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اردو کی اولین تحریریں دنیا کی اکثر زبانوں کے اولین تحریری نمونوں کی طرح صوفیوں اور مذہبی رہنماؤں کی تحریریں ہیں ۔ لیکن حضرت بندہ نواز اور چند صوفیوں کے فوری بعدہم کو اردو میں ادبی کوششوں کے ابتدائی نمونے ملنے شروع ہو جاتے ہیں چنانچہ نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اس سلسلہ کی ایک اہم مثال ہے پھر نظامی کے معاصرین میں مشتاق لطیفی اور قریشی کے نام ملتے ہیں جن کی غزلیں قدیم اردو غزل کے ابتدائی نمونوں میں شمار کی جاتی ہیں ۔

دبستانِ گولکنڈہ کے اولین غزل گو شاعروں میں فیروز، محمود اور ملاخیالی کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔

موخرالذکر شاعر کی صرف ایک غزل دستیاب ہوئی ہے اسلئے اس کی غزل گوئی کے بارے میں قطعی طور پر کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے البتہ فیروز اور محمود کی نودریافت شدہ غزلوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ قدیم اردو کے یہ دونوں شعرا اپنے عہد کے اساتذۂ سخن اور باکمال غزل گو بھی تھے محمد قلی قطب شاہ اپنے کلام میں شاید فیروز اور محمود کی سی روانی، برجستگی اور جدت طرازی دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ اگر فیروز اور محمود میر ہے

کلام کو دیکھتے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ بے ہوش ہو جاتے سہ

اگر محمود ہو فیروز بے ہوش ہوئیں عجب کیا ہے
ہو سنے مح وصف نا کر سک ظہیر ہو رانوری بے ہوش

قطب الدین قادری فیروز ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ایک نامور شاعر ہے۔ وہ بیدر کا متوطن تھا اور بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں اپنے مرشد حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی ۱۵۶۴ء) کی ایماء پر گولکنڈہ سے آیا تھا[1] اس کی ایک مختصر مثنوی "پرت نامہ" کے علاوہ دو تین غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ محمد قلی کے علاوہ وجہی اور ابن نشاطی نے فیروز کو استاد سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور اس سے اپنے کلام کی داد چاہی ہے مثلاً وجہی کہتا ہے۔

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں
دعا دے کے چوٹ مرے ہات کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس
کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس
توں ایسی طرز دل تو پنجیا نوی
کہ دھرے کریں سب تری پیروی

فیروز کی غزلوں کے مطالعہ سے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ بہ آسان ممکن ہے جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ

---

[1] سید محی الدین قادری زور "دکنی ادب کی تاریخ" ص ۱۸

"پرت نامہ" کوئی ایسا بڑا ادبی نقش نہیں تھا۔ جو فیروز کی استادی اور اس کے کمال فن کے شایان شان ہو سکے

فیروز کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی ہے۔ اس کا تصوّرِ محبوب مادی اور مجازی ہے۔ وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے کا ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ اگرچہ کہ اس کے کلام میں "ہندوی" اور "فارسی" اثرات دونوں کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی "ہندوی" عنصر غالب نظر آتا ہے۔ زبان اور طرز اد سے قطع نظر اس کے متخیلہ پر بھی مقامی عناصر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سرو قدرت سہاوے جونو بہار بن میں
نازک نہال پنپیا اس جیو کے چمن میں

گوریاں سہیلیاں سب جگ کیا بساریاں
جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دکھن میں

فیروز جے حمد کا دیکھیں جمال صوری
ہر حال اس صنم کا آکھیں خیال من میں

فیروز کی طرح سید محمود بھی ابراہیم قلی کے عہد کا ایک بلند پایہ شاعر ہے۔ زمانہ مابعد کے شاعروں میں محمد قلی، وجہی اور ابن نشاطی نے اس کو قدیم اردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے محمود ایک پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے اردو کے علاوہ پنجابی اور افغانی میں

لہ مسعود حسین خاں ڈاکٹر "پرت نامہ" قدیم اردو جلد اول ص۳۳۵

بھی شعر موزوں کئے ہیں لیکن صرف اردو شاعری کی وجہ سے اس کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔ محمود نے غزل کے علاوہ جھولنا، مرثیہ، کبت، قصہ اور دوہے بھی کہے ہیں لیکن اس کے کلام کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے اس کے کلام کی ایک قلمی بیاض انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

محمود طبعاً ایک غزل گو شاعر ہے ۔ اس کی غزل کا نمایاں وصف روانی و برجستگی، سادگی و موسیقیت ہے ۔ اس کے کلام میں سادگی و پرکاری کے ساتھ حقیقت پسندی، تاثر و سوز و گداز کا حسین امتزاج بھی نظر آتا ہے اس کی غزل "گفتگو بہ زنان" کے موضوعات تک محدود نہیں بلکہ مختلف مسائل حیات اور زندگی کے گوناگوں مشاہدات اور تجربات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

جو قدم راکھے سبک ساری کی رہ میں جوں حباب
نیں ہے لغزش پاؤں کوں اس کے اگر چلتا ہے آب
آج ہور کل ہیں انپیں کی زندگی ناگھال توں
جو توں کرنا ہے سو کرے حق کے کاماں کوں شتاب

گر کان ہیں تج کوں ارے اس باغ میں غنچے نگل
کرتے ہیں سو جیباں سی تلقین خاموشی تجے
ہے پاٹ پو دو روز کا توشہ کمر کوں باندھ چل
مغرور ہو بیٹھا ہے کی اونچے طلا کاری چھجے

مملکتِ گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا رعایا پرور حکمراں، دکنی تہذیب و تمدن کا معمار، فن تعمیر

اور رقص و موسیقی کا دل دادہ تھا بلکہ اردو، فارسی اور تلگو کا ایک بلند پایہ اور خوش گو شاعر بھی تھا، اس کی قادر الکلامی اور موزونیٔ طبع کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر روز اسی طرح بے تکلفی سے شعر کہتا تھا جس طرح دریا میں روز موجیں اٹھتی ہیں لیکن نہ تو دریا کی روانی میں فرق آتا ہے اور نہ موجوں کا تلاطم کم ہوتا ہے وہ کہتا ہے سہ

صدقے نبی قطب شاہ یوں شعر بولے ہر دن
دریا کوں روز جوں ہے موجاں کا طلوع

محمد قلی نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اس کے کلیات میں حمد، نعت، منقبت، عید میلاد النبیؐ، شب معراج، شب برات، عید رمضان، بقرعید، عید غدیر، نوروز، بسنت، سالگرہ، جلوہ، کھیل، برسات محلات شاہی، بارہ پیاریاں وغیرہ موضوعات پر (۲۲۰) مسلسل غزلیں، ۲۰۵۴، غزلیں ۲۷ ریختیاں، ۱۲ قصیدے، ۴۱ رباعیاں اور ایک ناتمام مختصر مثنوی شامل ہے رباعیوں اور مثنوی کو چھوڑ کر اس کا تمام کلام غزل کے فارم میں ہے۔ محمد قلی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جس کا کلام مکمل دیوان کی شکل میں دستیاب ہو سکا ہے۔ اس نے صنفِ غزل پر سب سے پہلے باقاعدہ توجہ کی ہے جہاں تک غزلوں کی تعداد اور تنوع کا تعلق ہے محمد قلی دکنی اسکول کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا ہے۔ غزل کے لئے جس داخلی کیفیت اور خارجی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ محمد قلی کو میسر تھا شاید اسی لئے غزل اس کی محبوب صنف سخن بن گئی۔ یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں ہم نظم سمجھتے ہیں دراصل مختلف موضوعات کے تحت کہی گئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہیں۔

محمد قلی کی غزلوں میں سوز و گداز ہے اور فکر کی گہرائی، درد و غم کی فراوانی ہے

اور نہ نشتریت' اس نے اپنی زندگی کی بہاریں عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گذاریں' اس لئے اس کے کلام میں رنگینی و رعنائی ہے۔ تازگی و شگفتگی ہے۔ سیرابی و سرمستی ہے۔ غرض آسودگی کے تمام روپ اس کے کلام میں جلوہ گر ہیں۔ محمد قلی کا آرٹ کلاسیکی آرٹ کی نمایندگی کرتا ہے۔ یہ خوشحالی' اطمینان اور آسودگی کا آرٹ ہے چونکہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ تھا' اسکے محلوں میں بیسیوں ملکوں کی منتخب حسینائیں موجود تھیں اس لئے اس کی تمناؤں اور آرزوں کے آسودہ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے

محمد قلی کی غزل کی دوسری نمایاں خصوصیت واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی ہے۔ اس نے اپنے احساسات' مشاہدات اور تجربات زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے محمد قلی یا دکن کے دوسرے شعراء کا تصور محبوب اردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ محبوب تصوّری و خیالی پیکر نہیں بلکہ اسی عالم رنگ و بو میں رہنے بسنے والا گوشت پوست کا انسان ہے۔ محمد قلی نے برملا انداز میں اپنے محبوب کو سکی' سہیلی' دھن' سودھن' یار' سندری' ننھی' سانولی' پیاری' چھبیلی' گوری' کنولی' موہن' مشتری' ہندی چھوری' پدمنی وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔ وہ ایک کثیر المحبوب شاعر ہے' اس نے اپنے کلیات میں اپنی ان گنت محبوباؤں کی تعریف و توصیف میں سینکڑوں غزلیں کہی ہیں۔

محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار ہے۔ اس کی رگ وپے میں ہندوستان کی تہذیب سرائیت کر گئی ہے۔ وہ ایک تلنگن عورت "بھاگیہ رتی" کے بطن سے تھا' اتحاد پسندی اور روا داری اسے ورثے میں ملی تھی۔ اسے ہندستانی مزاج سے وہی مناسبت تھی جو امیر خسرو یا اکبر اعظم کو حاصل تھی' اس نے

اسلامی عیدوں کے ساتھ ساتھ بسنت، نوروز، آمد برسات، دیوالی وغیرہ خالص ہندوستانی تہواروں کو بھی ایک بین قومی تقریب کی حیثیت سے رائج کیا۔ اس کا کلام اس کے ماحول اور اس کی رنگا رنگ شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیا را
تمہیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں
کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ
رنگیلا ہو رہیا ترلوک سارا

گرجا ہے میگھ مہر تھے تازہ ہوا ہے بستاں
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن
جمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مئے پرستاں

غرض محمد قلی کی غزلیں نہ صرف ہندستانی تہواروں، عیدوں، موسموں، مناظر فطرت، کھیلوں وغیرہ کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں بلکہ ہندستانی عوام کے طور طریقے، رسومات، معتقدات اور توہمات کی بھی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اگر قطب شاہی عہد کی تہذیب کے نقوش دیکھنے ہوں یا اس عہد کے لوگوں کے جذبات اور تصورات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس خصوص میں محمد قلی کا کلام ہماری

مکمل رہنمائی کرے گا۔

محمد قلی کی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی شدت سے ابھرتا ہے اس کی بیشتر غزلیں "نبی صدقے" سے شروع ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے اور وہ مذہبی ریت و رسوم پر بھی چلتا ہے لیکن مذہب کی حقیقی روح سے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں عاری ہیں۔ اسے مذہب کے صرف تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اپنی عیش کوشی کو بھی نبیؐ اور علیؑ کا صدقہ قرار دیتا ہے ؎

نبی صدقے بارہ اماماں کرم سے تجھے
کرد عیش جم بارہ پیاریاں سوں پیارے

محمد قلی کے کلام کا بیشتر حصہ خارجی موضوعات پر مشتمل ہے لیکن ریختیوں میں اس کا میلان زیادہ تر داخلیت کی طرف نظر آتا ہے۔ اس کی ریختیوں میں زبانی لب و لہجہ اور عورتوں کی زبان کی مکمل خصوصیات ملتی ہیں۔ اس نے غزلوں کے مقابلے میں ریختی کے اشعار زیادہ جی لگا کر کہے ہیں اس لئے ان میں نکھار اور تاثیر کی فراوانی ہے۔ موزوں الفاظ، دلکش تراکیب، حسین استعارات اور خوب صورت تشبیہات کے ذریعہ اپنے شاعرانہ کمال اور فنی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔

جن پیو تھے بچھڑے اسے سنسار میں نیں کوچ خط
جس نھار بیں وہ پیو نیں اس نھار میں نیں کوچ خط

پیا بچھڑا ہے مج کوں دکھ گھنیرا
نہ جانوں کب ملے گا پیو میرا

کوپ سوں آئے ہیں شہ مرے گھر
چند نس جھلکت او مکھ سمن

محمد قلی نے اپنی محبوباؤں کی سراپا نگاری میں بے پناہ فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ سراپا کے بیان میں اس نے جو مسلسل غزلیں کہی ہیں ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہر محبوب کی بعض انفرادی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ اس کی بیسیوں محبوباؤں کے قد و خال اور طور طریقے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان غزلوں کی مدد سے ایک مصور ہر ایک کی علحدہ علحدہ تصویر بنا سکتا ہے۔ مثلاً ننھی ایک کم سن اور نوخیز لڑکی ہے جو رسم عاشقی سے ناآشنا ہے۔ اس نے مدن پھول کے رنگ کی ساڑی باندھ رکھی ہے۔ جب وہ چاندنی میں ناز سے چلتی ہے تو چاند لاج سے چھپ جاتا ہے اور ستارے اس کی آرتی اتارنے کے لئے دھرتی پر اتر آتے ہیں۔ اس کے چاند سے چہرے پر کجراری آنکھیں بہت زیب دیتی ہیں۔

محمد قلی طبعاً نغمہ و نشاط اور راگ کا شاعر ہے۔ اس کی غزلوں میں آسودگی، سیرابی، سرمستی، رنگینی اور رعنائی کے تمام روپ نظر آتے ہیں، لیکن اس کی شاعری محض عیش کوشی اور کامیاب عاشق کے نشاط وصل کی داستاں ہی نہیں بلکہ اس میں ایک دردمند اور ہجر آشنا شاعر کے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام میں فراقیہ اشعار کی تعداد نہ ہونے کے

برابر ہے لیکن یہ اشعار محمد قلی کے فکر و فن کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

مونظر سامنے نہیں ہے یار
نین پانی میں تیرتا دل دار
خدا جیو کی جاں کوں دکھا ایک بار
دکھاں عرض کر غم کروں خوار زار
رات میرے نین تج سونے نہ دیویں
او من گھر میں بیٹھ دیوانہ کیتا
تج بن پیارے نیند مگر نیناں میں نج آتی ہیں
اپنی اندھاری ہے کٹھن تج بن کٹی جاتی نہیں

ملک الشعراء اسد اللہ وجہی محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر و ادیب ہے۔ اس نے غالباً ابراہیم قطب شاہ کے آخری زمانے میں ایک شیوہ بیان شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا تھا۔ پھر اس نے محمد قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ کا عہد بھی دیکھا۔ "قطب مشتری" "سب رس" اور "فارسی دیوان" کے علاوہ اس کی چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ وجہی کی آٹھ غزلیں "قطب مشتری" میں اور "سب رس" میں شامل ہیں۔ ان غزلوں کے علاوہ مولوی سخاوت مرزا اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے اس کی مزید پانچ غزلوں کی نشاندہی کی ہے۔ وجہی کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ قدیم اردو کا ایک پختہ مشق اور قادر الکلام غزل گو بھی تھا اور اس نے غالباً فارسی کے ساتھ

تک دلچسپی تھی اس کا کوئی رکارڈ تاریخ میں نہیں ملتا، البتہ مورخین ایک پبلک عمارت "آتش خانہ" کا ذکر کرتے ہیں جس میں آئے دن ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں سے بعض محفلوں میں سلطان قلی بھی شریک ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیام مملکت کے ابتدائی زمانہ میں بھی اس بادشاہ نے علم وادب اور شعر و سخن کی ہمت افزائی کے لئے ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

سلطان قلی کے بعد اس کا تیسرا بیٹا جمشید قلی (۱۵۴۳ء۔۱۵۵۰ء) گولکنڈہ کے تخت پر متمکن ہوا۔ جمشید نے سیاسی اعتبار سے مملکت کو مستحکم بنانے میں خاطرخواہ حصہ لیا لیکن اپنے سات سالہ عہد حکومت میں وہ گولکنڈہ کے عوام میں مقبولیت حاصل نہ کرسکا، کیونکہ عام روایات کے مطابق اپنے بوڑھے باپ سلطان قلی کو قتل کروانے میں جمشید کا ہاتھ تھا۔ تاہم شعروادب سے جمشید کی دلچسپی ثابت ہے وہ فارسی میں فی البدیہہ شعر بھی کہتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم وادب کی سرپرستی میں وہ اپنے باپ سے پیچھے نہیں تھا۔ جمشید کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے سبحان قلی کو سات سال کی عمر میں تخت نشین کیا گیا، لیکن سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے ارباب سیاست کا ایک حصہ اس حکومت کے خلاف ہوگیا۔ اور سلطان قلی کے سب سے چھوٹے بیٹے ابراہیم قلی نے ۱۵۵۰ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ ابراہیم قلی کی تخت نشینی کے بعد گولکنڈہ کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ثقافت اور تمدن کو آج مورخین قطب شاہی ثقافت اور تمدن سے موسوم کرتے ہیں وہ اپنے نمایاں خدوخال میں ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ ابراہیم

اردو میں بھی کوئی دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہوگا جو ہنوز پردہ تاریکی میں ہے۔

وجہی کی غزل کی نمایاں خصوصیات زبان وبیان کی سلاست وصفائی واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی ہیں۔ قدیم اردو کے دوسرے کلاسیکی شعراء کی طرح وجہی کا کلام بھی ایک صحت مند نقطہ نظر کی غمازی کرتا ہے۔ وجہی کی غزلیں محمد قلی کے مقابلے زیادہ رواں سلیس اور پراثر معلوم ہوتی ہیں۔

تارے کتے نیناں کوں تج تاریاں میں بھی تو نہیں
شب بوتے تج زلف کوں شب میانے آتی تارکاں

ہے دل تیرا عشق لئی کیوں کر سرے گا دیکھنا
کو لگ مجھے عالم منے رسوا کرے گا دیکھنا

وجہی کی غزلیں اصلیت اور واقعیت کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کے کلام میں مقامی ماحول کی تہذیبی روایات اور معاشرتی خصوصیات کی چھاپ نظر آتی ہے اس لئے اس کی غزلوں میں مقامی دریاؤں، پرندوں، پھولوں، جانوروں وغیرہ کا ذکر جابجا ملتا ہے اس کے ہاں کاجی، جوگی، جوتشی، برہمن، کنول، گنگا، ہرنالی، نیند، راویاں، پنکھا، ناگ وغیرہ الفاظ مقامی اثر کی نشان دہی کرتے ہیں۔

وجہی کی غزلوں کا بیشتر حصہ عالم فراق کی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے کلام میں ایک دردمند اور حساس دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے اور سوز وگداز اور تاثر کی فراوانی کا احساس ہوتا ہے۔

دیدے مرے نادیدے جو دیدار دیکھے تھے

مج صبر دیو نہار وہ دیدار کہاں ہے

لوگاں یو کیا کہتے ہیں سو معلوم نیں بے مجے

مج بے خبر کوں کاں ہے خبر تجہ فراق تے

جاتا ہے جیو پیارے ٹک بیگ آکرم کر

تج درس دیکھنے کوں انکھیاں میں دم رکھیا ہوں

آخری شعر کا مضمون استاد ذوق نے کچھ اس طرح باندھا ہے۔

آنا ہے گر تو آؤ کہ سینے سے چل کے اب

آنکھوں میں آکے ٹھہرا ہے دم انتظار کا

دکھنی کی پندرہ غزلوں میں سے چھ ریختیاں ہیں ان میں حسین عورت کے جذبات، احساسات اور کیفیات عشق کی عکاسی کی گئی ہے اس کی تمنا دل اور آرزوں کا مرکز اس کا "پیو" ہے جس پر وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دینا عین زندگی سمجھتی ہے اور صرف ایک ہی کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ دکھنی کی ریختیوں میں نہ جنسی تلذذ اور نہ عریانی یا جذبات کی پراگندگی اس کے یہاں ایک ٹھہراؤ پاکیزگی اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔

یکتا میں سہیلی مرزا علی وہ جے پرند دھر نا

اس پیو کوں اپنا کرنا اس پاپی جیو کوں کہے

پیو اپنے کوں ٹک آج ہیں نس پینے دکھنی سوے کر

جب پیو چلا ست سیج تج تب سوتے اٹھی روئے کر

دکھنی اپنے عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور نثر نگار ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ

عالم، فلسفی اور حکیم بھی تھا۔ اس لئے اس کی غزلوں میں فلسفہ و تصوف، فقر و قناعت اور اخلاق و حکمت کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دکھاتا ہوں میں کچ تج یار دیک
توں جیوتے آپس کوں اپے مار دیک
خدا تج میں تیر یچ جیسا اہے
تو دیدار میں اپنے دیدار دیک
معین نکو کر لسے ایک ٹھار
وہ ہر ٹھار ہے اسکوں ہر ٹھار دیک
باطن فقیر ہوکر ظاہر غنی رہا ہوں
لوگاں میں یارے جیوں تیوں گھر کا بھرم رکھیا ہوں
بھوکا ہوں کر کسی کن میں بات نیئں پسار یا
آپس کوں آپ کھاکر اپنی شرم رکھیا ہوں

قدیم اردو کا ایک اور نامور عظیم المرتبت شاعر غواصی ہے۔ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا۔ عمر میں محمد قلی اور وجہی سے چھوٹا تھا۔ غالباً اس نے محمد قلی کے عہد میں شاعری کا آغاز کیا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اسے اپنے دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا اور وہ "وصاحت سم آثار" کے لقب سے نوازا۔ اس کو اپنی زندگی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کی "شکر افشانی" کے چرچے صرف دکن ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندستان میں ہونے لگے تھے اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے سبب "طوطیان ہند"۔ اس

کے "شکرستان" کی جانب رغبت کرنے لگے تھے۔ اس کو اپنی شہرت کا بخوبی احساس تھا۔ وہ کہتا ہے۔

طوطیاں سب ہند کے رغبت کریں تیوں آج خوش
شکرستاں ہو غواصی شکر افشانی کیا

حزب علی ہیں پور ہوں میراں کیرا منظور ہوں
غواصی ہو مشہور ہوں اس سلطنت کے بھار میں

اسی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے میر حسن قائم اور مبر تقی میرنے اپنے تذکروں میں غواصی کا ذکر کیا ہے جبکہ قدیم اردو کے دوہرے بلند پایہ شاعر مثلاً محمد قلی قطب شاہ اور ملک الشعرا وجہی ان تذکروں میں جگہ نہ پا سکے۔

غواصی کی تین مثنویوں (مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ) کے علاوہ غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے موجودہ مواد کی روشنی میں غواصی ایک باکمال غزل گو بلند پایہ مثنوی نگار اور ایک کامیاب قصیدہ نگار شاعر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصی دلیستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے غزل کے میدان میں قطب شاہی عہد کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ عادل شاہی دور کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کو پہونچ سکتا ہے۔ اس کی غزل میں بھرتی کے شعر یا ایسے اشعار بہت کم ہیں جن میں گہرا تاثر نہیں پایا جاتا۔

قدیم اردو کے دیگر کلاسیکی شعرا کی طرح غواصی کے کلام کی نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی اور حقیقت پسندی ہے لیکن جو چیز اس کو دکنی شعرا میں منفرد مقام بخشتی ہے اور اردو کے صفِ اول شعراء میں لا کھڑا کرتی ہے وہ تاثر کی فراوانی

سوز وگداز، نغمگی اور شعریت ہے۔ غواصی کو زبان اور بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے اس کے کلام میں پاکیزگی اور بلندی کا احساس ہوتا ہے اس کے انداز میں ایک اعتدال، ٹھہراؤ اور توازن نظر آتا ہے۔ اس کی آواز رچی ہوئی اور مصفا ہے۔ اس کا لہجہ مدھم، دل نشین اور اپنے معاصرین یا متقدمین سے مختلف ہے، وہ اپنے پیشرو یا ہم عصروں کی بازگشت نہیں۔ غواصی دکنی غزل کے ایک نئے اسکول کا بانی ہے جس کی بعد کے بلند پایہ شاعروں نے خصوصاً ولی اورنگ آبادی نے پیروی کی ہے۔

غواصی ایک حسن پرست شاعر ہے اس کا رومانی جذبہ خارجی شاعری کی تصویر کشی میں زیادہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ مناظر قدرت کی عکاسی میں اس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کی مثنویوں اور قصیدوں میں مناظر فطرت کی مرقع کشی کے متعدد بیش بہا نمونے موجود ہیں۔ غزل میں بھی اس نے منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ محبوب کے حسن کو اجاگر کرنے کے لئے بھی اس نے مناظر قدرت سے طرح طرح سے کام لیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

بلنور کر جیو کوں میرے اوک لبد اٹیا تیرا
لکل مکھ ہور نین نا رگس رنگیلا گال گل لالہ
چمن کے جھاڑ سب خوش ہو گئی پھولال منے تیرا
سہیلا گاو تے پاتاں کے ہاتاں سوں بجا تالہ

اس میں شک نہیں کہ غواصی نے اپنے اردگرد کی اشیا کو آنکھ کھول کر دیکھا ہے۔ مناظر قدرت کا غائر نظر سے مشاہدہ کیا ہے لیکن اس کے بیان کی خارجیت میں جذبے کی داخلیت بھی شامل ہے۔ کہیں کہیں یہ داخلیت خودکلامی کا روپ

اختیار کر لیتی ہے قلبی واردات کا بیان اس نے جس حسن انداز سے کیا ہے اور اس میں سادگی و پرکاری نے جس طرح نئے نئے پہلو تراشے ہیں وہ بیک وقت اس کے جذبات کی گہرائی اور فنی پختگی کی دلیل ہیں۔ چھوٹی بحروں میں غواصی کے اشعار میر تقی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ حسب ذیل اشعار کی سپردگی گداختگی اور سوز و گداز ملاحظہ کیجیے۔

دل میں اک بات ہے کسے نہ کہوں
کہ پھٹے گی وہ بات یاں واں پڑ
دل کی دیوانگی نہیں جاتی
پھرتا ہوں جتا دعا یاں پڑ

اے سجن تج کوں یاد کر پل پل
رو دل اپس میں ہیچ میں ڈھل ڈھل

غواصی کی شاعری بنیادی طور پر جذبات و احساسات کی شاعری ہے جذبات کی موثر ترجمانی اور قلبی واردات کی فنکارانہ عکاسی کی وجہ سے اس کا تمام کلام غنائیت کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود انتہائی سادگی کے کلام میں بلا کا اثر ہے۔ تاثر کے ساتھ اس کے کلام میں سوز و اثر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ پُر درد مضمون کو غزل کے ساز پر کچھ اس طرح چھیڑتا ہے کہ سننے والا بھی اپنے دل کے تاروں میں ارتعاش محسوس کرے۔

ہماری وہ چنچل سجانا کہاں
لگی چیٹپی مکھیر پانا کہاں
منجے اس نخے دل توڑ دکھتے دے
اسوں توڑ دل بی لگانا کہاں

اس آفتاب باج مری انکھیاں تلیں
دستاہے دیس آج شب تار کیا کروں

دوسرے دکنی شاعروں کی طرح غواصی نے بھی اپنے کلام میں ہندستانی روایات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کی شاعری میں ہندستانی ماحول ہندستانی معاشرت، ہندستانی تصورات، یہاں کے سبزہ گل، مناظر فطرت اور رہن سہن کے مقامی طور طریقوں کی دل کش تصویریں ملتی ہیں اس کے ہاں یہ ہندوستانیت محض زبان تک محدود نہیں بلکہ اس کے خیال، سوچنے کے انداز اور طرز بیان میں بھی نمایاں ہے۔

اردو کے اکثر غزل گو شاعروں کی طرح اس نے ہندستان میں رہ کر شیراز و اصفہان کے راگ نہیں الاپے۔ اس کے کلام میں عجمی لالہ زاروں وہاں کے پرندوں، دریاوں یا قصوں کے حوالوں کی بجائے ہندوستانی پرندوں، جانوروں، یہاں کے موسموں، نظاروں وغیرہ کا ذکر جابجا ملے گا۔ غواصی کی غزل میں ہندستانی اقدار اور مقامی روایات کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کے بیشتر اشعار میں حسن و عشق کے وہی مضامین اپنائے گئے ہیں جو ہندوستانی ذوق کے

مطابق ہوں۔ حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں نہ صرف مقامی روایات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ بلکہ ان اشعار کے خالق کے طرز فکر اور متخیلہ پر بھی ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے۔

رنگ بھریا منج گھر میں آج آیا بسنت
غیب تھے نازاطرب لیایا بسنت
درس تیرا سود ین کا دیوا
لٹ تری کفر کی ہے دیوالی
ملک دکھن میں حور تھے نادر ہوتوں بنچی ہے کر
ہے بے نہایت اے سکی ملک دکھن کوں آج فرح
حال یکساں نہیں کہ جیوں جمنا
کم بھبتور یو بر کر اتر جیادل

غواصی کا محبوب پیکر حسن و شباب، اور نسوانی محاسن کا مجسمہ ہے۔ جس کی چلتی پھرتی پرچھائیاں اس کی غزل میں دکھائی دیتی ہیں۔ غواصی نے محبوب کے لئے واضح طور پر تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے اور برملا انداز میں اس کو 'ناز' دھن، 'سکی' 'سندری'، 'سجانا' موہنی وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے

غواصی کو اپنی بلندئ فکر اور شاعرانہ کمال کا شدید احساس تھا۔ وہ اپنے پیش رو یا ہم عصر دکنی شعرا میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل گوئی کے میدان میں غواصی نہ صرف دلستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے بلکہ جدید غزل گو شعرا مومنؔ، حسرتؔ جگرؔ، اور فراقؔ سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ اس کے کلام میں ایسے بیسوں اشعار موجود ہیں، جن میں اس نے

اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور زمانے کی قدر ناشناسی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک بڑے فن کار کی طرح اپنے ہم عصروں سے اپنے فن کی داد چاہتا ہے ۔

غواصی جوہراں جوتی تو لئی دھرتا جیوں ہیں آ

کہاں وہ جوہری پارک جو پرکھے جوہراں میرے
حکوئی عارف کے صاحب بچے ہیں سو کہتے ہیں یوں

کہ یاں تو کوئی نہیں دستا غواصی کے قربنے کا

مملکت گولکنڈہ کا ساتواں تاجدار سلطان عبداللہ اردو فارسی کا ایک خوش گو شاعر تھا ۔ اس کو شعر و ادب کا چسکا اور اہل علم و ادب ہنر کی سرپرستی ورثہ میں ملی تھی ۔ عبداللہ قطب شاہ اور اس کے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طبیعت و مزاج میں کئی امور مشترک ہیں دونوں نہ صرف یہ کہ بلند پایہ شاعر، علم و ادب کے رسیا اور فنون لطیفہ کے مداح تھے بلکہ دونوں عورت اور شراب کے دل دادہ بھی تھے ۔ طبیعت اور مزاج کی اس مناسبت کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ادبی اور تمدنی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ میں وہی ماحول پیدا ہوگیا تھا جیسا کہ محمد قلی کے دور میں موجود تھا ۔

عبداللہ قطب شاہ کا مکمل دیوان ہنوز دریافت نہیں ہوا ہے اس کا موجودہ دیوان (۱۱۸) صفحات پر مشتمل ہے جس میں صرف ردیف "ث" تک ۹۷ غزلیں اور ایک مرثیہ شامل ہے ۔ سادگی و پرکاری اور بے ساختگی و برجستگی عبداللہ کی غزل کی اولین خصوصیت ہے اس نے اپنے سیدھے سادے مشاہدات، احساسات، اور تجربات زندگی کو سیدھے سادے الفاظ اور رواں پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے ۔ اس کے کلام میں نہ محمد قلی کی سی رنگارنگی، شوخی،

شگفتگی اور رعنائی ہے اور نہ غواصی کی طرح تجربہ کی تہہ داری اور جذبات کی گہرائی۔

سراپا نگاری، وصل محبوب، شراب، اور عورت کے مختلف اعضاء کی تصویر کشی، سلطان عبداللہ کی غزل کے خاص موضوعات ہیں۔ اس کا تمام دیوان محبوب کے حسن و جمال، قد و قامت، رفتار، و گفتار، لب و رخسار اور چشم و ابرو کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے۔ اس نے اپنی غزلوں میں محمد قلی کی طرح محبوب کا سراپا بیان کیا ہے۔ عبداللہ کی سراپا نگاری میں محمد قلی کی سی جزئیات نگاری، رنگا رنگی اور تنوع تو نہیں لیکن اس کے ہاں چلبلاپن، شوخی عورت کے مختلف اعضاء سے لطف اندوزی اور چھیڑ چھاڑ کا احساس نہیں ہوتا۔

موتی مدن میں لگنے بینی ہے پھول مالا
یا چاند کے گلے میں حلقہ ہوا ہے ہالا
لٹ بیل ہے بنفشہ آنکھی ہر ایک نرگس
مکھ پھول سیونتی کا رخسا جیوں ہے لالا
مکہ نور کا دریا ہے بھویاں سوتلہین کالے
انکھیاں تیریاں ہیں مچھلیاں ٹکے سوتا اجالا
صدقے نبی کے سیایا عبداللہ کے من کون
تیرا لو ناز غمزہ تیرا بو چھند چالا

غزل میں ہندوستانی ماحول اور روایات کی ترجمانی دکنی شعرا کا اہم کارنامہ ہے دیگر دکنی شعرا کی طرح عبداللہ کی غزل بھی مقامی ماحول اور مقامی

نے ایک طرف تو سیاسی اعتبار سے سلطنت کے استحکام اور توسیع کے لئے کامیاب جدوجہد کی اور دوسری طرف اپنی مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے مابین اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی ارادی کوشش کا آغاز کیا۔ لڑکپن ہی کے زمانے سے ابراہیم قلی علم و ادب سے اپنی دلچسپی کے لئے مشہور تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس کی یہ دلچسپی ادیبوں اور اہل کمال کی قدردانی اور سرپرستی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ وہ علم و ادب کا اس قدر رسیا تھا کہ سفر و حضر میں علماء و فضلا کے علاوہ کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ابراہیم قلی کی زندگی کا بڑا حصہ چونکہ ایک تلگو ریاست میں بسر ہوا، اس لئے اس کے مزاج میں مختلف طبقات کے تعلق سے مروت اور رواداری کے جذبات موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں تلنگانہ میں بسنے والے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ ابراہیم قطب شاہ تلگو کا سب سے پہلا سرپرست ہے۔ وہ تلگو زبان پر عبور رکھتا تھا اور تلگو ادب سے لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ اس کے دربار میں عربی فارسی کے علماء کی طرح تلگو زبان کے شاعر بھی باریاب ہوتے تھے۔ اس زمانہ کے متعدد تلگو شاعروں نے اپنے کلام میں ابراہیم قلی کی قدردانی کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ ابراہیم قلی تلگو شعراء میں "ملک برام" کے نام سے مشہور تھا۔

قدیم اردو کی تاریخ میں ابراہیم قطب شاہ کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس کے عہد میں گولکنڈہ کی سرزمین پر پہلی بار اردو شعر و ادب کی شمع روشن ہوئی۔ دبستان گولکنڈہ کے اولین شعراء فیروز، محمود، خیالی وغیرہ سب کے سب ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہد ہی سے متعلق ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت گولکنڈہ علم و ہنر اور تہذیب

تہذیب و تمدن کی غمازی کرتی ہے۔ اصلیت، واقفیت اور حقیقت پسندی اس کی غزل کی نمایاں خصوصیت ہے۔

عبداللہ کے کلام میں ہندستانی فضا، ہندستانی دیومالا اور ہندستانی تہذیب و تمدن کی مکمل ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کی غزلوں میں بسنت رُت، مرگ اور نوروز بھی ہے اور رام کا بان، بن باس اور راجہ اندر کے اکھاڑے کی اپسرائیں، مینکا اروشی، اور رنبھا بھی، کوئل کو کو بھی ہے اور پپیہے کی پیہو پیہو بھی۔ بھنور اور کنول بھی ہے چمپا اور چنبیلی بھی چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہر اک تیرا پلک ہے رام کا بان
ہر اک سوکا ہے تیرا جیوں کٹ را

بسنت آیا کھلایا پھول لالا
سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا

کنول تو جن کنول جوبن، کنول من
کنول ایسی نول نے آ کھلایا

میں کا رنبھا ار بسی آ کے ناچیاں
تو ہا ہا دہو ہوتے مندل بجاتا

عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ غیر مردّف غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیشرو شعراء مثلاً محمد قلی غواصی یا وجہی کے ہاں یہ رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ عبداللہ کے دیوان کی منجملہ ۹۷ غزلوں میں سے ۵۶ غزلوں میں ردیف کا اہتمام روا نہیں رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی بیشتر غزلیں غیر مردف

ہیں لیکن اس نے نہ صرف یہ کہ قافیہ کی مدد سے غزل کا جادو جگایا ہے بلکہ موسیقی کا احساس پیدا کرنے کے لئے متعدد غزلوں میں چار چار یا اس سے زاید قافیئے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً

چندر کلا تیرا گلا ہے نرملا اجکلا — سو منج بھلا کے منلا کیا گلا دو نرملا
نین میں لاتو کا جلا بتا بلا نکو گھلا — لٹ اپسیا ہلوں ہلا کہ جلبلا ہے دوبلا
مرادلا ہے بادلا الا بلا منجے بلا — جو مد بلا تجے گلا یوں بھلا کے بیجلا
نبی کے صدقے عبدلا کدم کلا سنے کوں لا — تجے ہلا لیا منگل گلا حیدر کلا

محمد قلی قطب شاہ کی طرح عبداللہ کو بھی حضرت محمد صلعم کی ذاتِ اقدس سے بے پناہ عقیدت تھی۔ محمد قلی کی طرح اس غزل کا ہر مقطعہ نبی صدقے سے شروع ہوتا ہے۔ مقطعوں سے قطع نظر اس کے دیوان میں تین نعتیں بھی موجود ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نبی کا "داس" اور "سیوکی" کہتا ہے دنیاوی ترقی، شاہانہ وقار، شاعری میں جادو بیانی، عیش کوشی اور وصلِ محبوب کو بھی نبی کا صدقہ قرار دیتا ہے۔

شاہ عبداللہ جو ہے حضرت نبی کا سیوکی — ہر گھڑی صلوات بھیجے دیکھ کر نیر اجال
صدقے نبی کے شوخ النظر شاہ عبداللہ جگ گھر — تج جو نیاں کے دوئی کر خوش دست کر بلکا گیا

دلستانِ گولکنڈہ کے دیگر غزل گو شاعروں میں میراں جی خدانما، احمد، ملک یزدی، ابن نشاطی، اور شاہ ابوالحسن کے نام قابل ذکر ہیں ان شعراء نے قطب شاہی سلاطین کے عہد میں غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں محمد قلی، یا غواصی کی طرح کوئی اہم رول انجام نہیں دیا بلکہ دیگر اصنافِ شعر کے ساتھ ساتھ وہ ایک غزلیں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی حیثیت تبرک سے زیادہ نہیں ہے۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۷۹ء کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا۔)

ڈاکٹر جمال شریف

دکنی رباعیاں ـــ قطب شاہی عہد میں

دکنی رباعی کا آغاز شاعری کے ابتدائی دور سے ہی ہوا۔ اس صنف کی ابتدا فارسی شاعری سے ہوئی اور دیگر اصنافِ سخن قصیدہ، مثنوی، غزل اور مرثیہ کی طرح فارسی سے اردو میں آئی اور مقبول ہوئی، اس میں عام طور پر صوفیانہ مضامین بیان کئے جاتے ہیں اور اکثر اخلاق و مذہب، فلسفہ و تصوف اور وحدت الوجود جیسے اہم اور خاص مسائل ہی کو بیان کیا جاتا ہے۔ رباعی میں جس مضمون اور خیال کو بھی بیان کیا جائے اس میں جدت و ندرت، اختصار و اجمال، لطافت و پاکیزگی اور سلاست و روانی بھی ضروری ہے۔ رباعی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انتخابِ الفاظ اور ترتیبِ بیان متین اور موزوں ہو۔ متانت اور سنجیدگی رباعی کے لئے ضروری ہے، ورنہ ابتذال اور عامیہ پن کی وجہ سے رباعی کا تاثر ختم ہو جاتا ہے۔

اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں متعدد رباعیاں موجود ہیں۔ محمد قلی کے درباری شاعر ملا وجہی نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دکنی شعرا اور بھی ہیں جنھوں نے رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دکن کے جن شعرا کی رباعیاں ملی ہیں با ترتیب زمانی کے لحاظ سے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ دیگر دکنی شعرا نے بھی رباعیاں کہی ہوں جو یا تو تلف ہو گئیں یا راقم حروف کو دستیاب نہ ہو سکیں۔

حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۷۲۱ - ۸۲۵ھ) اردو کے پہلے رباعی گو شاعر ہیں۔

آپ کی نثر ونظم کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ گو قدیم اردو کے ابتدائی نمونے ہیں لیکن لسانی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں چونکہ حضرتؒ سے پہلے کے کسی بزرگ یا شاعر کا اردو کلام نہیں ملتا اس لئے نثر کی طرح نظم میں بھی اولیت کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ خواجہ بندہ نواز ہی اردو کے پہلے شاعر ہیں۔

حضرت کے کلام کے مختلف شعری نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن میں رباعی بھی ہے اس لئے خواجہ بندہ نوازؒ کو پہلا رباعی گو شاعر سمجھنا نامناسب نہ ہوگا۔ دوران تحقیق مجھے حضرت کی ایک رباعی کے ساتھ رباعی کے عنوان سے ذیل کا ایک قطعہ بھی ملا ہے جو رباعی نہیں ہے

لڑنے کا جب دھرے تو (خیال) لڑکے پھرنا آخر کو نا کسی تواں بات نہ سپرڑنا
کہہ کر اے مسلمان لڑنا تو سب کفر ہے لڑنا تو کافراں سوں ثابت قدم ہو مرنا

ذیل کی سرخی کے ساتھ حضرت کی یہ رباعی بھی ملی ہے ؎

رباعی حضرت خواجہ بندہ نوازؒ

مشہور زنجیر تیو دیکھ پیچ ہے واللہ مرنے کے آگے مر کے ہو فانی فی اللہ
خناس کے وسواس توں پائمالی ہو لاحول ولا قوۃ الا باللہ

محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ - ۱۰۲۰ھ)

یہ قطب شاہی سلطنت (گولکنڈہ) کا پانچواں عظیم المرتبت بادشاہ گزرا ہے۔ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کے انتقال پر ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا بڑا علم دوست اور علم پرور بادشاہ تھا۔ اردو زبان کا سرپرست اردو ادب و شعرا کا مربی و قدرداں تھا قدرت نے اسے سلطنت دکن کے علاوہ سلطنت سخن کی بھی بادشاہت دی تھی وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ اس سے پہلے

کے کسی دور شاعر کا اردو دیوان یا مجموعہ کلام آج تک دستیاب نہیں ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ اپنے نام کے سوا معانی تخلص بھی کرتا تھا۔ اس نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا اور اردو شعر و سخن کی ایسی سرپرستی کی کہ علماء و شعرا اس کے دربار میں جمع ہو گئے اور خود بھی اس کا ایسا رسیا بن گیا کہ اردو زبان میں تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل کلیات اپنی یادگار چھوڑا۔ اس کا کلیات اس کی منظوم سوانح حیات بھی ہے اور اپنے عہد کی تاریخ بھی اس سے محمد قلی کی زندگی کے حالات اور اس کے دورِ حکومت کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی زمانے کی تہذیب و تمدن رہن سہن کے طریقے عید اور تہوار اور موسموں کے مناظر نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا سچا ترجمان تھا۔

محمد قلی قطب شاہ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے اپنی شاعری سے اردو زبان اور شاعری کو بڑی وسعت بخشی اور مالا مال کیا۔ غزلوں کو تو اس نے صحیح معنی میں عشق و محبت کی زبان بنا کر اہم بامعنیٰ بنا دیا۔ بقول ڈاکٹر زور محمد قلی نے غزل کو محض عشق و عاشقی ہی کے لئے محدود نہیں رکھا بلکہ غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کے لئے بھی اس نے اسی صنفِ سخن میں کمال پیدا کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں متعدد رباعیاں بھی ہیں یہ رباعیاں حمد و نعت، منقبت، تصوف و اخلاق اور حسن و عشق وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ ان میں اس کی وہ رباعیاں زیادہ خاص ہیں جن میں اس نے حسن و عشق کے واقعات کو منظوم کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کی زندگی زیادہ تر عیش و عشرت اور حسن پرستی میں گزری اور اسی میں اس کی اصل زندگی منعکس ہوتی ہے۔ اس نے رباعی کو جو اپنے اختصار اور اجمال کی بناء پر غزل سے قریب، اور مزاج اور آہنگ میں بالکل مختلف ہے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

ذیل میں اس کی چند رباعیاں پیش ہیں سے

تجہ حسن تھے تازہ ہے سدا حسن و جمال — تجہ یاد کی مستی رہے عشق کوں حال
توں ایک ہے زخ سا نہیں دوجا کوئی — کیوں یاد دے جگ منجے میں کوئی تیرا مثال

ہے پھول کا ہنگام مدسوں یاراں حاضر — پھولاں کے تئیں سارے ہیں یاراں حاضر
اس وقت یو کیوں توبہ کیا جائے منجے — توبہ شکناں ہور نگاراں حاضر

مستی کے ملک میں ہے جہانبانی منجے — خوباں کو دیکھن میں ہے مسلمانی منجے
خمار کا خمخانہ اہے تھانوں میرا — ہر مدکا سو ئبند نگینا سلیمانی منجے

اب دوست سوں مل بیٹھ کہ میں جام منگوں — اس ہونٹ شکر لیے تھے میں کام منگوں
آرام دلآرام تھے ہے دل کوں سدا — میں اپنے دل آرام تھے آرام منگوں

کہنی کہ تری ہوں گی نوار اندیشہ — دل اپنا خوشی کر و لبار اندیشہ
دل کوں کہاں ہے دل کہاں صبر او ہے — یک ٹھنڈ ہو ہور اس کوں ہزار اندیشہ

نابات او محبوب سندر کا کہے جائے — ناز از لیس دل کے بھتر کا کہے جائے
جے کوئی اچھے جیو کے نمنے دل کے بھتر — اس سات نکن عشق ابھر کا کہے جائے

کہے کہ یکٹ ہو جو اچھے گا گھر میں — افسانہ کہن آؤں گی تب تج بر میں
گھر خلوت ہوا ہور نہیں کوئی گھر میں — او بات توں لبر سے ہے اپنے سر میں

نہیں کیں نخ ایسی سہیلی چھبیلی   نخ ایسی نہ اچھ ہے جگت میں رنگیلی
سہیلی جگت میں نہ دیکھیا گہیلی   چھبیلی رنگیلی گہیلی نویلی

وجہی :- اسد اللہ نام اور وجہی تخلص ہے اور ملّا وجہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ قطب شاہی دور کا بلند پایہ اور ممتاز شاعر اور زبردست ادیب تھا۔ وجہی ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں موجود تھا۔ اس نے محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ اس کی شاعری کی ابتدا گو ابراہیم قطب شاہ ہی کے دور سے شروع ہوئی لیکن محمد قلی قطب شاہ کی شعر و سخن سے دلچسپی اور شعرا نوازی نے وجہی کو بھی ابھرنے اور چمکنے کا موقعہ دیا۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں اس نے "سب رس" اور ... "قطب مشتری" کے مصنف کی حیثیت سے مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ دربار سے منسلک ہوا اور ملک الشعراء کے درجہ کو پہنچا۔ دربار میں اس کی بڑی عزت اور قدر تھی۔ وجہی کو اپنی شاعری پر بہت ناز تھا اور وہ دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا چنانچہ ملا غواصی بھی وجہی کے مقابلہ میں بالکل ماند تھا۔

وجہی بڑا خوش نصیب شاعر اور ادیب ہے اس کی نظم و نثر دونوں کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں اس کی تصانیف سے نظم میں مثنوی قطب مشتری بہت مشہور اور قابل قدر ہے۔ یہ محمد قلی ولی عہد گولکنڈہ کی منظوم عشقیہ داستان ہے جس کا ہیرو محمد قلی ہے نثر میں وجہی کی "سب رس" بہت مشہور کتاب ہے۔ وجہی کا نثری کارنامہ بھی اردو ادب کا ایک لافانی شاہکار ہے۔ اصناف سخن میں مثنوی اور غزل کے علاوہ اس کی رباعیاں بھی قطب مشتری اور سب رس میں موجود ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں :-

عاشق ہے جکوئی پند اسے بھاسی نا   ہے تلخ اس بات میں تے جاسی نا
کیا بوجھنا عشق تے کوتے یو اُسے   ہرگز کسی کے کنے منے وہ آسی نا

دیتا ہے نفا پہ رہتا ہے جس رے لگ   دوئی نے اسے جان نہ دے قرب لگ
گر پیو سوں مل پیو چہ ہونے مشکل ہے   تو یاد کر اس پیو کوں اپس لبرے لگ

اس باغ منے آج جو آئی ہے پری   یکدل ستی جیو تج سوں لگائی ہے پری
بھو دھات اس سات مجلس کوں سنگار   اے شاہ تجے بیگ بلاتی ہے پری

پردیسی ہوں پردیس میں ہے ٹھار منجے   پردیسی ہو ہو رہنا ہے ناچار منجے
طاقت ارے صبر توں بھی کچھ اُبر یا نہیں   اب کون ملے گا کوئی میرا یار منجے

خوشحال ہر جیو آج خوشی پاتا نیں   پیتا ہوں شراب ہور اتر آتا نیں
کانٹیاں کے مزے دستے ہیں پھول سب   تج باج سکی باغ منجے بھاتا نیں

غواصی: غواصی قطب شاہی سلطنت کا بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے تین قطب شاہی سلاطین محمد قلی قطب شاہ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں اس کی شاعری کی ابتدا ہوئی اور وجہی جیسے ممتاز بزرگ شاعر کے مقابل چمک نہ سکی۔ البتہ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں اسے مقبولیت اور شاہی تقرب حاصل ہوا اور دربار میں کافی عزت اور قدر و منزلت نصیب ہوئی اور نتیجہ میں عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء بن گیا۔ اسے عبداللہ قطب شاہ کے دور کے ممتاز مثنوی گو شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ اس کی دو مشہور مثنویاں، سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کافی مشہور ہیں۔ اس کے دیوان کا ایک ناقص اور نامکمل مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے جو ادارہ ادبیات

اردو کی جانب سے چھپ چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا غواصی ایک قادر الکلام مثنوی گو شاعر ہی نہیں بلکہ ایک صاحبِ دیوان شاعر بھی تھا۔ دیوان میں بہ دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ اس کی رباعیاں بھی موجود ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

بن دام توں اے یار کسی باٹ نہ جا ∗ بن بیر بہت باٹ کدھن واٹ نہ جا

جے باٹ جو سیدا نیئں معشوق طرف ∗ سنتا ہے مری بات تو اس باٹ نہ جا

اے پیو مجھی یک بات ہے تج سات بغیر ∗ کس دیھر کہیا جائے نہ دو رات بغیر

یک بست رکھی ہوں تیرے تئیں گھٹر ای باندھ ∗ آنکھوں لے کھل سے دو تج بات بغیر

اے دل جو یو دنیا ہے گزر نے گزری ∗ ہوتی کدھیں خالی کدھیں بھرتے گزری

سودا لے سر سن مول نکر آج درنگ ∗ ہے بیگ سر نہار یو سر نے گزری

اے عقل تجھے رفیق دانا ہونا ∗ اے عشق تجھے یار دیوانا ہونا

میں مست ہوں ان وات منجے جام ہور نے ∗ محبوب نلملا ہو ترا نا ہونا

اے ناز بھری میں نہ رٹھوں گر توں رٹھی ∗ رٹھنی تو ی امرت تہی میٹھی منکوں ڈٹھی

کیا خوب انکھیاں منج ستی تھی فتنی ∗ تج لٹ جو لی بارسوں جاگ اٹھی

ہشیار کدھیں نہو گی مستی میری ∗ مجھے سات رنگی گئی ہے یو ہستی میری

جیوں چاند ہور آفتاب عالم میں ∗ مشہور ہے آج مے پرستی میری

دو ناز بھری انگ مرے جانان کی — سدھ چھین لیتی چھن میں مسلمانان کی
اس گال پہ جو بال بکھر پھرتے ہیں — گویا ہے وہ جماعت پریشانان کی

غواصی توں حق بانج کسے منگ نکو — گر ہے توں موحد تو کسوں سنگ نکو
مارگ میں محبت کے ہیں کانٹے کانٹے — کانٹیاں پہ چلبانیٹ سوں جالنگ نکو

جب چرخ شرابی کہ مرا نام رکھیا — خورشید مرے دہانے میں لیا جام رکھیا
اسلام کر اکفر لگیا دیکھ سوارا — میخانے میں جا ہیں گرو اسلام رکھیا

عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ - ۱۰۸۳ھ) | یہ قطب شاہی سلطنت کا ساتواں بادشاہ ہے جو اپنے والد سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال پر ۱۰۳۵ھ میں تخت پر بیٹھا۔ یہ اپنے نانا اور والد کی طرح دوست اور علم پرور بادشاہ تھا۔ اردو زبان کا شیدائی اور سرپرست تھا اور شعراء و مصنفین کا قدردان اور مربی ہونے کے علاوہ خود بھی اردو کا پرگو شاعر تھا۔ عبداللہ تخلص کرتا تھا۔ اس کے دربار میں علماء و شعراء جمع تھے۔ وجہی اور غواصی اس کے دربار ممتاز بلند پایہ اور ملک الشعراء تھے۔ عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا قلی قطب شاہ کی طرح ایک صاحب دیوان شاعر گزرا ہے جو اقلیم دکن کے ساتھ ساتھ اقلیم سخن کا بھی تاجور تھا۔ ہر صنف سخن میں اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی لیکن رباعی اس کے مطبوعہ کلیات میں نہیں ہے۔ مجھے تحقیق کے دوران میں اس صاحب دیوان شاعر بادشاہ کی ایک رباعی ملی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

و تمدن کا ایک مرکز بن چکا تھا۔ ابراہیم قلی کا فرزند سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء - ۱۶۱۱ء) نہ صرف ایک خوشنما شہر کا بانی، رعایا پرور حکمراں اور دکنی تہذیب و تمدن کا معمار تھا بلکہ اردو، فارسی اور تلگو زبان کا شاعر بھی تھا۔

ابراہیم قلی کی وفات کے بعد درباریوں کے ایک گروہ کی سازش کی بدولت اس کے پہلے فرزند کو تخت و تاج نصیب نہ ہوسکا اور محمد قلی جو ابراہیم قلی کا چوتھا فرزند تھا پندرہ سال کی عمر میں گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا۔

محمد قلی قطب شاہ کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی - اور اس کا دور حکومت دو ایک معمولی لڑائیوں کو چھوڑ کر امن و امان میں گذرا۔ یہ ضرور ہے کہ اندرون ملک اس کے مخالفین کے گروہوں نے وقتاً فوقتاً سازشیں کیں اور کبھی کبھی ہنگامے بھی کھڑے کئے لیکن محمد قلی کو انھیں کچلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

اس کے زمانے میں ایران کے ایک مشہور عالم میر محمد مومن حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ جنھیں بادشاہ نے اپنا مہتر مقرر کیا تھا۔ سلطنت کے بیشتر کاروبار کی عام نگرانی بھی میر محمد مومن ہی کے سپرد تھی۔ یہی سبب تھا کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی فکروں سے بڑی حد تک بے نیاز رہ کر عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کا موقع مل گیا۔

ابراہیم قطب شاہ کے چار فرزندوں میں محمد قلی کی تعلیم و تربیت دوسروں کے مقابلے میں ادھوری اور ناقص ہوئی تھی۔ لڑکپن کے زمانے سے وہ خودسر بلکہ آوارہ مزاج ہوگیا تھا۔ مورخین نے اس واقعہ کی تفصیل تاریخوں میں لکھی ہے کہ کس طرح لڑکپن میں ایک بار جبکہ موسیٰ ندی میں طغیانی آئی ہوئی تھی محمد قلی نے اپنی جان

اس جگ کے سب خوباں منے پرتو او سیکا جس ہے — جن ایک کوں دیکھیا جمع میں خاطر او سیکا جمع ہے
یک شمع کے اسپاس جوں دلکھیں ہزار آرسیاں — دستا ہے ہر ایک میں جُدا لیکن وہی ایک شمع ہے

میراں جی خدا نما یہ قطب شاہی دور کے صوفی شاعر اور ادیب ہیں۔ عبد اللہ قطب شاہ کے زمانے میں موجود تھے اور سنہ ۱۰۸۶ھ میں انتقال ہوا۔ امین الدین اعلیٰ بن برہان الدین جانم بیجاپوری کے مرید اور خلیفہ تھے اور اپنے پیر و مرشد اور اس سلسلے کے بزرگوں کی طرح حضرت نے بھی اپنے مریدوں اور معتقدوں کی تعلیم و تربیت اور عوام کی ہدایت کے لئے دکنی تصوف و سلوک وغیرہ پر نثر و نظم میں مختلف کتابیں لکھیں۔ مولوی عبد الحق نے اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اردو" میں ان کا ایک ادیب اور نثر نگار کی حیثیت سے ذکر کیا ہے البتہ ڈاکٹر عبد الحفیظ قتیل نے اپنی کتاب "میراں جی خدا نما" میں ان کے منظوم کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے نمونہ کلام بھی دیا ہے۔ میراں جی خدا نما کے نثری کارنامے اردو ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے اور زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح میراں جی شاعر سے زیادہ ایک ادیب اور نثر نگار کی حیثیت سے زیادہ نمایاں اور مشہور ہیں اگرچہ کہ اس دور کے ہمعصر شعراء میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن شاعری کے ذریعہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ و تدریس کے جس کام کا آغاز حضرت خواجہ بندہ نوازؒ اور اس سلسلے کے بزرگوں اور صوفیا نے کیا تھا میراں جی خدا نما نے ان کی اتباع میں اسی تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ اور نثر و نظم دونوں میں یادگار کتابیں اور منظوم کارنامے چھوڑے۔ مجھے دوران تحقیق دیگر اصناف کے علاوہ حضرت کی ایک رباعی بھی ملی ہے جو یہ ہے ؎

دو دیس کے دنیاں میں منم مستی کیا — توں اہل نیست ہے تحقیق تجھے ہستی کیا
بستی میں شد لا چہ توں جہلوں تجہ نہ فنا — توں اہل خرابات تجھے ہستی کیا

میراں یعقوب | یہ قطب شاہی دور کے صوفی شاعر اور ادیب ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ میں موجود تھے۔ یہ میراں جی خدا نما کے مرید اور خلیفہ تھے انہوں نے اپنے پیر و مرشد کی ہدایت پر شیخ رکن الدین بن عماد کاشانی کی فارسی کتاب "شمائل الاتقیاء" کا اردو نثر میں اسی نام سے ۱۰۷۸ھ میں نہایت کامیاب ترجمہ کیا تھا جو قدیم اردو کی ایک کامیاب اور نادر کتاب خیال کی جاتی ہے۔ اس میں نثر کے ساتھ ساتھ اشعار اور رباعیاں بھی ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میراں یعقوب اپنے سلسلہ کے بزرگان طریقت کی طرح خود بھی اردو کے ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے اور دکنی زبان (قدیم اردو) پر کافی عبور اور قدرت رکھتے تھے۔

ذیل میں ان کی چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں ۔

جن ہمارا یار ہیں اللہ اس کا یار اچھو   جن ہمن آزار دیوے راحت اس کی بسیار اچھو
جن ہماری باٹ میں کانٹا رکھے کچھ بر سوں   پھول اس کے عمر بھر باغ کا بے خار اچھو

اس مذہب ہور دین کوں سب چال سٹوں   مذہب کے بدل اپنے انگے عشق رکھوں
کب لگ رکھوں سنج دل میں تیرا عشق چھپا   مقصود نہ مذہب ہے مقصود ہے توں

جی بھید خوش آواز میں ہے پنہاں   وہ بھید ہے سو قرآن میں عیاں
اس دعوی کی صحت کوں سمجھے خاطر   فی الحق یرید باشا و اللہ ہی برہاں

کہاں ایک کامل جو ہووے میرا ہمدم   یا کوئی بیدل جو پاؤں اسکوں محرم
بس دو نو ہمیں کنج میں خلوت بیٹھے   میں ماتم اس کا کروں وو آپ ماتم

محمد اکبرالدین صدیقی

قطب شاہی دربار میں ایرانی شعرا

گر صفاہاں گوشد از شاہ جہاں عباس شاہ
حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی

میر مومن کے قصیدے سے یہ شعر اخذ کیا گیا ہے۔ یہ محمد قطب شاہ کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ اس میں میر مومن نے حیدرآباد کو صفاہان نوی سے تشبیہ دی ہے۔ دکن قطب شاہی دور ہی میں نہیں بلکہ اس سے پہلے بہمنی دور میں بھی ایرانی علماء شعراء اور ادیبوں کا ملجا و ماویٰ رہا ہے آذری اسفرائنی میر فضل اللہ انجو خواجہ عماد الدین محمود گاواں اور ان حضرات کی وجہ سے سینکڑوں علماء، ادیب، شاعر اور مدبر گلبرگہ آئے۔ بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں ہر جگہ زیادہ تر ایرانی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور ان کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا جو لوگ ایران سے آکر یہاں بڑے بڑے منصب اور عہدے پاتے ان کی وجہ سے ایرانیوں کی آمد میں اور اضافہ ہوتا چنانچہ ملکی اور غیر ملکی کی تفریق بھی اسی وقت سے عمل میں آئی اور اس کے لئے غریب اور دکنی کی اصلاح وضع ہوئی۔

میں یہاں ان حضرات کا ذکر نہیں کروں گا اس لئے کہ ان کے کارنامے تاریخوں کے اوراق میں محفوظ ہیں ۔میں یہاں صرف ان چند شعراء کا ذکر کروں گا جنھیں تاریخ میں نظر انداز کر دیا گیا اور قدیم تذکروں میں محض شاعری کی وجہ سے انھیں جگہ ملی ۔میر مومن پر تو ڈاکٹر زور مرحوم نے ایک مستقل کتاب لکھدی مرزا محمد امین شہرستانی کا ذکر متعدد جگہ آچکا ہے۔ شاہ طاہر وحید نے بھی تاریخ کے اوراق میں جگہ پائی ہے۔ شیخ محمد ابن خاتون آسمان شہرت کا ایک روشن ستارہ ہے ابو طالب کلیم پر ڈاکٹر شریف النساء نے کتاب لکھدی ہے ۔یہ ایسے شعراء ہیں جن کے نام اور کام سے ہم سب واقف ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں میر تقی الدین محمد ایران سے آے اور منصب وکالت پر فائز ہوئے لیکن محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں معزول کئے گئے اور حج کے ارادے سے نکلے لیکن راستہ میں انتقال کیا۔ وجہی کے استاد روح الامین محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں آئے اور شہرت پائی نئے پل کے قریب جہاں اب وکٹوریہ زنانہ ہاسپیٹل ہے امین باغ تھا۔ اور یہ انھیں کے نام سے موسوم تھا۔ محمد قطب شاہ سے ان کی ان بن ہوگئی اور وہ یہاں سے بیجاپور چلے گئے۔ ان کی وجہ سے شعراء کی ایک کثیر تعداد گولکنڈہ میں موجود تھی۔ ان میں مقامی شعراء بھی تھے ۔اور ایران سے آنے والے بھی ملا عشرتی گیلانی کا نام ان کے متوسلین میں شامل ہے جو اصفہان سے آئے تھے ۔قباد بیگ کو بھی شاہ عباس ماضی والئی ایران کے زمرہ ملازمین سے نکل کر محمد قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آئے اور یہیں انتقال کیا۔

عبداللہ قطب شاہ کے طویل عہد سلطنت میں نہ صرف شعراء آئے بلکہ طبیب،

مورخ، مدبر سبھی کے نام ملتے ہیں۔ نظام الدین صاعدی شیرازی اور علی طیفور بسطامی کی تاریخیں تو ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ایک نام الفتی ولد حسینی ساوجی کا ہے جس نے عبداللہ قطب شاہ کے حکم کی تعمیل میں رسالہ عروض و قافیہ لکھا۔ طاہر نصرآبادی کا بیان ہے کہ وہ حیدرآباد سے اصفہان واپس گیا اور وہیں وفات پائی وہ اپنے آپ کو انوری سے بہتر سمجھتا تھا۔

میر ابوتراب فطرت مشہدی میر رضی دانش کے والد تھے۔ اور ایران سے حیدرآباد آکر عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے متوسل ہوئے اور سنہ ۱۰۶۰ھ میں انتقال کیا۔ انھیں میر مومن کے دائرہ میں دفن کیا گیا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکروں سرو آزاد اور خزانہ عامرہ میں لکھا ہے کہ میر مومن کا دائرہ ایرانیوں کا قبرستان ہے۔ کئی ایرانی حضرات یہاں مدفون ہیں چنانچہ فطرت مشہدی کا مزار بھی یہیں ہے اور لوح مزار پر یہ رباعی کندہ ہے ؎

فطرت بتو روزگار بیرنگی کرد
بنواخت بمہر و خار زنج آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمی دروی گنجد
اکنوں ز تو دو نفس تنگی کرد

جب ان کے لڑکے میر رضی دانش یہاں آئے تو والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی رباعی لوح مزار پر کندہ کرائی۔ رباعی یہ ہے ؎

دانش مکن اعتماد بر عمر دراز   کاید بزماں کم بسر عمر دراز
گیرم کہ چو عیسیٰ بفلک برشدہ   آید بچہ کار بے پدر عمر دراز

آزاد سنہ ۱۱۶۵ھ میں پہلی دفعہ جب حیدرآباد آئے تو دیکھا کہ میر کا دائرہ ایک

دیوانہ ہے۔ دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہیں۔ لیکن جب تیس سال بعد ۱۱۹۵ھ حیدرآباد آئے اور زیارت کے لئے میر کے دائرہ پر پہونچے تو دیکھا کہ ابوتراب نظرت کی قبر کا کوئی نشان باقی نہیں رہا اور اکثر قبریں زمین کے برابر ہو کر اس پر مکانات بن گئے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ۱۱۸۵ھ میں جب نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے اورنگ آباد سے اپنا پایہ تخت حیدرآباد منتقل کیا تو آبادی بہت پھیل گئی اور میر کا دائرہ سکڑتا چلا گیا جو دائرہ موتی کی خواب گاہ تھا زندوں کی آرام گاہ بن گیا۔

سالک یزدی شیراز میں مقیم تھے وہ فقیرانہ زندگی گذارتے تھے شیراز سے اصفہان سے عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں آئے یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد بیجاپور گئے۔ ہماری تحقیق میں یہ پہلے ایرانی شاعر ہیں جن کی دکھنی زبان میں غزلیں ملتی ہیں۔ ان کے معاصر محمد دیدار فانی شیرازی ہیں جنھوں نے دکھنی میں غزلیں کہیں ان کی یہ غزلیں ہم "سب رس" میں شائع کر چکے ہیں۔ سالک یزدی حکیم رکنا (رکن الدین) مسیح کاشی کے شاگرد تھے اور شاگردی پر ان کو بجا طور پر ناز تھا وہ کہتے ہیں۔

تخلص ز مسیح وقت دارم سالک مجذوب رخو شم روز قیامت جاں بابی
القاب برگردد۔

اسد مروی کا تخلص عریاں تھا وہ جب حیدرآباد آیا تو علامہ محمد ابن خاتون نے اس کی یہاں تک دستگیری کی کہ اس کو اپنا وصی بنایا اور علامہ کے انتقال کے بعد وصیت کے مطابق اس نے علامہ کا مال و اسباب ایران میں اس کے ورثاء کو پہونچایا مگر علامہ محمد ابن خاتون کے ورثا نے عریاں کا مال و اسباب بھی چھین لیا اور اس کو اسم بامسمیٰ کر دیا۔

ملا فرح اللہ شوشتری کا تعلق سلاطین سلاجقہ سے ہے وہ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے تذکرہ سلافتہ العصر (شعرائے عرب کا تذکرہ) اور تذکرہ نصرآبادی فارسی میں ان کا ذکر موجود ہے ۔ مرزا محمد علی صاحب ملا شوشتری کے متعلق کہتے ہیں ۔

ہمیں زخاک فرح کامراں رشد صائب　　　کہ فیض ہم بہ ظہوری برایں

خطاب رسید ملا شوشتری

عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں بہت زیادہ عزت و توقیر کے حامل تھے ان کا ایک شعر تقریباً تمام تذکرہ نگار نقل کرتے ہیں کہتے ہیں ۔

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند　　　ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

ایک شاعر مرزا محمد تقی مازندرانی ایران کے امراء میں سے تھے جو حیدرآباد آکر عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں بلند مرتبہ پر فائز ہوئے ۔ کتب خانوں میں بعض ایسے دواوین اور کلیات ہیں جن کے مصنفین سے ہم واقف نہیں اور جن کے ناموں سے ہم واقف ہیں ان کے کلام تک رسائی نہیں ۔ ملا شوشتری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ سے زاید شعر کہے ہوں گے ہم تک سو بھی نہ پہونچ سکے مرزا محمد علی صائب نے بھی ایک لاکھ سے زاید شعر کہے اور ... تاما ئن شفیق اورنگ آبادی نے اس وقت تین ہزار کے صرفہ سے ان ایک لاکھ شعر کی نقل حاصل کر کے کلیات مرتب کیا ۔ یہ کلیات آج بھی محفوظ ہے ہم ایسے بہترے شعراء سے واقف نہیں جن کے نام صرف تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں مورخین نے ان کی شاعری کا ذکر نہیں کیا اور نہ تذکرہ نگاروں نے انکے سیاسی کارناموں کو ظاہر کیا ۔ ممکن ہے آئندہ کے محققین اس طرف توجہ کریں اور حیدرآباد کی علم دوستی شعر و ادب کی سرپرستی اور شعراء نوازی کا مزید ثبوت فراہم کریں ۔

جمال کسٹرپوری

قطب شاہی دور میں تلگو کی سرپرستی

ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کی کس طرح دلداری کی ہے اور کس طرح آپس میں میل ملاپ سے ایک مشترکہ تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالی ہے۔ انہوں نے کبھی بھی اس ملک کے باشندوں کو نفرت وحقارت کی نظروں سے نہیں دیکھا بلکہ ہمیشہ ان کو برابری کا درجہ دیا اور آگے بڑھایا مسلمان بادشاہوں کی یہ پالیسی صرف رواداری پر محمول نہیں ہے بلکہ اس میں بہت بڑی سیاسی مصلحت بھی پوشیدہ ہے۔ اسی مصلحت اور یگانگت کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں ہم آج زبان، آرٹ، تعمیرات، رہن، سہن، طور طریقوں اور رسم ورواج غرضکہ ہر چیز میں قومی اتحاد اور یک رنگی کے نقوش نمایاں طور پر دیکھتے ہیں اس معاشرتی اتحاد میں مسلمان بادشاہوں کے علاوہ ہندو مسلم نفراد اور مفکروں کا بھی دخل رہا ہے۔ ان مسلمان بادشاہوں میں جنھوں نے ہندستان

میں حکومت کی ہے قطب شاہی د ۱۵۱۲ء تا ۱۶۸۷ء دور نہ صرف دکن کے لئے بلکہ سارے بھارت کے لئے قومی یکجہتی جذباتی ہم آہنگی اور مشترکہ قومیت کا ایک اعلیٰ اور اَن مٹ نمونہ پیش کرتا ہے۔ زمانہ حال کے ایک ممتاز مورخ ڈاکٹر وینکٹ رامیا نے قطب شاہی بادشاہوں کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

"ان تمام مسلمان خاندانوں میں جنھوں نے ہندستان میں راج کیا ہے۔ قطب شاہی بادشاہ سب سے زیادہ روشن خیال گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی سلطنت میں ہندوؤں کو جو آزادی دے رکھی تھی اس کی مثال دوسری مسلمان سلطنتوں میں مشکل سے ملتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قطب شاہی حکمرانوں نے ہندوؤں کو ملک کی اہم خدمات پر فائز کرنے میں کبھی مذہبی بنیاد پر تفریق روا نہیں رکھی۔ ہندو بھی سلطنت کی بڑی سے بڑی خدمت پر اسی طرح فائز تھے جس طرح کہ مسلمان تھے قطب شاہی راج کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ راعی اور رعایا میں بڑی یگانگت تھی۔ قطب شاہوں نے کبھی اپنی رعایا پر اپنی برتری نہیں جتائی جس سے ان کا فاتح ہونا ظاہر ہو یوں تو وہ مسلمان تھے مگر اپنے طور طریق میں اپنی رعایا کی طرح آندھرائی ہو گئے تھے۔"

قطب شاہی سلاطین شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ انھیں اسلامی صوفیانہ فلسفہ حیات سے خاص دلچسپی تھی۔ اسلامی صوفیانہ خیالات اور ہندو ادویتہ نظریہ ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ لازمی طور پر اس کا اثر ہندو مسلم مشترکہ روایات طور طریق اور تہذیب و تمدن پر بہت گہرا پڑا۔ حکومت قطب شاہی غیر مذہبی روایات یعنی سکولرزم پر قائم کی گئی۔ اس خاندان کے تمام فرماں روا

تنگ نظری اور تعصب سے بالکل پاک تھے ۔ تمام مذاہب کے لوگوں میں مذہبی رواداری قائم تھی، بلند حوصلہ اور روشن خیال ہونے کی وجہ مقامی رنگ میں اس طرح رنگے گئے کہ ہندوؤں کے ذہن میں کبھی بھی اس بات کا تصور تک نہ آیا کہ ان کے حاکم بدیسی یا غیر مذہبی تھے ۔

اس عہد کے حکمران، فارسی اور اردو ادب کے علاوہ تلنگی زبان کے بھی محسن تھے ۔ درباری زبان فارسی ہونے کے باوجود تلگو میں بہت سے اہم دستاویز، فرمان اسناد اور نشان وغیرہ ترجمے کئے گئے۔ تلگو علاقوں میں تلگو زبان کے ذریعے ہی حکومتی کاروبار جاری تھا۔ خود حکمران تلگو سے واقف تھے۔ ابراہیم قطب شاہ کو اپنے بھائی جمشید قطب شاہ کے عہد حکومت میں سات سال کے لئے وجے نگر میں گزارنا پڑا۔ وہاں کا راجہ اس کے ساتھ خلوص سے پیش آیا ۔ یہاں اس نے ہندو ریاست کی تہذیب و تمدن کے علاوہ تلگو زبان کا بھرپور مطالعہ کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب وہ حاکم بنا تو تلگو شعرا کی بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ اس کے علاوہ اس نے تلگو زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ اس کا کام ابھی تک دستیاب نہ ہو سکا۔

بجا طور پر قطب شاہی دور کو دکنی زبان کا سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے لیکن اس عہد میں فارسی، اردو اور تلگو زبان کو جو ترقی ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ اردو اور فارسی میں جہاں وجہی، احمد، خیالی، غواصی، ابن نشاطی، طبعی، امینؔ، جنیدی، غلام علی، سیوک اور لطیف وغیرہ اس عہد کے باکمال شاعر گزرے ہیں۔ وہاں تلگو زبان میں حسب ذیل شعرا گزرے ہیں ۔

تینالی راماکرشنوڈو، سنسکرا کوی، ویلاگا پوڈی کا وین گنا، انگا دالیا دیا،

ہلاکت میں ڈال کر گھوڑے پر ندی کو پار کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ابراہیم قطب شاہ نے موسیٰ ندی پر وہ پل تعمیر کروایا جو موسیٰ ندی کا پہلا پل تھا اور آج بھی پرانا پل کے نام سے مشہور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک یادگار کارنامہ شہر حیدرآباد کا قیام ہے۔ محمد قلی کی بلند خیالی ایک وسیع اور متمدن شہر کی طلبگار تھی۔ اس زمانے میں قلعہ گولکنڈہ کے اطراف کی آبادی بے ہنگم طریقے پر پھیلتی جا رہی تھی۔ آبادی کی ضروریات کے لئے یہ مختصر شہر ناکافی تھا۔ چنانچہ محمد قلی نے شہر گولکنڈہ کے قریب ایک وسیع اور منصوبہ بند شہر کی تعمیر کا بیڑہ اٹھایا اور اس طرح ۱۵۹۰ء میں محمد قلی کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ سال بعد شہر حیدرآباد کی تاسیس عمل میں آئی۔ چارمینار شہر کا مرکزی مقام قرار پایا اس کے اطراف چاروں جانب سیدھی سڑکیں بنائی گئیں اور قرب و جوار میں متعدد شاہی محل تعمیر کروائے گئے۔ چارمینار کی بلند و بالا عمارت ڈیڑھ دو سال میں تیار ہوئی۔ شہر حیدرآباد اور شہروں کی طرح خود ساختہ نہیں ہے بلکہ اس کی تعمیر میں خاص ضابطہ اور سلیقہ ملحوظ تھا۔ محمد قلی نے شہر کے قیام کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں موجود ہوں، چنانچہ اس شہر میں بے شمار بازار، خانقاہیں، مدرسے مسجدیں لنگر خانے، مہمان خانے کاروان سرائیں وغیرہ بنائی گئیں۔ ان عمارتوں کی تعداد کوئی بارہ ہزار بتائی جاتی ہے۔ محلات کو چھوڑ کر محمد قلی کے عہد کی اکثر عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ محمد قلی کی بنائی ہوئی عمارتوں میں داد محل، خداداد محل سجن محل، اعلیٰ محل، ندی محل، حیات گھاٹ اور کوہ طور کا محل کے نام قابل ذکر ہیں۔

شہر حیدرآباد کو پھیلانے اور خوبصورت بنانے میں سلاطین گولکنڈہ کے

واسی راجو راپتا، جن دالدری جی کیا، کانو کولا، نوانما راجو، بیجا راجو، وجکا ٹما نادھوڈو، موتا، ایا لا راجو راما بھدرودڈو۔ اڈنکی گنگا دھر وڈلو، پونا کنٹی، تاگنا، چیدبو واڈا ملانا، سارنگو تما یا، کندکوری رودراکوی، پنگلی سورنا، راماراجو بھوشنا ڈو، مری گنٹی سنگا راپاریلو وغیرہ

ان میں آدنکی گنگا دھر وڈو نے اپنی تصنیف "تپتی سمورنو پاکھانم کو ابراہیم قطب شاہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس وقت کے بہت سے ہندو شعرا نے اپنی نظموں میں اپنے دیوتاؤں سے ابراہیم بادشاہ کی سلامتی کی دعائیں مانگی ہیں گنگا دھر اپنی ایک نظم میں اس طرح دعا گو ہے۔

"اے وشنو" ــــ شہنشاہوں کے شہنشاہ ملک ابرام کو اپنی حفاظت میں لے لے"

"وہ (ابرام) جو امن کا پجاری ہے

وہ جو دیگر بادشاہوں کے لئے جگمگاتا ہیرا ہے"

اے کرشنا ــ تو جو برستے بادل کی طرح ہے۔

اے لکچھمی ــ تو جو دنیا کو روشنی عطا کرتی ہے۔

اے تلسی ــ تو جو وشنو کے سینہ پر ہیرے کی چمک پیدا کرتی ہے۔

اے اندرا ــ تو جو رنگ دیو پیدا کرتی ہے

اے مالک ــ بادل کی گرج میں فسری کی آواز پیدا کرنے والے بادل کے پانی سے

دھرتی کی پیاس بجھانے والے میری دعا سن لے

ابرام کو اپنی رحمت سے مالا مال کردے"۔

ہندوؤں کا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ دنیا میں صرف چھے عظیم شہنشاہ گزرے ہیں۔

جنھوں نے دنیا پر حکومت کی ہے۔ ایک نظم میں ملک ابراہیم بادشاہ کی ہر دلعزیزی کی اس طرح تعریف کی گئی ہے۔

"وہ ملک ابراہیم ساتواں شہنشاہ ہے جس کی شہرت سات بلند پہاڑوں سے بھی بلندی حاصل کر چکی ہے جس کا نام سات سمندر پار کر چکا ہے جس کے نام کی مالا جپنے والے سات جزیروں میں گشت کر رہے ہیں جس کی نیک نامی کی خوشبو وہ دنیاؤں میں پھیل چکی ہے۔"

(چاٹو پدیا متی منجری صفحہ ۴۵)

تلگو ادب میں کئی جگہ ابراہیم قطب شاہ کو "ملکی بھرا موڈو" اور "بھرام شاہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ پُرانوں کے مطابق "رام" نام کے کئی مذہبی رہنما گزرے ہیں۔ ایک جگہ ہندو شاعر ابراہیم (نام کے آخر میں راموڈو بطور لاحقہ استعمال ہوا ہے) کا موازنہ ان راموں سے اس طرح کرتا ہے۔

"پرانوں میں کئی راموں کا ذکر آیا ہے لیکن کیا اس رام بھرا موڈو (یعنے ابراہیم) کے مقابلے میں کسی دوسرے رام کی وقعت واہمیت زیادہ ثابت ہو سکتی ہے۔

ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں تلگو زبان میں مشاعرے (کوی سمیلن) بھی منعقد کئے جاتے تھے۔ اس نے ادبا اور شعرا کی حوصلہ افزائی کس طرح کی اور ان کو انعام واکرام سے کس طرح مالا مال کیا اس کا ذکر تلگو زبان کا ایک شاعر اس طرح کرتا ہے۔

"اس کی (ابراہیم) ایک مسکراہٹ۔

ایک ہزار کے انعام کا فرمان تصور کی جاتی تھی۔
اس کا کہنا "آو" دس ہزار کے انعام کا حکم سمجھی جاتی تھی۔
اس کا حکم "آو بیٹھو"
ایک لاکھ کی بخشش کے برابر ہوتا تھا۔
اس کا خراج تحسین "شاباش"
شاعر کے لئے جاگیر کے اجرار کا حکم نامہ تھا۔"

(چاٹو پدیا منی منجری صفحہ ۴۳)

کہا جاتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کا وزیر آہوبالم ین نرا سمہا سوامی مندر کا بت چھین لایا جس کی وجہ ابراہیم بادشاہ اس کی اس نازیبا حرکت پر بہت غمگین ہوا۔ یہی غم اس کی بیماری اور موت (۱۵۸۰) کا سبب بنا۔ اس وقت تلگو بھاشا کے شاعر نے برہما (موت کے خدا) کو اس طرح برا بھلا کہا ہے۔

"کیا تجھ کو اور کوئی بادشاہ نہیں ملا۔
دنیا میں بہت سے حاکم ہیں جو شر پھیلاتے ہیں۔
لوگوں پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔
کاش ان میں سے کسی کی جان لے لیتا
لیکن تو نے ایسے شہنشاہ کی جان لی ہے جو امن کا پجاری تھا۔
انسانیت کا متوالا لوگوں سے پیار کرتا تھا۔
کیا تو پھر اس قسم کے عظیم انسان کی تخلیق کر سکتا ہے؟
کیا یہ بات تیرے دست قدرت میں ہے

(چاٹو پدیا منی منجری صفحہ ۴۶)

اسی عہد کا ایک اور درباری شاعر کند کوری رودرا گزرا ہے جس نے "نیر نکوشو پا کھیانم" "سوگریوا دیجیا" "سوارا ویبیکا" (سنسکرت میں کام شاستر) "سارا ساجنیا مانور نیجنامو" "بالا وادری شا تاکمو" "گودا لا جنیا" جانار دھنا ستو" تراشتکمو" اور نثر ونگا راجار دھنا شتکمو" جیسی نادر کتابیں تصنیف کی ہیں اس کو جینتلا پالم نامی گاؤں بطور جاگیر عطا کیا گیا۔

اسی طرح ابراہیم قطب شاہ سے خلعت و انعام حاصل کیا ہو ایک اور تلگو شاعر پاسوری ماریگنٹی سنگارا چاریلو ہے۔ اس نے "دشا رادھا راجہ نندانا چارترا" نامی مشہور و مقبول کتاب میں رامائن کی کہانی کا منظوم ترجمہ پیش کیا گیا ہے

اس خاندان کے بادشاہوں کے سوا دیگر امرائے سلطنت بھی ہندو شعراء وادیبوں کی سرپرستی میں اپنے بادشاہوں کی پیروی کر رہے تھے۔ تیلا گنا امین خاں کی رعایا پروری سے خوش ہو کر اپنی تصنیف "یایاتی چارترامو" کو اس کے نام موسوم کیا ہے۔ تلگو زبان کا یہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے خالص تلگو زبان میں شاعری کی ہے۔ خالص تلگو زبان کی داغ بیل ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں پڑی۔ تیلا گنا کو اس کا موجد قرار دیا گیا ہے۔

وہ ابراہیم قطب شاہ خالص تلگو پر زیادہ اہمیت دیتا رہا بہ نسبت ایسی تلگو زبان کے جس میں سنسکرت کے دقیق الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ ملاحظہ کیجئے صفحہ (۲۸۱) جدید ہندستان کی زبانیں اور ادبیات (انگریزی کتاب) از سونیتی کمار چیٹر جی

اسی دور کے شعرا میں ملاریڈی ایک اہم شاعر ہے۔ اس نے "شاتا چکرا ودتی" "شوادھر موتارامو" "پدما پرانمو" نامی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس کی شاعری سادگی دیرکاری اور منظر کشی کے لئے مشہور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۲ء تا ۱۶۱۱ء) کے زمانے میں تلگو کے جو شعرا گزرے ہیں ان میں سے ایک سارنگو تما یا ہے۔ وہ گولکنڈہ کا کرنم تھا۔ (زمینات کا لگان وصول کرنے والا) اس کو بادشاہ وقت بہت چاہتا تھا۔ اس نے "ویجنتی ویلا سا" نامی کتاب لکھ کر تلگو ادب میں ناموری حاصل کی۔

اس خاندان کے آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۸۷ء) کا ایک عہدیدار کنچرلہ گوپنا مشہور شاعر گزرا ہے اس کو رام سے نہ صرف یہ کہ عقیدت تھی بلکہ حد درجہ عشق تھا یہی وجہ ہے کہ اس کو "راما داسو" کے نام سے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے "دہ سارا دھی شا نا کا مو" نامی کتاب تصنیف کی ہے جو آج بھی تلگو دنیا میں بہت مقبول ہے۔ اسی طرح "راما داسو کیرتانا لو" بھی اس کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہندو مذہبی روایات اور عقائد سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج بھی ہندو لوگ بڑی دلچسپی اور بھگتی سے پڑھتے ہیں۔

۱۶۱۶ء میں گان نا دھا نامی شاعر گزرا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک درباری شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس کے علاوہ چھترا یا نامی شاعر نے عبداللہ قطب شاہ ۱۶۲۶ء کے درباری شاعر تلاسی مورتی سے بازی لگائی اور چالیس دن میں (۱۵۰۰) اشعار لکھکر حاکم وقت سے انعام و اکرام حاصل کیا۔

اس عہد میں نہ صرف ہندو شعراء وادبا کی سرپرستی کی گئی بلکہ بہت سے ہندوؤں کو حکومت کی جانب سے بڑی بڑی جائدادیں بھی دی گئیں۔ راگھا راؤ نامی ایک ہندو قلی قطب شاہ کا ملازم رہا۔ اس کی وفا شعاری سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو ملی مڈگو نامی مقام کا حکم بنا دیا۔ اسی طرح جگ پتی راؤ کو ندیال کا حاکم مقرر کیا۔ سہر راؤ کو قاسم گوٹا نامی گاؤں کا افسر بنایا۔ ساباجی راؤ کو سر نوبت

کا عہدہ عطا کیا۔ راماچندر کو بھیا پورم کی جاگیر عطا ہوئی۔

ابوالحسن قطب شاہ کے پاس اکنا اور مادنا نامی دو ہندو وزراء تھے یہ دونوں وزراء بہت ہی خدمت گزار تھے۔ انہوں نے مال گزاری زمینات کے محصولات کی وصولیابی اور زمینوں کی پیمائش وغیرہ کے بہت سے اہم کام سرانجام دیئے ہیں۔ رنگیر لہ گوپنا بھدراوتی کا تحصیلدار تھا۔ سارنگو تما یا محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں اراضی کا افسر تھا۔

ان سلاطین نے مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں کے مندروں کی دیکھ بھال کے لئے جاگیریں عطا کیں۔ اس کی زندہ مثال آج بھی دیکھنے میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ بھدرادری راما نامی مندر کو سال میں ایک دفعہ سری رامانومی کے دن حیدرآباد کے نواب کی جانب سے تحفے، انعام وغیرہ روانہ کئے جاتے ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ کے دور میں مقامی رسم ورواج کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ لباس میں بھی کافی تبدیلی آگئی سیاب دہوا اور مقامی لوگوں کے طور طریقوں کا خیال کرتے ہوئے باریک ململ کے جھبے زیب تن کئے جانے لگے۔ ایرانی لباس کو ترک کردیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنے بہت سے اشعار میں "دکن" کی سرزمین کی تعریف کی ہے۔ وہ دکن "اور تلنگانہ" کی سرزمین کو اپنا وطن قرار دیا تلگو تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ طوطی نامہ شو کا سپتاتی' نامی سنسکرت کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ کا کام بھی قطب شاہی دور کی یاد دلاتا ہے۔

اکلکے عہد میں ہر سال چودہ قومی عیدیں اور تہوار منائے جاتے تھے۔

ان میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عیدیں بھی شامل ہیں۔ ہندوؤں کی عیدوں اور تہواروں میں بادشاہ وقت خود دلچسپی لیتا تھا۔ نوروز' ہولی' بے ندا کا (بہار کے موسم کا ایک تہوار) پر قلی قطب شاہ نے کئی نظمیں اور گیت لکھے ہیں۔ جس طرح مسلمان ہندوؤں کے تہواروں اور میلوں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کی عیدوں میں خلوص سے حصہ لیتے تھے آج "محرم" سے متعلقہ جو بہت ساری رسمیں ہم میں پائی جاتی ہیں وہ ہندوؤں سے حاصل کی گئی ہیں اس قسم کی رسمیں اسلامی دنیا میں اس سے کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتیں۔ جنوبی ہند میں "محرم" کے تہوار کا رواج سب سے پہلے قلی قطب شاہ کے زمانے سے شروع ہوا۔

ڈاکٹر بی راما راجو ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم بادشاہ کی ہندو بیوی سے قلی قطب شاہ پیدا ہوا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہت سی رسوم ورواجوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بھاگیا متی سے محبت کر کے اسی کے نام پہ بھاگیا نگر قائم کیا۔ یہی بھاگیا نگر آج شہر حیدرآباد کے حسین روپ میں ریاست آندھرا پردیش کا دارالخلافہ بنایا گیا جو قطب شاہی دور کی شاندار قومی یکجہتی کی روایات کی یاد دلا رہا ہے

یہ وہی روایات ہیں جن کی بناء پر آج بھی بہت سے ہندو "محرم" کے دنوں میں تابوتوں کو اپنے سروں پر لئے پھرتے ہیں، عاشور خانوں کے سامنے الاؤ کھدواتے ہیں۔ آگ بھرتے ہیں، اور اس پر ننگے پیر دوڑ کر آگ سرد کر دیتے ہیں۔ جانوروں کی نقل کرتے ہیں' یہ ایک عام رواج ہے کہ ہندو "دیپاولی" کے دن پٹاخے جلاتے ہیں' اس رواج کو شب برات کے موقع پر جاری کیا گیا اسی

طرح شادی بیاہ کے موقع پر آج مسلمان گھرانوں میں جو بہت ساری رسمیں دیکھی جاتی ہیں یہ اس عہد کی یاد دلاتی ہیں۔ نکاح سے پہلے جب دلہا دلہن گھر جاتا ہے تو اس کے سالے اور سالیاں گھر کے اندر داخل ہونے سے روکتے ہیں اور خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد "جلوہ" کی رسم کے موقع پر دولہا دلہن کو آئینہ میں دیکھتا ہے۔ دونوں کے سروں پر چاول چھڑکے جاتے ہیں غرض کہ اسی طرح کی بہت سی ہندو رسمیں مسلمانوں کی شادی بیاہ میں داخل ہو کر سماجی روایات بن گئی ہیں۔

قطب شاہی دور میں عموماً ہندوؤں کی اور خصوصاً برہمن عالموں کی بڑی قدر ہوئی۔ "کوچی پوڈی" مقام ان لوگوں کے حوالے کر دیا گیا جو آرٹ اور ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس طرح کوچی پوڈی ناٹک اور سنگیت وجود میں آئے جن کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔

تنگنا نے اپنی کتاب "دیا یاتی چرترا" میں سردار امین خاں اور ان کی بیوی ابڑی بی کی بڑی تعریف کی ہے۔ دونوں نے غریبوں اور بیواؤں کی بڑی مدد کی ہے۔ کئی برہمن لڑکیوں کی شادی کروائی ہے۔ یہ دونوں غریب بچوں کی دیکھ بھال خود کرتے تھے۔ اپنے نام پر امین پور مونامی گاؤں آباد کیا جس میں ایک بڑا تالاب کھدوایا اور پھولوں کے باغات بھی لگوائے گئے۔

رعایا اپنے ان حاکموں سے بہت خوش تھی۔ یہی سبب ہے کہ عوام انھیں بڑا مالک 'بڑے حاکم تاناشاہ' (اچھے حاکم) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی کدورت نہ تھی۔ یہ دونوں

اقوام حکومت کی نظروں میں اسی طرح تھے جس طرح ایک گاڑی کے لئے دو پہیئے ہوتے ہیں۔ اسی میل ملاپ کا نتیجہ ہے کہ مذہبی اور سماجی رسومات کے ساتھ، ساتھ آج بھی تلگو زبان میں اردو کے کئی الفاظ رس بس گئے ہیں دکھنی اور اردو میں تلگو مراہٹی اور کنڑ کے کئی الفاظ موجود ہیں۔

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو آج آندھرا پردیش میں جس مشترکہ تہذیب و تمدن کا نقشہ نظر آتا ہے اس کو قطب شاہی ورثہ سمجھنا چاہئے۔ قطب شاہیوں کی علم دوستی شعر و سخن کی قدردانی، عالموں کی سرپرستی، رعایا پروری، دکن کی سرزمین سے نظری لگاؤ، وسعت نظری ہندوؤں کی دلداری تہذیبی رسموں میں دلچسپی ہندو مسلم غیرجانب داری اور انصاف پسندی اور اس قسم کے دیگر صفات آج بھی ہمارے لئے "قومی یکجہتی" کی تحریک میں ایک مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔

پروفیسر عبد المجید صدیقی

گولکنڈہ کا تمدن

قطب شاہ تمدن کے بہت بڑے شمع بردار تھے۔ تلنگانے کی سرزمین میں جہاں ان لوگوں نے راج کیا ایک ایسا پاکیزہ تمدن پیدا کیا تھا جس کے نقوش اب تک موجود ہیں۔ اس تمدن میں جس کو قطب شاہی تمدن کہنا چاہیے۔ مختلف عناصر کا امتزاج تھا۔ پہلے تو یہ لوگ ایران و ترکستان سے بھی جو ان کا جنم بھوم تھا کچھ تمدنی عناصر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان سے آیا تھا ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ یہ سمجھنا کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ترکستانی سیاست اور معاشرت کے کچھ نہ کچھ تاثرات ضرور ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطب شاہوں کا تمدنی سرمایہ زیادہ تر گلبرگہ اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے ماخوذ تھا کیونکہ قطب شاہ اس سلطنت بہمنی کے براہ راست حلقہ بگوش خوشہ چیں تھے۔ جس نے چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں دکن کی پر زور سیاسی اور معاشرتی رہنمائی کی تھی۔ دکنی ملت کا صحیح تخیل اور اس کی انوکھی سیاست و معاشرت جسے دکن کے مخصوص جغرافیہ کا عکس سمجھنا

علاوہ یہاں کے امراء نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ جگہ جگہ خوشنما عمارتیں بنوائی گئیں اور باغات لگوائے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں میں حیدرآباد عہد وسطیٰ کا ایک بارونق شہر بن گیا۔

تمدنی اور سماجی نقطۂ نظر سے محمد قلی کا عہد حکومت دکن کی تاریخ میں ایک یادگار دور سمجھا جاتا ہے۔ محمد قلی نے اس بات کی خاص طور پر کوشش کی کہ اس مملکت میں بسنے والے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان یکانگت، میل جول اور بھائی چارگی کے جذبات نشو و نما پائیں۔ محمد قلی کی ماں بھاگیہ رتی۔ تلنگانہ کی ایک خاتون تھی کوئی تعجب نہیں کہ محمد قلی کے مزاج کی تشکیل میں اس کی ماں کا اثر بھی کارفرما ہو۔ اس نے اس امر کی بھی کوشش کی کہ مملکت میں بسنے والے سارے طبقات کو مذہبی آزادی حاصل رہے۔ دیوالی، بسنت اور ہولی کے تہوار قومی تقریبوں کے طور پر شاہی محل میں بھی منائے جاتے تھے یہ روایت تلنگانہ اور حیدرآباد کے عوام میں آج بھی رائج ہے۔

محمد قلی نے اپنے تیس سالہ عہد حکومت میں قدیم اردو یا دکنی کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ وہ اوج کمال پر پہنچ گئی اور ایک شائستہ ادبی زبان کی منزل میں داخل ہو گئی۔ خود بادشاہ ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کا ایک ضخیم کلیات موجود ہے جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے، رباعیاں وغیرہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی گئی ہے اب تک جن شعرا کا کلام مکمل دیوان کی شکل میں مل سکا ہے ان میں محمد قلی اردو کا صاحب دیوان شاعر ہے۔ محمد قلی سے قبل اگرچہ کہ متعدد اساتذہ سخن مثلاً فیروز، سید محمود، ملا خیالی وغیرہ گذر چکے ہیں لیکن کسی شاعر کا مکمل دیوان چھوڑ دستیاب نہیں ہوا۔

چاہئے۔ بہمنی سلطنت کی پیداوار تھی۔ اسی سلطنت نے دکن کے لئے بہترین نظام حکومت بنایا، معاشرت کے زرین اصول سکھائے اور نئی وضع قطع پیدا کی۔ اہل دکن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا اچھا سامان جمع کیا جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دکن کے تمام طول و عرض میں جہاں اس سلطنت کا پرچم لہراتا تھا بہمنیوں کے گہرے نقوش موجود تھے اور یہ آج بھی ہیں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اس ماحول میں جو جدید نظام حکومت و معاشرت قائم ہوتا وہ کبھی ان تاثرات سے کیسے خالی ہو سکتا ہے۔ سلطان قلی نے برسوں بہمنی فضا میں سانس لی تھی اور جب وہ تلنگانے کا صوبہ دار ہوا تو اس کے سامنے سوائے بہمنی آئین کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی آئین کی اس نے پیروی کی یہ اور اس کے تمام جانشین بہمنی معاشرت میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکے اس طریقے سے تلنگانے میں جو قطب شاہی تمدن اُجاگر ہوا اس کی بنیاد اور سراپا سب بہمنی تھا۔ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت پر جو کچھ حصر نہیں ہے بلکہ اس کی تمام ہمعصر سلطنتیں جو بہمنی سلطنت کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھیں وہ سب بہمنی معاشرت اور سیاست کی خوشہ چین تھیں ان کا نظام حکومت بہمنی تھا۔ اور جس قدر معاشرت تھی اس پر بہمنی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس سے اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں نے جو اپنی راجدھانیاں قائم کی تھیں ان میں بھی بہمنی عناصر پائے جاتے تھے اور آج بھی دکن اسی تمدن کا رہین منت ہے

لیکن یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہئے کہ قطب شاہوں نے اپنے تمدن کو تلنگانے کے نئے ماحول میں مقامی عناصر کے ساتھ کچھ اس طرح مرکب کیا تھا کہ وہ دکھنی پیداوار معلوم ہوتی تھی۔ قطب شاہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ ان کی سلطنت تلنگانے میں ٹھیٹ ترکستانی اور بہمنی نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی ایسے

جذب ہونے چاہئیں کہ اس میں تلنگانے کا پورا عکس دکھائی دے۔ یہ قطب شاہی سلطنت کا طرۂ امتیاز رہے کہ اس نے اپنے آپ کو تلنگانہ کی قومی اور جغرافی خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد یہ ایک آندھرا راجدھانی معلوم ہونے لگی اور شاہان قطبیہ آندھرا راجگان معلوم ہوتے تھے، کیوں کہ تلنگانے کو ان لوگوں نے اپنا گھر بنا لیا، تلنگی عورتوں سے شادیاں کیں اور ترکستانی وضع قطع چھوڑ کر مقامی لباس اور طور و طریق اختیار کئے اور تلنگی زبان سیکھی اور اس میں شاعری کی، ملک کے ہر طبقے کو مذہب کی پوری آزادی حاصل تھی۔ اس ہم آہنگی کا نتیجہ یہ تھا کہ قطب شاہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ تلنگانے کی قومی اور جغرافی خصوصیات کی صحیح پیمائش کر کے بہت جلد ایک تعمیری خاکہ تیار کر لیا اور اس ملک کی ہر طرح سے تعمیر کی۔ آندھرا قوم کو اپنی رعایا سمجھ کر آگے بڑھایا، تلنگی زبان کی سرپرستی کی اور تمدنی ترقی کے تمام راستے کھول دیئے اور غالباً یہ تاریخ آندھرا کا سنہری زمانہ تھا۔ تمام قطب شاہی سلاطین بڑے ذی علم شائستہ انسان تھے اور حکمرانی میں اپنی پوری ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ اکثر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے وزراء سے مشورہ کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے اور خاص معاملات میں علماء عصر سے بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۴۶ھ میں علماء سے مشورہ کر کے شاہجہاں کی شرطیں تسلیم کی تھیں۔ ان میں رواداری اور رعایا پروری بے حد تھی اور عدل گستری ان کا خاص شعار تھا۔ ان لوگوں نے اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہوں نے ہندو طبقے کے مذہبی جذبات کا لحاظ کر کے منگل کو تعطیل عام قرار دی تھی اور تانا شاہ نے بھدراچلم اور بھیمارا میشورسوامی نامی مندروں کو جو گوداوری اور کرشنا پر واقع ہیں زرخیز جاگیریں عطا کی تھیں جس سے اس بادشاہ کی کشادہ خیالی اور مذہبی رواداری معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اہل تلنگانہ قطب شاہی سلطنت کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ کو تلنگانے میں آئے

ہوئے ابھی بہت روز نہیں ہوئے تھے کہ تلنگی رعایا اس کو بڑے ملک کے ہر دلعزیز لقب سے یاد کرنے لگی۔ اس کے جانشینوں کے ساتھ بھی یہی محبت تھی اور بلکہ اکثر "ماں صاحب" کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔

خارجی مسلک قطب شاہوں کا خارجی مسلک وسعتِ نظر، راست بازی اور دوراندیشی پر مبنی تھا سارے ملک میں اپنی سلطنت کی فلاح کے ساتھ پورے دکن کی سالمیت پیشِ نظر تھی۔ اسی اصول کی روشنی میں جنگ و صلح کے فیصلے اور بین الملکتی معاہدے ہوئے گولکنڈہ کے ساتھ جتنی لڑائیاں ہوئیں اور معاہدے ہوئے ان میں بھی بین المملکتی بھائی چارہ پنہاں تھا جب کسی مملکت کا پلہ بھاری ہوتا اور طاقتور مملکت کمزور مملکت پر دست درازی کرتی تو قطب شاہی سلطنت نے موقع پر کمزور کی دستگیری کرتی چنانچہ بیجاپور کے مقابلے میں گولکنڈہ نے ہمیشہ احمدنگر کا ساتھ دیا تاکہ توازنِ قوت قائم رہے اور جب کبھی پورے دکن کی سالمیت خطرے میں پڑی تھی تو قطب شاہی مملکت بڑے اتحاد میں تحریک ہوتی تھی اور آئے ہوئے خطرے کو روکتی تھی چنانچہ جنگ تالیکوٹ اور دوسری لڑائیاں اس برادرانہ جذبے کی روشن مثالیں ہیں۔ چاند بی بی اور ملک عنبر کی تائید میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ سترھویں صدی کے اوائل میں وسط ایشیاء کی ایک اور سیاسی رو اس خارجی مسلک میں شامل ہوگئی۔ محمد قلی قطب نے کچھ تو مغلوں کے خطرے سے ڈر کر اور کچھ مذہبی یگانگت سے ایران کے صفوی سلاطین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اس دوستی میں صفوی حکمرانوں کا بھی فائدہ تھا کیونکہ وہ ایک طرف عثمانی ترک اور دوسری طرف ہندوستان کی مغل طاقت سے خائف تھے اور گولکنڈہ، بیجاپور کی تائید سے اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے چنانچہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سب سے پہلے ایک سو بارہ ہجری میں سفیر ایران گولکنڈہ آیا اور قطب شاہی دربار سے تنبر علی اور مہدی قلی سفیر بن کر گئے اور رسم باز دید داکی اس کے

بعد ۱۰۲۳ھ میں ایران سے حسین بیگ قبچاجی گولکنڈہ آیا اور اس نے محمد قلی کی وفات پر تعزیت کی اور سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی پر رسم تہنیت ادا کی اور اس کے ایک سال بعد گولکنڈہ سے ایک سو چوبیس ہجری میں شیخ محمد بن خاتون ایران بھیجا گیا اور اس نے صفوی دربار میں پیام دوستی اور اتحاد پہونچایا لیکن شیخ سلطان محمد کے انتقال کے بعد ۱۰۳۵ھ میں واپس آیا۔ اور شیخ کے ساتھ سفیر ایران قاسم بیگ آیا تھا اور اس نے عبداللہ قطب شاہ کو جلوس شاہی کی مبارکباد دی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سفیر حیدرآباد میں مرگیا اور اس کا بیٹا محمد قلی بیگ دو سال کے بعد واپس ہوا تو اس کے ساتھ گولکنڈے سے خیرات خاں روانہ کیا گیا۔ اور یہ ایران اور گولکنڈہ کی آخری سفارتیں تھیں اس کے بعد ایران کے ساتھ سفارتی تعلق باقی نہیں رہا۔ کیونکہ اس اثناء میں دکن میں مغلوں کا غلبہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی بیرونی طاقت کا رسوخ ناممکن ہوگیا۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں نظام شاہی سلطنت ہمیشہ کے لئے مغل سیلاب میں بہہ گئی اور ایک سال کے بعد ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں مغل شہنشاہیت کی باجگزار ہوگئیں اب مغل شہنشاہ ایران کا بیرونی تعلق کیسے گوارہ کر سکتے چنانچہ ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء والے معاہدہ میں یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ ایران سے اپنا رشتۂ اتحاد منقطع کرلے اس کے بعد ایرانی سفراء کی جگہ مغل حاجب آنے لگے اور قطب شاہی سیاست میں دخیل ہوگئے جس کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ کی سیاست بدمزا ہوگئی۔

گولکنڈہ کی معاشرت

گولکنڈے کی معاشرت بہت بلند اور پاکیزہ تھی چونکہ قطب شاہ خود بہت پاکیزہ معاشرت کے دل دادہ تھے اس کا اثر رعایا پر بھی پڑا تھا بادشاہوں کی خانگی اور درباری زندگی اس قدر شاندار تھی کہ دوسرے ہمعصر شاہی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ان کے عظیم الشان دربار، شاندار جلوس، فلک بوس محل اور پرلطف

علمی سماجی محفلیں ان کی عظمت کا ثبوت دیتی تھیں ان کے طریقہ بود و باش کا اندازہ کسی قدر ان کی عمارتوں سے ہوتا ہے۔ بعض عمارتیں اس وقت موجود ہیں اور بعض کی صفحات تاریخ پر تعریف رہ گئی ہے شاہی بارگاہ تو کجا ان کے رہنے کے قصر بھی اس قدر بلند تھے کہ ان کی مشکل سے مثال ملتی ہے اندر بہترین قالینوں کا فرش اور چینی و بلوریں آلات کی سجاوٹ اور باہر سے عمارتوں کی رفعت و باغبانی بڑی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ ایک مغل شہزادے نے جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا لکھا تھا کہ ان محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے شاہی درباروں کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں شاہی جلوس بھی اسی قدر شاندار ہوتے تھے بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتے تھے اور ان کے ساتھ بڑا ہجوم ہوتا تھا امراء اور وزراء گھوڑوں اور پالکیوں میں جلوس کے ساتھ رہتے تھے اور ایک بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا بادشاہوں کے مقبرے بھی بڑے شاندار بنائے جاتے تھے جو اب تک موجود ہیں۔ قبروں پر زردوز غلاف پہنائے جاتے تھے اور قبروں کے اردگرد قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے اور سونے چاندی کی شمعیں روشن کی جاتی تھیں اور ہر روز غرباء کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ امراء کی زندگی بھی کچھ کم شاندار نہ تھی یہ بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے تھے جو کئی منزل بلند ہوتیں۔ ان کا جلوس بھی ایسا ہی شاندار ہوتا تھا گویا خود بادشاہوں کا جلوس تھا۔ جب یہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ہمراہ بھی ہاتھی اور اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں اور بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا۔ اور سب کے پیچھے ان کا ہاتھی یا پالکی ہوتی تھی۔ ریٹوریز اس جلوس کی بڑی تفصیل پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جلوس ہاتھیوں سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے اس میں بارہ ہاتھی ہوتے ہیں اور یہ تعداد امیر کے مرتبہ امارت کے مطابق معین ہوتی ہے ان پر ہودے اور عماریاں کسی ہوتی ہیں اور ایک ہاتھی پر جھنڈا ہوتا ہے۔ ہاتھیوں کے پیچھے اونٹوں کی قطار ہوتی ہے اور ان کے پیچھے گاڑیاں آتی ہیں جن کے ساتھ پیدل ملازم چلتے ہیں

پھر ان کے پیچھے صاحب جلوس کی سواری ہوتی ہے اور ان کے پیچھے سوار و پیدل ہوتے ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ بھی بہت پاکیزہ اور پر تکلف زندگی بسر کرتا تھا۔ شہر حیدرآباد میں دو لاکھ مکانوں کی گنتی کی گئی تھی اور ہر مکان کے رہنے والے متوسط پانچ آدمی قرار دیئے جائیں تو شہر کی دس لاکھ آبادی ہونی چاہئے۔ اس لحاظ سے یہ قرونِ وسطیٰ کا بہت بڑا شہر تھا۔ اس کی آبادی اور بلند عمارتوں کو دیکھ کر ایک مغل مورخ نے "آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال" اور "عمارت رفیع تر از پایۂ اندیشہ" کہا تھا جو قطب شاہی تمدن کی بہت بڑی دلیل ہے۔ غالباً شمال کے شہنشاہی شہر بھی اتنے آباد نہیں تھے اور آبادی میں ہر طرح کے لوگ تھے، تاجر، عہدہ دار، قانون داں، مہاجن، صناع اور جوہری لیکن اس میں باہر کے لوگ یعنی مغل ایرانی ترک زیادہ تھے جو حیدرآباد کے تھے۔ ان کی معاشرت بے حد پر تکلف تھی۔ اول تو ان کے رہنے بسنے کے مکانات نہایت شان دار اور بلند ہوتے تھے اور ان کے در و دیوار سے بڑی شان و شوکت جھلکتی تھی سونے اور چاندی کی اشیاء کے علاوہ چینی کے ظروف روشنی کے جھاڑ استعمال ہوتے تھے جن کو مورخ چینی آلات کہتے ہیں شیشے اور بلوریں ظروف ممالک غیر سے جہازوں میں لد کر آتے تھے اور مسولی پٹنم و حیدرآباد کے بازاروں میں فروخت ہوتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء میں حیدرآباد کی لوٹ ہوگئی تو ہزار ہا قسم کی چیزیں ظروف اور کپڑے باہر نکلے اور دفاین اور دریوں کے بہترین فرش راستوں پر نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر خود مغلوں کو حیرت ہوئی اور ان اشیائے تمدن سے گھر اتنے بھرے ہوئے تھے کہ کہ لوٹ مار کے باوجود خالی نہ ہوئے۔ حالانکہ چار پانچ کروڑ کی لوٹ ہو چکی تھی۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کا متوسط طبقہ بھی کچھ کم متمدن نہ تھا۔

اخلاقی حالت ۔ اگر چہ اس زمانے کی اخلاقی حالت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن قرائن یہ ہیں کہ قطب شاہی رعایا میں عام طور پر اخلاقی حالت خراب

نہ تھی اور متوسط طبقے میں علمی سرگرمی بھی پائی جاتی تھی کیوں کہ حیدرآباد کی جب لوٹ ہوئی تو اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ ہر گھر سے بہتری کتابیں بھی برآمد ہوئی تھیں، صوم صلوٰۃ کا بھی عام شوق تھا، کیوں کہ شہر اور اس کے نواح میں مساجد اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ شمار میں نہیں آئیں اور یہ سب قطب شاہی دور کی بنی ہوئی ہیں، تاہم یہ بات بھی ماننی پڑتی ہے کہ شہر حیدرآباد کی ترقی کے ساتھ اہل شہر میں تعیشات کی بھی فراوانی ہو گئی تھی اور ہر جگہ عیش و عشرت کا سامان جیسا تھا جو شہری زندگی کا خاصہ ہے چونکہ قطب شاہی سلطنت میں امراء کی کثرت تھی اور ملک میں خوشحالی تھی اس لئے ان کی بے کاری اور فارغ البالی کی وجہ سے ملک میں عیش عشرت کا سامان ہونا ضروری تھا۔ اس میں خود بادشاہوں کی زندگی بھی اثر انداز تھی، یہ کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں شہری تعیشات میں بہت اضافہ ہوا، کیوں کہ بادشاہ خود عیش پرست تھا، یہ صحیح ہے کہ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے عیش و عشرت کی رفتار بہت دنوں تک سست ہو گئی، کیوں کہ سلطان محمدؒ نے پاکیزہ زندگی پائی تھی اور دن رات مذہبی فرائض میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کا اخلاقی اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا لیکن عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں یہ بات باقی نہیں رہی بلکہ اس عہد میں پھر عیش و عشرت کے دروازے کھل گئے عبداللہ کو رقص و سرود کا بہت شوق تھا، چنانچہ مقامی ذرایع سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ لاہور، آگرہ اور برہان پور سے عیش و عشرت کا سامان جمع کیا جاتا تھا۔ شاہی زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑتا تھا چنانچہ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں رقص و سرود کی محفلیں عام ہونے لگیں اور عیش و عشرت کی گرم بازاری ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو، مسلمانوں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، بغیر طائف اور رقص و سرود کے نہیں ہوتی، یہ طرز زندگی ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں بھی جاری رہی غالباً انھیں حالات کو دیکھ کر لوگ ابوالحسن

اور اس کے عہد سے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔

معاشی حالت دکن کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت زیادہ مالدار اور خوشحال تھی کیوں کہ اس سلطنت کو آمدنی کے جو قدرتی اور انتظامی ذرائع حاصل تھے وہ دوسری سلطنتوں کو میسر نہ تھے۔ اول تو یہ سلطنت بہت وسیع تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے جوں جوں کرناٹک کے اضلاع سلطنت میں ضم ہوتے گئے تو یہ سلطنت بہت پھیلتی گئی ان فتوحات کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ ساحل کارومنڈل کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگئی، چنانچہ زمینوں کی نوعیت کے اعتبار سے اس سلطنت کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو ساحل کارومنڈل کا مستطیل حصہ جو سمندر کے متوازی چلا گیا تھا، اسی میں دریائے کرشنا اور گوداوری کی سیراب زمینیں بھی شامل تھیں اور اس کے بعد ملک کا اندرونی حصہ تھا جس میں مشرقی گھاٹ اور دکن کی سطح مرتفع داخل تھی۔ یہ دونوں خطے زرخیز اور بہت سیر حاصل تھے، اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں "یک قطعہ زمین بے مزرعہ نیست"[۱]۔ نیز باہر کے سیاح بھی اس سلطنت کی زرخیزی کے بہت مداح رہے ہیں۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ گولکنڈے کی سلطنت بہت زرخیز ہے[۲] اگرچہ طریقہ مالگزاری کی خرابی سے رعیت کو نقصان پہونچتا تھا۔ تاہم آخری زمانے میں اس کی بہت کچھ اصلاح ہوچکی تھی۔ ویران دیہات آباد ہوئے اور نئے تالاب اور باؤلیاں کھدوائی گئی تھیں۔ اس سلطنت میں ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا تھا۔ گیہوں، چاول، جوار

---

[۱] یہ اورنگ زیب کا فقرہ ہے جو اس نے بہ حیثیت ناظم دکن کے لکھا تھا۔ (رقعات عالمگیری) [۲] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۱، گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۸۔

باجرا ۔ مونگ ۔ چنا ۔ مسور ۔ تور ۔ تل کثرت سے پیدا ہوتے تھے ۔ اس کے علاوہ کپاس تمباکو اور ارنڈی کی بہت پیداوار تھی ۔ تمباکو اور تاڑی سے محصول وصول ہوتا تھا ۔ پھلوں میں آم، موز، لیمو، انار، انناس بہت پیدا ہوتے تھے ۔ ان کے علاوہ سنگترے اور امرود بھی پیدا ہوتے تھے[۱] ۔ مزروعہ زمینوں کے علاوہ اس سلطنت میں جنگلات بھی بہت تھے جن کی لکڑی اور جانوروں سے بڑی آمدنی ہوتی تھی جنگلات میں شیر، ہاتھی، ریچھ، چیتے، بندر، ہرن اور جینل پائے جاتے تھے جواب بھی ہیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کو اپنے چھ صوبوں کی زرعی پیداوار سے جن میں (۳۷) سرکار اور (۵۱۷) پرگنے تھے کافی محاصل ہوتے تھے ۔

مزروعہ و غیر مزروعہ زمینات کے علاوہ قطب شاہی سلطنت کو معدنیات سے بھی غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی اس سلطنت میں ہیرے کی بے شمار کانیں تھیں، گولکنڈہ اپنے ہیرے کی کانوں کی وجہ سے نہ صرف دنیا میں مشہور تھا بلکہ بہت مال دار تھا، اور دکن کی کوئی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی ہیروں کی بہتات کی وجہ سے جو اس سلطنت میں پیدا ہوتے تھے اس کو بالعموم "ہیروں کا ملک" کہتے تھے ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سلطنت کے حدود میں ہیروں کی کانیں کب دریافت ہوئی تھیں اور کس زمانے سے ہیرے زمین سے کھودے جانے لگے ۔ ایک روایت یہ ہے کہ سولھویں صدی کے اوائل میں ایک اتفاق سے یہاں کا پتا چل گیا ۔ انگریزی کمپنی کا ملازم ولیم میتھولڈ جو ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے کہ ایک روز اتفاق سے ایک چرواہے کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اس نے پتھر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت چمکدار ہے، وہ اصل میں ہیرا تھا مگر اس نے معمولی داموں میں اس کو فروخت کر دیا ۔

---

[۱] گولکنڈے کے تعلقات، ص ۸۵

یہ سلطان محمد قطب شاہ کا عہد تھا۔ غالباً اسی عہد میں یہ معدن دریافت ہوئے تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس دریافت میں ترقی ہو گئی اور ایک کان سے دوسری کان تک پتہ چل گیا اور حکومت نے ان کی نگرانی شروع کر دی۔ پھر تلنگانے سے آگے بڑھ کر کرنائک میں یہ معدن دریافت ہو گئے۔ کھودنے والوں کو اتنی مشق اور مہارت ہو گئی تھی کہ ٹیلے کی نوعیت، بُو اور زمین کے رنگ سے ان کا پتہ چلا لیتے تھے۔

ٹیورینیر کے بیان کے مطابق قطب شاہی سلطنت میں (۲۳) کانیں پائی جاتی تھیں۔ ہیروں کے علاوہ معدنیات میں لوہا، فولاد اور سیسہ بھی ملتا تھا اور باہر بھیجا جاتا تھا گولکنڈے کا لوہا اور فولاد تو ہر جگہ مشہور تھا۔ سیاح کہتے ہیں کہ گولکنڈے میں لوہا بے حد پیدا ہوتا تھا اور اس کے فولاد کی دور تک شہرت تھی اور یہ پنجاب، لاہور اور ایران جایا کرتا تھا، اسی کی تلواریں بنتی تھیں جو دمشقی تلواریں کہلاتی تھیں۔

علمی سرپرستی بیجاپور کے ساتھ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بھی علم و فن کی سچی پرستار تھی اس سلطنت نے علم و فن کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک ایسا علمی سرمایہ چھوڑا جو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گو یہ ایک حقیقت ہے کہ دکن کی تمام علمی سرگرمیاں، بہمنیوں کی یادگار تھیں جنھوں نے اپنے بلند پایہ علمی ذوق سے دکن جگمگا دیا تھا اور یہ کہنا صحیح ہے کہ گولکنڈے کا علمی شغف بہمنی سلطنت سے ورثہ میں ملا چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین گلبرگہ اور بیدر کے علمی خزانوں کے ریزہ چیں تھے تاہم اس خاندان کے بانی بھی ترکستان کے ایک ذی علم و شائستہ خاندان کے سپوت تھے اور اپنے ساتھ ایک اچھا علمی ذوق لے کر آئے تھے چنانچہ جب گولکنڈہ کی سلطنت قائم ہوئی تو ان قطب شاہوں کی دولت تلنگانے میں بھی علم کی بساط بچھ گئی اور حیدرآباد بھی علم کا ایک بڑا مرکز بن گیا اس سلطنت کے تمام فرماں رواسب کے سب تعلیم یافتہ اور علم و حکمت کے دلدادہ

محمد قلی کے عہد کے باکمال شاعروں میں شیخ احمد گجراتی اور ملک الشعرا ملا وجہی کے نام قابل ذکر ہیں۔ شیخ احمد کی دو کتابوں "قصہ لیلیٰ مجنوں" (۱۲۰۰ء) اور "مصیبت اہل بیت" کا پتہ چلتا ہے۔ اول الذکر مثنوی کے چند منتشر اوراق محمود شیرانی کو دستیاب ہوئے تھے جن کا تفصیلی ذکر انہوں نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں کیا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کو احمد کی ایک اور مثنوی "یوسف زلیخا"[١] دستیاب ہوئی ہے۔ یہ مثنوی تقریباً پونے چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے "یوسف زلیخا" کے مطالعہ سے شاعر کے حالات، وطن اور خلافت پر روشنی پڑتی ہے۔

احمد گجرات کا متوطن تھا جس کا ذکر اس نے حسب ذیل شعر میں کیا ہے۔

احمد دکن کے خوباں ہوتیاں ہیں پُر ملاحت
تو توں دکھن کو اپنا گجرات کر کے سمجیا[٢]

[٣] اس مثنوی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ احمد شاہ وجیہہ الدین علوی کا مرید تھا

وجہی، محمد قلی کے عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور ادیب ہے۔ محمد قلی نے اس کو اپنے دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا گیا ہے "قطب مشتری" "سب رس" اور "تاج الحقائق" کے علاوہ وجہی کی چند چیدہ چیدہ غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں، حال ہی میں وجہی کا فارسی دیوان بھی دریافت ہوا ہے۔

محمد قلی کے اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ ۱۶۱۲ء میں گولکنڈہ

١۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو جلد اول۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۲۴

٢۔ " " " " "

٣۔ " " " " ۲۳۴

تھے جس طرح ان لوگوں نے بے لوث جہانبانی کو اپنا فرض منصب سمجھا تھا اسی طرح علم و حکمت کی سرپرستی کو بھی اپنا فریضۂ حیات بنایا تھا۔ ان حکمرانوں نے نہ صرف علماء و شعراء کی حوصلہ افزائی کی بلکہ خود شاعری کی اور بڑی کتابیں لکھیں اور ذاتی دلچسپیوں کے علاوہ اپنی رعایا کی ذہنی تربیت کا انتظام کیا کہ وہ اس نعمت سے محروم نہ ہوں ملک میں جگہ جگہ مدرسے بنائے اور بیش قرار معلم مقرر کئے اور مقامی زبان تلنگی کی اس طرح سرپرستی کی کہ گویا یہ خود ان کی زبان تھی تاکہ ملک کا ہر طبقہ دولت علم سے مالا مال ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب شاہوں کی اس علم دوستی کی وجہ سے تمام تلنگانے میں علم کی لہریں دوڑ گئیں اور اکتساب علم کا عام شوق پیدا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو پشتوں کے بعد ہی تمام ملک میں ایک علمی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی، مسلمان تو تمام تعلیم پاتے تھے اور کتب خانے جمع کرتے تھے، کیوں کہ شاہی کتب خانوں کے علاوہ جن میں ہزارہا کتابیں تھیں عام لوگوں کے بھی بے شمار کتب خانے تھے لیکن ہندو رعایا بھی اس شوق سے خالی نہ تھی۔ ہندو طبقوں میں لکھنے پڑھنے اور حساب دانی کا خاطر خواہ مشغلہ تھا۔ سرکاری محکموں میں ان سے کام لیا جاتا۔ مقامی زبان کے علاوہ ہندو۔ فارسی بھی پڑھتے تھے جو سرکاری زبان تھی چنانچہ مادنا کا تمام خاندان فارسی جانتا تھا یہ شاہی فرامین لکھنے اور پڑھنے کے قابل تھا۔ قرائن یہ ہیں کہ ملک میں ایسے متعدد خاندان ہوں گے جو اپنے کو ملک اور حکومت کی ضروریات کے لئے تیار کرتے تھے۔ تلنگی زبان کی ترقی اس کے علاوہ تھی کیوں کہ حکومت اس کی بھی بڑی سرپرست تھی۔

اردو کی سرپرستی اردو زبان کی سرپرستی قطب شاہی خاندان کا بہت بڑا طغرائے امتیاز ہے۔ دوسرے دکنی درباروں کی طرح قطب شاہوں نے بھی اردو یا دکنی کو سنوارنے میں پورا حصہ لیا ہے۔ ان بادشاہوں نے دکنی زبان اور اس کے شاعروں کو وہ درجہ دیا جو مغل شہنشاہ فارسی شاعروں کو دیتے تھے مغل دربار میں فیضی اور ابو طالب کلیم

ملک الشعراء تھے تو دکنی درباروں میں وجہی، غواصی جیسے دکنی شاعروں کو ملک الشعراء ہونے کی عزت حاصل تھی بلکہ بادشاہوں نے اسی زبان میں شاعری کر کے دکنی زبان کو ایسا اجاگر کر دیا کہ وہ قومی اور شاہی زبان ہو گئی اور لوگ اس کو اپنی زبان کہتے ہوئے فخر کرنے لگے ورنہ عادل شاہی اور قطب شاہی سرپرستی سے پہلے دکنی کو کون پوچھتا تھا۔

سلطان قلی قطب شاہ اور جمشید قطب شاہ کے عہد میں تو دکنی زبان کو کوئی فروغ نہیں ہوا مگر ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جب کہ قطب شاہی سلطنت مستحکم ہو گئی تو دکنی کا شوق پیدا ہو گیا چنانچہ اس عہد میں فیروز، محمود اور ملا خیالی تین دکھنی شاعروں کے نام آتے ہیں یہ دکھنی کے اولین شعراء ہیں۔ فیروز نے توصیف نامہ لکھا تھا اس کو متاخر شعراء وجہی اور غواصی اپنا استاد مانتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا شاعر تھا دوسروں کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ اور ان شاعروں کے حالات بھی معلوم نہیں ہوتے تاہم ان کے وجود سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں اردو ادب کی خدمت کا پایا پڑ گیا تھا جب اس کے جانشین برسرِ حکومت ہوئے تو ان کو ترقی کرنے کا کافی موقع ملا چونکہ محمد قلی اور سلطان محمد کے عہد میں سلطنت چاروں طرف سے پرامن ہو گئی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے تیس سالہ عہدِ حکومت میں دکنی کی اتنی خدمت کی کہ وہ اوجِ کمال پر پہونچ گئی اور ایک شائستہ زبان ہو گئی یہ خود بھی ایک بڑا قادر الکلام شاعر تھا اور اردو میں معانی تخلص کرتا تھا۔ اس کے کلام کا ضخیم مجموعہ موجود ہے۔ جس میں قصیدے، غزلیں، مرثیے اور قطعات جیسے کئی اصنافِ سخن پائے جاتے ہیں سیاسی معاشرتی اور سماجی ہر مضمون پر طبع آزمائی کی گئی ہے محمد قلی کے کلام میں ادبی روانی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی ذہنی کد و کاوش میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھا غالباً گولکنڈے بادشاہوں میں اتنا پرگو شاعر جس کی زندگی کے ہر پہلو سے مس ہو نہیں پیدا ہوا۔ اس وقت صرف

دو شاعروں کا حال معلوم ہوتا ہے، ایک وجہی اور دوسرے احمد، وجہی ایک بلند پایہ شاعر تھا جو غالباً ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا، لیکن اس کا شاعرانہ کمال سب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ظاہر ہوا اور اس کی بڑی شہرت ہوئی اس نے نظم میں قطب مشتری اور نثر میں "سب رس" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ دونوں قصے ہیں جو بڑے لطیف اور استادانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ ادبی تاریخ کا بہت بڑا اضافہ ہے۔ احمد نے بادشاہ کے حکم سے لیلیٰ مجنون لکھی تھی، لیکن اسکے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کا عہد دکھنی زبان کی سرگرمیوں سے خالی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت میں جو پچاس سال طویل ہے دکھنی نے انتہائی ترقی کرلی، اس کو اردو ادب کا سنہری زمانہ کہنا چاہیئے اول تو خود بادشاہ نے جو بڑا عالم و شاعر تھا، دکنی ادب میں دلچسپی لی۔ ایک دیوان لکھا۔ اس کا طرز بیان سلطان محمد سے زیادہ صاف اور سلیس سمجھا جاتا ہے گو اس کے کلام میں اتنی روانی اور لوچ نہیں ہے جیسے اس کے دادا محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ عبداللہ تخلص کرتا تھا ——— اس کی سرپرستی میں دکھنی کے بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی اور بڑا ادبی سرمایہ چھوڑا غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عبداللہ کے عہد میں دکنی ایک مستند زبان ہوگئی اس عہد میں غواصی اور ابن نشاطی دو بڑے شاعر گزرے ہیں۔ غواصی نے سیف الملوک بدیع الجمال اور طوطی نامہ کی مشہور مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ دونوں قصے ہیں اور دکھنی زبان کے شہ کار سمجھے جاتے ہیں ابن نشاطی کی تصنیف "پھول بن" خاص شہرت رکھتی ہے، یہ بھی ایک قصہ ہے جو کسی فارسی قصے کا ترجمہ ہے۔ لیکن اپنے اسلوب بیان اور قصے کی ترتیب کے لحاظ سے یہ قطب شاہی دور کی بہت بڑی پیداوار ہے۔ ان مشہور شاعروں کے علاوہ

طبعی اور امین بھی قابل ذکر ہیں اول الذکر نے "بہرام وگل اندام" کے نام سے ایک دلچسپ قصہ لکھا تھا جو زبان اور طرز زبان کا لحاظ کرتے بہت دل کش ہے عبد اللہ کے انتقال کے بعد ادبی سرگرمی ختم نہیں ہوئی بلکہ برابر جاری رہی۔ چنانچہ ابوالحسن قطب شاہ جو بہت تعلیم یافتہ صاحب ذوق آدمی تھا۔ دکھنی کا بڑا مربی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شاعری کی تھی اور قید میں بھی شعر وسخن کے مشغلے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اس وقت دو ایک غزلوں کے سوا اس کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

پروفیسر ھارون خاں شروانی

گولکنڈہ کا کلچر

دکنی کلچر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ آبادی کے مختلف عناصر کے درمیان یک جہتی ہو، خواہ وہ عناصر کسی مذہب یا کسی ملت سے کیوں نہ وابستہ ہوں۔ اس اعتبار سے گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سے بھی زیادہ ممتاز تھی۔ خاندان قطب شاہی کا ابوالآباء سلطان قلی قطب الملک[له] بانیٔ سلطنت بیجاپور کی طرح ایک بدیشی تھا اور محض اپنی قابلیت اور فراست کے باعث اقتدار و اختیار کی چوٹی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی، ایک دور اندیش منتظم ملکی، اور ایک بڑا سردار تھا اور اس نے

له بانیٔ خانوادۂ قطب شاہیہ سلطان قلی قطب الملک نے کبھی اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا بلکہ "سلطان" اس کے نام ہی کا جزو تھا۔ اس کے دادا کا نام پیر قلی، باپ کا نام اویس قلی اور چچا کا نام اللہ قلی تھا۔ پہلا قطب شاہی حکمراں جس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا ابراہیم قطب شاہ تھا جس نے ۱۵۵۰ سے ۱۵۸۰ تک حکومت کی۔

جس حکمت عملی کی بنیاد رکھی وہ اتنی دیر پا ثابت ہوئی کہ اس کے جانشین برابر اس پر عمل پیرا رہے اور اس کے باعث سلطنت برابر مستحکم ہوتی گئی۔ اس کی ملکی پالیسی کا شاید سب سے بڑا عنصر اس کا وہ اعتماد تھا جو اسے اپنی رعایا کے ہر برآوردہ اشخاص پر تھا اور اس اعتماد میں اس نے کبھی مسلم غیر مسلم کے درمیان فرق نہیں کیا۔ گولکنڈے اور وجیانگر کے درمیان دشمنی اور پیکار بہمنی عہد سے برابر چلی آرہی تھی اور قطب الملک کو یہ پیکار گویا ورثے میں ملی تھی۔ ایک مہم سر کرنے کے بعد وہ وجیانگر کے ایک اچھے بڑے ضلع پر قابض ہو گیا اور جب اس کے انتظام کا سوال پیدا ہوا تو اس نے اپنے ایک ہر برآوردہ ہندو امیر رام راج کو اس کا حاکم مقرر کیا۔ یہ وہی رام راج ہے جو فرار ہو کر کرشن دیورائے فرمانروائے وجیانگر سے جا ملا اور کرشن دیورائے کے انتقال کے بعد وجیانگر کا متولی سلطنت اور وہاں کے سیاہ و سپید کا مالک ہو گیا اور آخر کار جنوری ۱۵۶۵ میں سلاطین دکن سے گویا لڑتا ہوا کام آیا۔[1]

سلطان قلی کے بعد اس کا بیٹا جمشید قطب الملک اس کا جانشین ہوا۔

---

[1] حال تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ لڑائی تالی کوٹا میں ہوئی جو ضلع بیجاپور میں دریائے کرشنا سے بائیس میل شمال کی جانب واقع ہے، لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ بنی ہٹی کے مقام پر ہوئی جو اس دریا سے بارہ میل جنوب کی طرف ہے دیکھیے۔
SHERWANI "BATTLE OF THE KRISHNA" JOURNAL OF INDIAN HISTORY

اس کے عہد حکومت میں ابتدا ہی سے معاملات ملکی پر ایک ہندو جگدیو راؤ حاوی تھا۔ "تاریخ محمد قطب شاہ" میں جو قطب شاہی عہد کی ایک نہایت مستند تاریخ ہے لکھا ہے کہ "رائے اعظم از جملہ سرداران معتبر بود"۔ جمشید کا پورا دورِ حکومت جگدیو راؤ کے کارناموں سے بھرا پڑا ہے اور خواہ سلطنت کی آزادی کو بیدر کے بریدیوں سے یا بیجاپور کے عادل شاہوں سے خطرہ ہو، جگدیو راؤ کا نام گولکنڈہ کے وفاداروں اور ہر طرح سے اس کی خدمت کرنے والوں میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ جمشید کے انتقال پر پائے تخت میں جو عظیم خلفشار رونما ہوا اس کے دوران میں تو جگدیو راؤ بادشاہ گر بن گیا اور آخرکار جب جمشید کا بھائی ابراہیم، جو وجیا نگر سے فرار ہوگیا تھا، ۱۵۵۰ میں گولکنڈے واپس آیا تو یہ جگدیو راؤ ہی تھا جس نے اس کی بادشاہت کا اعلان کیا۔[۱]

ابراہیم جب وجیا نگر بھاگا ہے تو اس کی عمر صرف بارہ برس کی تھی اور بادشاہ ہونے پر وہ بیس برس کا نوجوان تھا۔ سات برس تک وجیانگر میں رہنے کے بعد اسے تلنگی زبان اور تلنگی کلچر سے ایک خاص شغف ہوگیا تھا۔ اور اس کا طویل تیس سالہ عہد حکومت دکن کی ملی جلی کلچر کی ایک درخشاں مثال ہے۔ اس نے اپنی ابتدائی نوجوانی تلنگی زبان

---

[۱] جمشید ۱۵۴۳ تا ۱۵۵۰ اجگدیو راؤ کے لئے دیکھیے "تاریخ محمد قطب شاہ" مخطوطہ آصفیہ ۴۰۲، ص ۱۱۶ تا ۱۳۰

کے گہوارے وجیانگر میں گزاری تھی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس نے وہیں کی ایک خاتون بھاگیرتی سے نکاح بھی کرلیا تھا۔ اس پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوتی کہ اسے تلنگی زبان کے ساتھ ایک خاص شغف پیدا ہوگیا ہوگا۔ اس کا دربار تلنگی زبان کے شعراء اور ادیبوں سے بھرا رہتا تھا اور اس نے ایک بڑے تلنگی شاعر پوناگنٹی تیلیکے ناریا کو سلطنت کا تلنگی ملک الشعراء مقرر کیا۔ وہ تلنگی زبان کے حلقوں میں اتنا ہردلعزیز ہوا کہ اس کے نام کو ہندوانہ روپ دیکر "ملکی بھرام" (ملک ابراہیم) بنا دیا گیا، اور جب اس کا انتقال ہوا ہے تو تلنگی شاعر چیخ اٹھا اور برہما کو مخاطب کرکے کہنے لگا کہ "ہے برہموا! اگر تجھے کسی کو اپنے پاس بلانا تھا تو تجھے سینکڑوں بے فیض حکمراں مل جاتے لیکن تو نے کیا غضب کیا کہ ایک ایسے شخص کو دنیا سے اٹھالیا جس کا ثانی تو پیدا نہیں کرسکتا[۱]

اب فارسی اور تلنگی کے دوش بدوش ایک تیسری زبان کا ستارہ افق سے اٹھتا ہوا نظر آتا ہے لیکن یہ ابھی دھندلا سا ہی دکھائی دیتا ہے اور ابھی اس کی کرنوں سے دنیائے دکن منور نہیں ہوئی ہے۔ یہ دکھنی زبان کا ستارہ ہے۔ اس زبان کی نشوونما بیدر اور بیجاپور میں بھی ہوتی رہی۔

---

[۱] SHERWANI: CULTURE AND ADMINISTRATIVE SET-UP UNDER IBRAHIM QUTB SHAH.
اسلامک کلچر، حیدرآباد، اپریل ۱۹۵۷ء

ہے اور گولکنڈہ حیدرآباد بھی اس زبان کی ضو فشانی سے محروم نہیں رہ سکا۔ ابراہیم کے زمانے میں اس کی ابتدائی کیفیات ملتی ہیں۔ لیکن یہ اس کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ، بانیٔ حیدرآباد کے حصے ہی میں آیا تھا کہ وہ اس زبان کی سرپرستی کرے اور دکھنی کے پہلے صاحب دیوان کی حیثیت سے بقائے دوام حاصل کرے۔ اس کے دیوان میں بلا مبالغہ سینکڑوں ہزاروں ہندی کے الفاظ ایسے ہیں جنھیں فارسی عربی الفاظ کے ساتھ سمو دیا گیا ہے اور کہیں کہیں اس آمیزے میں تلنگی الفاظ کی چاشنی بھی داخل کردی گئی ہے۔ یہ آمیزہ اس قدر ریختہ ہوگیا ہے کہ آج بھی اس کے دیوان کو اردو والے، اردو اور ہندی والے ہندی کہتے ہیں اور اسے نہایت آزادی کے ساتھ اپنی اپنی لپی میں چھاپ کر شایع کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آمیزے سے قلی قطب شاہ کی زبان میں جو لوچ پیدا ہوگیا ہے وہ اسی کا حق ہے۔ اس کے ایک مشہور وجدآفریں گیت سے اس کا اندازہ ہوگا کہ محمد قلی دکھنی پر کتنا حاوی تھا اور اس نے آسان دکھنی کو کس طرح عام فہم بنانے میں کامیابی حاصل کی ہوگی ؎

پیا باج پیالہ پیا جائے نا ۔۔۔ پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں ۔۔۔ کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے ۔۔۔ کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا[۱]

---

[۱] "کلیات محمد قلی قطب شاہ" غزلیات، غزل ۲۳

محمد قلی قطب شاہ کے دیوان سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کو اپنی ہندو رعایا کے تہواروں، خوشبوؤں اور نغموں سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کی نظموں میں مسلمانوں کے تہواروں، عید، بقرعید، عید میلاد، محرم وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہولی، دیوالی، دسہرہ، سب ہی پر خیال آفرینی کی گئی ہے اور قلم چلایا گیا ہے اور ان نظموں سے جن پر اس زمانے کے معاشرے میں کا پرتو پڑا ہے، یہ پتہ چلتا ہے کہ سولھویں صدی کے وسط میں گولکنڈہ حیدرآباد میں ہندوؤں مسلمانوں میں کتنا میل جول تھا۔ اپنے والد کی طرح محمد قلی نے بھی ایک ممتاز شاعر پٹامٹاکوی کو اپنی سلطنت کا تلنگی ملک الشعراء بنایا اور پائے تخت کے بعض ہندو شعرا نے جو دھارمک کو بتائیں لکھی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سرکاری ملازموں کو کتنی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔[۱]

محمد قلی قطب شاہ کے انتقال پر اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ اس کی پرداخت ایک بڑے ایرانی عالم میر مومن کی نگرانی میں ہوئی تھی اور وہ ایک اعتبار سے ایرانیت میں رنگا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے مختصر دوران حکومت میں تلنگی یا دکھنی کو کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن سلطان محمد کا عہد اس اعتبار سے قابل لحاظ ہے کہ اس نے اپنے پیشرووں

---

[۱] SHERWAN: SOME CULTURAL ASPECTS OF THE REIGN OF MUHAMMAD QUL QUTB SHAH, MEDIEVAL INDIA QUARTERLY ALIGARH, APRIL 1958.

کے تخت پر جلوس فرما ہوا۔ وہ بھی اپنے آباد اجداد کی طرح ایک علم دوست بادشاہ ثابت ہوا۔ اور اپنے علم و ہنر، پاکیزہ اخلاق، اعلیٰ کردار اور مذہب پرستی کی بدولت کافی شہرت حاصل کی۔ سلطان محمد کا مزاج و کردار محمد قلی کے مقابلے میں قدرے مختلف تھا۔ محمد قلی کو فنون لطیفہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ عورت، شعر، شراب اور راگ رنگ کا دلدادہ تھا جبکہ محمد قطب شاہ کو فنون لطیفہ سے کہیں زیادہ مذہبی علوم، فلسفہ اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے زیادہ وہ علم و فضل کا قدردان تھا۔ کتابیں جمع کرنے اور ان پر اپنی رائے لکھنے، یا دستخط ثبت کرنے کا اس کو بڑا شوق تھا۔ چنانچہ اس کے شاہی کتب خانے میں، الہیات، تواریخ اور فلسفہ و حکمت کی متعدد بیش قیمت کتابیں موجود تھیں۔ اس نے اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو مرتب کرکے اس پر ایک طویل اور بسیط منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس کا اردو دیوان ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد قطب شاہ کو اردو سے زیادہ عربی و فارسی زبان سے دلچسپی تھی، شاید اسی لئے اس کے عہد میں عربی و فارسی کے متعدد علماء و فضلا کی سرپرستی کی گئی اور ان زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن اس کے برعکس دکنی کے نامور شعراء ملا وجہی اور ملا غواصی گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور کوشش کے باوجود انہیں دربار شاہی میں رسائی حاصل نہ ہو سکی۔

سلطان محمد کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں مکہ مسجد کی تاسیس اس کا اہم کارنامہ ہے۔ اگرچہ کہ یہ مسجد کئی پشتوں کے بعد مکمل ہوئی لیکن اس کا سنگ بنیاد محمد قطب شاہ ہی نے رکھا تھا۔ محمد قطب شاہ نے کئی محل بھی تعمیر کروائے تھے، جن میں سے "امان محل" اپنی وسعت و زیبائش کے اعتبار سے کافی مشہور تھا۔

کی طرح اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی کوشش نہیں کی اور سوائے ایک مہم کے جو اسے اپنے والد سے گویا ورثے میں ملی تھی کوئی دوسری مہم سر نہیں کی۔ وہ ایک بڑا کتاب شناس تھا اور اس کے کتاب خانے کی جو کتابیں اس وقت ہندستان اور بیرون ہند کے کتاب خانوں میں بکھری ہوئی ہیں ان سے اس کی علم دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ ان پر اس کے وسیع کتاب خانے کی مہر کتاب کا نشان اندراج اور مصنف کے مختصر حالات ہی نہیں بلکہ بعض کتابوں پر تو خود بادشاہ کے اپنے ہاتھ کے کیے ہوئے اندراجات بھی ہیں جن میں کتاب کی اہمیت اور اس کے ملخص بھی شامل ہیں[۱]

سلطان محمد کے انتقال پر اس کا بیٹا عبد اللہ اپنی نوعمری میں قطب شاہی تخت پر بیٹھا۔ اس کے طویل عہدِ حکومت میں تلنگی، دکھنی اور فارسی کو مساویانہ ترقی ہوئی اور سلطان محمد کے زمانے میں تلنگی اور دکھنی پر سکتے کی سی جو کیفیت طاری ہو گئی تھی اس سے آزاد ہو کر ان دونوں زبانوں کو فروغ پہنچا۔ اس کے عہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں پہلے سے بھی زیادہ میل ملاپ ہو گیا۔ ہندوانی رسم و رواج مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں داخل ہو گئے تو ہندوؤں نے مسلمانوں کی بعض روایات کو اپنا لیا۔ امام حسن رضؓ اور امام حسینؓ کی شہادت، کربلا کے واقعات، خدا کے حضور میں ان دونوں کے رتبے جنت کے مناظر، یہ سب اور ایسے ہی دوسرے

---

[۱] مثال کے طور پر "مجموعہ رسائل تصوف" مخطوطہ سالار جنگ، حیدرآباد، تصوف، ۱۵۸

قصّے، مقامی اثرات اور مقامی جذبات کے تحت اضافے اور ترمیمات کے ساتھ تلگو گیتوں میں پرو دیے گئے اور انھیں آج بھی رایل سیما اور آندھرا پردیش کے دوسرے علاقوں میں کسان اپنا ہل چلاتے ہوئے، کمہار اپنا چاک پھراتے ہوئے، جولاہا اپنا کپڑا بنتے ہوئے گاتا ہے۔ یہ گیت چونکہ مقامی سانچوں میں ڈھالے گئے ہیں اس لئے واقعات کی اجنبیت ختم ہو جاتی ہے اور کسان ہو یا جولاہا یا کمہار، اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان گیتوں کے ہیرو باہر کے کسی دیس کے رہنے والے تھے۔[1]

عبد اللہ خود دکھنی زبان میں شعر کہتا تھا اور اس کے عہد میں وجہی، غواصی اور دوسرے ممتاز شعراء اور نثر نگاروں نے دکھنی کو فروغ پہنچایا۔ ملا غواصی نے اپنی مثنوی "سیف الملوک وبدیع الجمال" میں بہت سے ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ بعض مرتبہ تو فارسی اور عربی الفاظ کو چھوڑ کر ہندی الفاظ پر اکتفا کی ہے، اور جہاں عربی الفاظ استعمال کئے ہیں وہاں ان کا املا بول چال کے تلفظ کے مطابق بدل دیا ہے۔ مثلاً وہ نفع کو نفا، واقعے کو واقا، معنے کو مانا لکھتا ہے اور اس طرح آج کل کے "ترقی پسند" ادیبوں کی پیش بندی کرتا ہے۔ اس کی کتاب "طوطی نامہ" کا ماخذ سنسکرت زبان کی ایک قدیم کتاب "شکاسپ تتی" کا فارسی ترجمہ ہے اور یہ امر خالی از دلچسپی

---

[1] RAMA RAO MUHRRAM FOLK - SONGS IN TELUG, HYDERABAD nd.

نہ ہوگا کہ اس کی ابتداء میں خدا تعالیٰ کو "نرنجن" کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور جب عبداللہ قطب شاہ کا ذکر آیا ہے وہ اسے "مہاراج" کہتا ہے۔

قطب شاہی سلطنت میں ہندو مسلمانوں کے میل جول سے جس کلچر کا نشو و نما ہوا، وہ اپنی پوری تابناکی کے ساتھ اس خاندان کے آخری فرمانروا ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں رونما ہوئی۔ ابوالحسن نے اپنی تخت نشینی کے چند ہی مہینے بعد ورنگل کے ایک برہمن مادنا کو (جو پہلے ہی سے ایک ذمہ دار خدمت پر مامور تھا) میر جملہ یا وزیر اعظم کی خدمت پر مامور کیا اور اس کے بڑے بھائی اکنا کو سلطنت کا سپہ سالار مقرر کیا۔ مادنا نے ملکی کاروبار پر پوری طرح حاوی ہونے کے لئے جگہ جگہ اپنے آوردوں اور عزیزوں کا تقرر کیا اور بعض سر برآوردہ مسلمانوں کو بھی خطابوں اور مالی ترقیوں سے نوازا۔ ابوالحسن کے زمانے میں قطب شاہی سلطنت شمال میں سریکاکولم (چکاکول) سے لے کر مدراس سے چند میل جنوب تک پھیلی ہوئی تھی اور نئے عہدہ داروں میں اچھے بھی تھے برے بھی، وفادار بھی اور بے وفا بھی۔ مدراس کے قریب پونا ملی کے صاحب ضلع لنگپا نے مدراس کے انگریزوں کے گویا دانت کھٹے کر دیئے تھے اور جب اکنا بیجاپور میں قطب شاہی سفیر اور ریزیڈنٹ مقرر ہوا

سلہ دیکھئے مثنوی "سیف الملوک وبدیع الجمال" و "طوطی نامہ" مقدمات۔ از سعادت علی رضوی، حیدرآباد ۱۳۵۷ھ

تو اس نے بھی ملک و مالک کے ساتھ کمال وفاداری دکھائی۔ مادنا نے اپنے بھتیجے گوپنا کو ضلع کھمم کی تحصیل بھدراچلم کا عامل مقرر کیا۔ گوپنا کو شری رام چندرجی سے بڑی عقیدت تھی، چنانچہ اس نے تحصیل کی آمدنی کو بجائے پائے تخت روانہ کرنے کے اسے رام چندرجی کے نام کا ایک بڑا مندر تعمیر کرنے میں صرف کر دیا۔ اور بادشاہ نے جواب طلب کیا تو اس نے اپنے قصور کو تسلیم کر لیا۔ اس پر بادشاہ نے اسے قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کر دیا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز رات کے وقت شری رام چندرجی اور شری لکشمن جی بادشاہ کے پاس آئے اور جتنا سرکاری روپیہ گوپنا نے بھدراچلم مندر کی تعمیر میں لگایا تھا وہ سب بادشاہ کے حوالے کر کے غائب ہو گئے بادشاہ پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا اور نہ صرف یہ کہ اس نے گوپنا کو قید سے رہا کر دیا بلکہ اس کا معتقد ہو گیا۔ گوپنا کو عوام اب رام داس کہنے لگے اور اسی نام سے وہ دھارمک حلقوں میں مشہور ہے۔

دکھنی کلچر کی بے شمار مثالیں ابوالحسن کے عہد میں نظر آتی ہیں اور زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں ہندو اور مسلمان دوش بدوش ملک کی خدمت نہ کرتے ہوں۔ ابوالحسن کا زمانہ شیواجی کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب شیواجی نے جنوبی ہند کی طرف نظر ڈالی اور اپنے سوتیلے بھائی ویانکوجی کو نیچا دکھلانے اور اپنی آبائی جاگیر پر قبضہ کرنے کی ٹھانی تو وہ ابوالحسن سے مدد کا طالب ہوا۔ اس نے اپنے حیدرآباد آنے سے پہلے اس کا انتظام کیا کہ اس کا ایک آوردہ رگوناتھ ہنومنتے حیدرآباد جائے اور وہاں کے سیاسی میدان کو اس کے لئے ہموار کرے۔ مادنا کی موجودگی میں اسے اس میں کچھ زیادہ وقت

محسوس نہیں ہوئی اور جب اس نے بادشاہ سے باریابی کی درخواست کی تو اس کی درخواست فوراً منظور ہو گئی۔ روایت ہے کہ ہنو منتے کئی گھنٹے بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہا اور اس دوران میں بادشاہ سے برابر فارسی زبان میں گفتگو کرتا رہا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف دربار کی طرف سے عوامی زبانوں یعنی دکنی اور تلنگی کی سرپرستی کی جارہی تھی تو دوسری جانب قطب شاہی سلطنت کی سرکاری زبان یعنی فارسی کا دائرہ عمل دور دور تک پھیلتا جارہا تھا۔[۱]

---

[۱] SHERWANI : "REIGN OF ABU-L-HASAN QUTB SHAH" JOURNAL OF INDIAN HISTORY DECEMBER 1968-

پروفیسر سید محمد

قطب شاہی عہد کے چند بزرگانِ دین

شہر حیدرآباد کی خاک میں صدہا بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ آسودہ ہیں۔ اس شہر کو آباد ہوئے پونے چار سو برس سے زیادہ نہیں گزرے۔ لیکن اس عرصہ میں یہاں مختلف اوقات اور مختلف حکومتوں کے دوران میں عرب اور عجم کے علاقوں سے سینکڑوں ہی اولیاء اللہ آئے اور اپنے پاکیزہ کردار اور ریاضت و عبادت سے دین اسلام کی خاموش تبلیغ کی۔ صوفیائے کرام کے کم و بیش تمام سلسلوں کے بزرگ اس سرزمین پر رونق افروز ہوئے اور اپنے طریقۂ رشد و ہدایت کو جاری کیا۔ آج ان مختلف خانوادوں کے ماننے والے اور ان کے طریقوں کے مالک اس شہر میں موجود ہیں۔

یہی بزرگانِ دین ہندستان کے اس بڑے شہر میں اسلامی تعلیم کے پھیلانے والے اور توحید و رسالت کا پیام پہنچانے والے تھے۔ آج بھی حیدرآباد کی اسلامی روایات ان ہی کے نام لیواؤں کے ذریعہ زندہ ہیں۔

اس سرزمین کو سب سے پہلے جس بابرکت ہستی کے مبارک قدموں کا شرف حاصل ہوا۔ وہ حضرت بابا شرف الدین صاحب قبلہؒ کی ہے۔ آپ یہاں اٹھی وقت

تشریف لائے جبکہ یہاں کسی قسم کے اسلامی آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ سرزمین دکن پر تلنگانہ کے راجا حکمران تھے۔ نہ بہمنی سلطنت قائم ہوئی تھی نہ قطب شاہی سلطنت کے قیام کا کوئی تصور تھا۔ حیدرآباد کے شہر کے بسنے کا تصور تو کسی کے دماغ میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ ہمارا یہ وسیع شہر آج جس قطعہ اراضی پر آباد ہے، وہ ایک بڑا جنگل اور چند چھوٹے چھوٹے زرعی مواضعات سے زیادہ نہ تھا۔

حضرت بابا شرف الدین صاحب قبلہؒ کے حالات جہاں تک معتبر تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں، یہ ہیں کہ آپ ۵۸۵ھ ہجری میں عراق عرب میں پیدا ہوئے۔ شہر بغداد میں آپ نے تعلیم و تربیت پائی۔ علوم شرعی میں دستار فضیلت حاصل کرنے کے بعد آپ نے شیخ وقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے ہاتھ پر جو آپ کے استاد بھی تھے بیعت کی پھر اپنے مرشد کے حکم سے آپ نے ترک وطن کا ارادہ فرمایا اور ان کی ہدایت کے مطابق ۶۳۱ھ میں ہندستان تشریف لائے اور نو برس تک ہندستان کے مختلف شہروں اور بستیوں کی سیاحت کرتے ہوئے ۶۴۰ھ م ۱۲۴۲ء میں اپنے قدوم میمنت لزوم سے دکن کی سرزمین کو افتخار بخشا آپ نے اپنے قیام کے لئے ایک بلند پہاڑی کو منتخب فرمایا، جو آج آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ساتھ ستر اہل اللہ اور فقراء تھے، جو آپ کے خاص مرید تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے کئی بھائی بھی تھے جن میں سے ایک حضرت بابا شہاب الدینؒ ہیں جن کا مزار شمس آباد کے قریب ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہے اور یہ پہاڑی آج آپ ہی کے نام سے موسوم ہے اور وہاں آپ کی درگاہ زیارت خاص و عام ہے۔ آپ کے ایک اور بھائی حضرت بابا فخرالدینؒ

بیان کئے جاتے ہیں۔ آپ کا مزار حیدرآباد کی دوسری سمت میں محلہ درگاہ حضرت حسین شاہ ولی رح سے کچھ فاصلہ پر ایک بلند پہاڑی پر ہے۔ اگرچہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں۔ راستہ نہایت دشوار گذار ہے پھر بھی آپ کا مزار اطراف وجوانب کے عقیدت مندوں کی بڑی زیارت گاہ ہے اور خاص طور پر سال میں ایک بار عرس کے موقع پر خاصی تعداد میں لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ غرض یہ کہ جو وسیع علاقہ شہر حیدرآباد کے لئے کئی صدیوں کے بعد منتخب ہونے والا تھا۔ اس کے اطراف کی پہاڑیوں پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان اہل اللہ نے سکونت اختیار کر کے اپنے رشد وہدایات کی کرنیں اس سرزمین پر پھیلائیں۔ ان کے پاکیزہ کردار، ان کی خاموش عبادت وریاضت، ان کے روحانی کمالات اور خلق خدا کے ساتھ ان کی بے پناہ ہمدردیوں نے انھیں مرجع خلائق بنا دیا۔

حضرت بابا شرف الدین صاحب قبلہ رح نے (۳۷) برس تک اپنی روحانی تعلیم سے اس سرزمین کے رہنے والوں کو فیض یاب فرما کر ۲۰/شعبان ۶۸۷ھ کو انتقال فرمایا اور اسی پہاڑی پر آسودہ ہوئے جہاں آپ کا عرس ہر سال شعبان کی ۲۰/تاریخ کو منایا جاتا ہے اور حیدرآباد اور اس کے اطراف کے دیہات وقصبات کے ہزاروں باشندے کیا ہندو کیا مسلمان سب یکساں عقیدت سے آپ کے مزار پر انوار پر حاضری دیتے ہیں ساڑھے سات سو سال کے طویل عرصہ سے آپ کا دریائے فیض برابر جاری ہے۔

آپ کے وصال کے چار سال بعد آپ کے بھائی حضرت بابا شہاب الدین صاحب قبلہ رح نے بھی ۶۹۱ھ میں وصال فرمایا اور آپ کا مزار مبارک بھی اسی طرح اس پہاڑی پر بنا جہاں آپ فروکش تھے۔ ان مبارک ہستیوں نے اس سرزمین پر

جو شمع ہدایت روشن کی تھی وہ نہ صرف برابر جلتی رہی بلکہ بادِ مخالف کے تند اور تیز جھونکوں کے باوجود بھی اس کی روشنی میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور ان سے ہزاروں نورانی شمعیں روشن ہوتی گئیں ۔

حضرت بابا صاحب قبلہ رح اور آپ کے رفقاء کے بعد تاریخ میں جن بزرگ ہستی کا ذکر ملتا ہے وہ حضرت شاہ چراغ رح کا ہے آپ کا زمانہ سلطنت قطب شاہی کے قیام کا ابتدائی زمانہ ہے ۔ ابھی شہر حیدرآباد کے بسنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا تھا کہ آپ نجف اشرف سے یہاں تشریف لائے ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو حضرت علی رض نے عالم رویا میں دکن کی طرف جانے کا حکم دیا ۔ آپ نے یہاں آنے کے بعد اس مقام پر قیام فرمایا جہاں اس وقت دائرہ میر مومن رح واقع ہے ۔ یہاں ایک گاؤں آباد تھا جو چچلم کے نام سے موسوم تھا اور یہاں زیادہ تر برہمن رہتے تھے ۔ اطراف میں جھاڑیاں اور جنگل تھا آپ نے جس جگہ قیام فرمایا وہ اس سڑک کے کنارہ تھا جو سیکاکول اور راجمندری وغیرہ کو جاتی تھی ۔ اس وقت تک مسلمانوں کا اس طرف گذر نہیں ہوا تھا ۔ برہمنوں نے شاہ صاحب کی متوکلانہ زندگی اور آپ کے تصرفات کو دیکھ کر نہ صرف یہ کہ آپ کے رہنے کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ رفتہ رفتہ آپ کے معتقد ہوتے گئے اور آپ کی قیام گاہ سر راہ ایک تکیہ بن گئی جہاں دیورکنڈہ ، نلگنڈہ راجمندری وغیرہ آنے جانے والے مسافر دم لینے لگے اور خاص طور پر مسلمان مسافروں کے لئے ایک منزل گاہ کا کام دینے لگی ۔ کچھ دنوں کے بعد چند مسلمان مستقل طور پر شاہ صاحب کے یہاں رہنے لگے ۔ اور ایک چھوٹی سی مسلمان بستی سی بن گئی ۔ جب آپ کے وصال کا وقت آیا تو آپ نے اپنے ایک خاص مرید کو وصیت فرمائی کہ میری

وفات پر میری تجہیز و تکفین میں جلدی نہ کرنا۔ بلکہ ایک سوداگر کا انتظار کرنا۔ وہ تمام ضروری اسباب لے کر آئے گا۔ اور میری تجہیز و تکفین کر دے گا۔ کیونکہ جناب امیرالمومنین علیؓ نے مجھے اس کی بشارت دے دی ہے۔ چنانچہ جب آپ کا وصال ہوگیا تو لوگوں نے وصیت کے مطابق انتظار کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شتر سوار تجہیز و تکفین کا سامان لئے ہوئے نمودار ہوا اور آپ کی تدفین کے بعد دوسرے روز علی الصباح چلا گیا۔ شاہ صاحب کو ان کی وصیت کے مطابق اس جگہ دفن کیا گیا جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔ آپ کا مزار چندہی دنوں میں مسلمانوں کے لئے زیارت گاہ بن گیا اور یہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھنے لگی۔

کچھ دنوں کے بعد ایک اور بزرگ جن کا نام نامی سید نورالہدیٰ تھا چند سادات کے ساتھ آکر یہیں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ کی آمد سے یہ مقام پہلے سے زیادہ آباد ہوگیا۔ ایک تو مسافروں کی گزر گاہ اور دوسرے اہل اللہ کا تکیہ۔ اس مقام کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور یہ مقام آئندہ بسنے والے شہر حیدرآباد کا نقطہ آغاز بن گیا۔ حضرت سید نورالہدیٰ نے اپنے وصال سے پہلے اپنے مریدوں کو یہ وصیت فرمائی کہ مجھے غسل دے کر اور کفن پہنا کر منتظر رہیں۔ یہاں تک کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے بجلی کی سرعت سے آئے گا اور مجھے دفن کر جائے گا۔ کوئی اس سے کچھ نہ پوچھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایک سوار آیا۔ اور زمین پر ہاتھ رکھ کر ایک بنی بنائی قبر برآمد کی۔ اور اس میں حضرت نورالہدیٰ کی نعش کو اتار کر فاتحہ پڑھی اور روانہ ہوگیا۔

جب محمد قلی قطب شاہ کے مبارک دور میں شہر حیدرآباد آباد ہوا تو بیرون سلطنت حضرت میر مومن صاحبؒ نے اسی مقام کو اس نئے شہر کے لئے قبرستان کر دئے

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ترتیب و تزئین : راحت سلطانہ، ام۔ اے

پہلی بار : جون ۱۹۸۱ء

قیمت : پچیس روپے (Rs 25/-)

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد

سرورق : غوث محمد خاں

ناشر : الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد

○

ملنے کے پتے

الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی

ایجوکیشنل بک ہوز، علی گڈھ

انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راوز ایوینو۔ نئی دہلی۔

سلطان محمد کے بعد عبداللہ قطب شاہ ۱۶۲۶ء میں تخت نشین ہوا۔
سلطان عبداللہ کا عہد حکومت (۱۶۲۶-۱۶۷۲ء) قطب شاہی سلاطین میں سب سے زیادہ طویل تھا۔ اس نے (۴۶) سال تک حکومت کی۔ عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا محمد قلی کی طرح عیش پسند، طرب و نشاط کا رسیا اور علم و ہنر کا قدردان تھا، وہ خود بھی اردو میں شعر کہتا تھا اس کا اردو دیوان چھپ چکا ہے۔ اس نے محمد قلی کی قائم کردہ تمام ادبی اور تہذیبی روایات کو از سر نو جلا بخشی۔ وہ شاعر اور فن کار جو سلطان محمد کے عہد میں دلگیر اور مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے ان کو دوبارہ منظر عام پر آنے کا موقع ملا۔ عبداللہ قطب شاہ نے عہد محمد قلی کے ملک الشعراء ملا وجہی کو شرف باریابی بخشا، اور اس سے اردو کی شہکار تصنیف "سب رس" لکھوائی۔

وجہی اور غواصی کے علاوہ سلطان عہد کے دوسرے نامور شاعروں میں ابن نشاطی کا نام قابل ذکر ہے جس نے ۱۶۵۵ء میں قدیم اردو کی ایک بے مثال مثنوی "پھول بن" تصنیف کی۔

سلطان عبداللہ کے انتقال کے بعد ۱۶۷۲ء میں ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا۔ ابوالحسن، عبداللہ قطب شاہ کا داماد اور سلطنت گولکنڈہ کا آخری تاجدار تھا۔ اس بادشاہ کے عہد حکومت میں مرہٹوں اور مغلوں کی یورش کی وجہ سے گولکنڈہ میں بے اطمینانی اور انتشار پیدا ہو گیا تھا دکن کی سیاسی تاریخ کے ایسے نازک ترین دور میں شاہ ابوالحسن نے اپنی حکمت عملی اور تدبر کی وجہ سے ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ایک صوفی منش اللہ ترس انسان تھا۔ اس کو اپنے عہد کے ایک بزرگ اور صوفی حضرت شاہ راجو قتال سے بیعت و عقیدت تھی اس نے اپنی اخلاقی جرأت، صداقت پسندی اور شرافت نفس

انتخاب فرمایا۔ کربلائے معلیٰ سے مٹی منگوا کر یہاں بکھیر دی اور خود اپنے اور اپنے خاندان کے لیے ایک مقبرہ یہیں تعمیر کیا۔ آپ نہ صرف ایک بڑے امیر سلطنت کے مشیر اور پیشوا تھے بلکہ بڑے صاحب دل اور باکرامت بزرگ تھے۔ آپ کی درگاہ بھی مرجع خلائق ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب آپ کے معتقد ہیں ہر سال ۲۶/ شعبان کو آپ کا عرس بہت اہتمام سے ہوتا ہے۔ شاہان قطب شاہیہ اور شاہان آصفیہ کو آپ سے اس قدر عقیدت تھی کہ ان کی جانب سے روزانہ درگاہ میں چراغ روشن کرنے کے لیے گھی اور تیل کا معمول مقرر تھا۔ عود اور گل کے لیے ایک بڑی جاگیر وقف تھی۔ آپ کا انتقال ۱۰۳۵ھ میں ہوا اور آپ اس مقبرہ کے بالائی گوشہ میں دفن کئے گئے جو آپ نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے بیچوں بیچ آپ کے صاحبزادے حضرت میر مجد الدینؒ کی قبر ہے۔ آپ اپنے والد کی زندگی ہی میں فوت ہوئے تھے۔ شفقت پدری نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے لیے جو جگہ رکھی تھی وہ میں بیٹے کو دفن کر دیا۔ اس دور کے دوسرے بڑے بزرگ حضرت سید حسین شاہ ولی صاحب قبلہؒ ہیں۔ آپ حضرت خواجہ بندہ نواز رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں آپ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں وارد گولکنڈہ ہوئے۔ بادشاہ نے آپ کی تشریف آوری کی خبر سنتے ہی اپنے وزیروں اور امیروں کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ وہ نہایت اعزاز و اکرام سے آپ کو بادشاہ کے [illegible] دربار میں لے آئے بادشاہ عقیدت کے ساتھ آپ سے ملا اور آپ کو دس ہزار فوج کا سپاہ سالار اور ریاست کے صیغہ تعمیرات کا معتمد مقرر کیا۔ نیز اپنی دختر نیک اختر کو آپ کے نکاح میں دیا۔

آپ ہی کی نگرانی میں حسین ساگر تعمیر ہوا جس کا اصلی نام ابراہیم ساگر

تھا۔ مگر وہ آپ کے نام پر حسین ساگر مشہور ہوگیا۔ بادشاہ کی ایک لڑکی خیرت النساء بیگم کے نام پر خیریت آباد کی مسجد اور اس کا گنبد بھی آپ ہی کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔ آپ نے ابراہیم قطب شاہ کے بعد اس کے بیٹے محمد قلی اور پوتے محمد قطب شاہ کے زمانے میں بھی ریاست کی خدمت انجام دی۔ آپ کا وصال ۱۰۳۰ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار شہر حیدرآباد سے پانچ میل اور قلعہ گولکنڈہ سے دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں واقع ہے جو موضع درگاہ حضرت حسین شاہ ولی کہلاتا ہے مزار مبارک پر ایک عالیشان گنبد بنا ہوا ہے آپ کا مزار بھی مرجع خلائق ہے اور ہر سال جمادی الثانی کی تیرہ تاریخ کو آپ کا عرس بہت اہتمام سے ہوتا ہے۔ ہزاروں زائرین اطراف وجوانب سے زیارت کے لئے آتے ہیں۔ کم وبیش اسی زمانے میں ایک بڑے صاحب دل بزرگ ایران سے حیدرآباد تشریف لائے اور دروازہ علی آباد کے باہر قیام فرمایا۔ آپ کا نام بھی میر مومن تھا۔ آپ کے ساتھ چالیس یا ساٹھ مرید تھے۔ آپ بڑے صاحب باطن درویش اور بلند پایہ فقیر تھے۔ ہمیشہ یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے اس وجہ سے حضرت "مومن چپ صاحب" کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ چشتیہ طریق کے سالک تھے۔ آپ نے ۱۰۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ اور اس جگہ مدفون ہوئے جہاں آپ فروکش تھے۔ آپ کا مزار جو بیرون بلدہ محلہ علی آباد میں ہے۔ زیارت گاہ خاص وعام ہے اور ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

محمد قلی کے عہد حکومت میں حضرت پیر غوث الاعظم کی اولاد میں ایک بزرگ جن کا نام سید میراں حسین الحموی عرف شاہ ابدال ہے۔ گولکنڈہ

تشریف لائے اور قلعہ کے قریب ایک مسجد میں فروکش ہوئے۔ آپ کے ہمراہ ایک سو فقیر تھے۔ تین روز تک فقراء کو کوئی چیز میسر نہیں ہوئی فقر وفاقے کی حالت میں رہے۔ چوتھے روز محمد قلی اپنے ایک ملازم استقلال خاں کے ہمراہ پچاس خوان کھانے کے بھیجے۔ آپ نے کھانا فقراء میں تقسیم کردیا اور خوان واپس کردیے۔ جب خوانوں کو کھول کر دیکھا گیا تو کھانا جوں کا توں تھا۔ استقلال خاں آپ کی یہ کرامت دیکھ کر آپ کا معتقد ہوگیا۔ بادشاہ نے بھی بڑی عقیدت کا اظہار کیا۔ آپ نے معہ اپنے فقیروں کے ملکاپور (ملکپور) کے گاؤں میں سکونت اختیار فرمائی۔ ہر وقت ذکر شغل میں مصروف رہتے تھے۔ دنیا ومافیہا سے بہت کم تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ۱۰۴۹ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار گولکنڈہ کے قریب لنگرحوض کے کنارہ پر واقع ہے۔ آپ سلسلہ قادریہ کے پیر طریقت تھے۔

محلہ کاروان کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو شاہ شبلی کی پہاڑی کہلاتی ہے۔ اس پہاڑی پر قطب شاہی عہد میں ایک بزرگ حضرت شاہ زین الدین شبلی جو حضرت خواجہ ابوبکر عبداللہ شبلی رح کی اولاد میں تھے۔ تشریف فرما ہوئے۔ آپ بغداد سے تشریف لائے تھے بڑے صاحب جلال بزرگ تھے۔

آپ کی بیعت کا سلسلہ بھی حضرت غوث الاعظم رض سے ملتا ہے۔ آپ ایک عرصہ تک اسی پہاڑی پر فروکش رہے۔ وہیں آپ نے انتقال فرمایا اور وہیں آپ کا مزار مبارک آج بھی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ آپ کا سن وفات ۱۰۵۰ھ ہے۔ ہر سال صفر کی تیسری تاریخ کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

حضرت بودے شاہ صاحب رح جن کا مزار بیرون شہر پناہ محلہ عثمان پورہ میں واقع ہے۔ قطب شاہی عہد کے ایک بڑے صاحب کرامت بزرگ ہیں آپ کا نام اصل میں سید بہبود علی شاہ تھا جو عوام کی زبان پر بگڑ کر بودلے شاہ ہو گیا۔ آپ اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد گھوڑوں کے سوداگر تھے۔ باپ کی وفات کے بعد سارا مال و اسباب راہ خدا میں خیرات کر کے حضرت سید شاہ امین الدین اعلیٰ رحمتہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک مدت تک چلہ کشی کی اور فقر و ریاضت میں درجہ کمال حاصل کیا۔ آپ اکثر جذب کی حالت میں رہتے تھے عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں آپ حیدرآباد تشریف لائے اور شہر پناہ کے باہر ایک گذرگاہ پر بیٹھ گئے۔ شہر کا چھوٹا دروازہ جو آپ کے قیام گاہ کے قریب تھا۔ آپ ہی کے نام پر "بودے شاہ کی کھڑکی" مشہور ہو گیا ایک مرتبہ عبداللہ قطب شاہ کا ہاتھی مست ہو کر لوگوں کو روندتا ہوا نکل گیا اور وہاں پہنچا جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔ لوگ یہ دیکھ کر بہت خائف ہوئے اور حضرت کو وہاں سے اٹھ جانے کے لئے بہت کہا مگر آپ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ جب ہاتھی آپ کے پاس آیا تو بجائے مستی کے بالکل خاموش ہو کر اپنی سونڈ آپ کے پاؤں پر ملنے لگا۔ حضرت نے اس کی سونڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا بس اپنے ٹھکانے چلا جا مستی نہ کر۔ اسی وقت وہ ہاتھی چپ چاپ اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت کے فقر و کرامت سے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور بڑی عقیدت ظاہر کرنے لگے۔ آپ نے سنہ ۱۰۶۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار اسی مقام پر ہے جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔

مٹی کی ایک بہت بڑی قبر ہے جس پر صرف چوکھنڈی بنی ہوئی ہے۔ قریب میں ایک پختہ مگر مختصر مکان ہے۔ ہر سال آپ کا عرس ربیع الثانی کے مہینے میں ہوتا ہے۔ آپ کے مزار کے اطراف ایک بڑا قبرستان بن گیا ہے جس میں کئی بزرگانِ دین آسودہ ہیں۔

شہر حیدرآباد سے چار میل کے فاصلہ پر ایک گاوں "پیرلاگوڑہ" کے نام سے آباد ہے یہاں ایک بزرگ کا مزار پر انوار ہے۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری اپنی تاریخ اولیائے دکن میں لکھتے ہیں کہ یہ مزار حضرت شاہ عبدالرزاق ثانیؒ کا ہے۔ آپ بارہ برس کی عمر میں علوم ظاہری و باطنی میں بہرہ کامل حاصل کرکے بغداد سے حیدرآباد تشریف لائے۔ اور موضع پیرلاگوڑہ میں ایک غار میں بارہ برس تک گوشہ نشین رہے۔ پھر بغداد گئے اور وہاں اپنے چچا کی لڑکی سے عقد کیا پھر حیدرآباد آئے۔ یہاں قطب شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے بھی عقد کیا۔ شہزادی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ البتہ پہلی بیوی سے ایک فرزند جن کا اسم گرامی شاہ عبدالقادر ثانی ہے آپ کی یادگار ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالرزاقؒ کی وفات ۱۰۶۱ھ میں بیان کی جاتی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حضرت صوفی سرمدؒ کے ایک مرید خلیفہ دلّی سے حیدرآباد آئے اور اپنے کشف وکرامات کے لئے وہ شہرت حاصل کی کہ نہ صرف قطب شاہی بلکہ آصف جاہی خاندان کے بادشاہ اور امراء بھی ہمیشہ کے لئے آپ کے معتقد ہو گئے۔ یہ حضرت برہنہ شاہ صاحبؒ ہیں۔ آپ کا اصلی نام سید حسن شاہ تھا۔ اور وطن آپ کا عراق وعجم ہے۔ وہاں سے دلّی آئے اور حضرت صوفی کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ فوراً جذب کامل آپ کے اندر پیدا ہوا اور آپ نے لباس ظاہری ترک کردیا اور برہنہ ہو گئے۔ حیدرآباد میں

آپ پھسلبنڈہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہاں صرف چند جھونپڑیاں تھیں۔ عبد اللہ قطب شاہ کے ایک امیر مالک پرست خاں نے آپ کی کرامات دیکھ کر آپ سے بڑی عقیدت ظاہر کی۔ بادشاہ بھی اولاد نرینہ کے لئے آپ سے رجوع ہوا۔ مگر اس کی قسمت میں نہیں لکھی تھی۔ وہ محروم رہا۔ آپ مجذوب کامل اور بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ۱۶/ جمادی الثانی ۱۰۶۴ھ کو آپ نے وصال فرمایا اس جگہ دفن ہوئے جہاں آپ تشریف رکھتے تھے۔ مالک پرست خاں نے ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کروا دیا۔ اس کا خاندان بھی آپ ہی کے پائنتی دفن ہے آپ کے مقبرہ کے اطراف آصفجاہی خاندان کے مرشد زادوں اور صاحبزادوں کی قبریں خاصی تعداد میں ہیں۔ امرائے پائیگاہ کی قبریں بھی اسی علاقہ میں ہیں کیونکہ وہ بھی آپ سے کمال عقیدت رکھتے تھے۔ ہر سال آپ کا عرس تزک و احتشام سے ہوتا ہے

عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک سید صحیح النسب حضرت سید شاہ میراں رح سواروں کے جمعدار تھے۔ سرکاری کاموں میں آپ کی دیانت و امانت بہت مشہور تھی۔ بادشاہ نے آپ کی لیاقت اور دیانت کے مدنظر آپ کو اپنا معتمد علیہ بنایا اور ایک اہم موقع پر اپنا سفیر بناکر عادل شاہ کے دربار میں بیجاپور روانہ کیا۔ چند روز وہاں رہ کر سرکاری کام خوش اسلوبی سے انجام دیا اور عادل شاہ سے اجازت لے کر حیدرآباد آنے والے تھے کہ معلوم ہوا کہ حضرت سید شاہ امین الدین اعلیٰ رح چلہ کشی کے حجرہ سے برآمد ہوئے ہیں اور خلائق کثرت سے آپ کی زیارت کے لئے جاری ہے۔ یہ بھی حضرت کے دیدار سے مشرف ہونے کے لئے حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت کی نظر کیمیا

اثر نے آپ کو چشم زدن میں اعلیٰ مدارج روحانی پر فائز کر دیا۔ حضرت امین الدین اعلیٰؒ آپ کا ہاتھ پکڑ کر حجرے میں لے گئے اور چند گھنٹوں کے بعد دونوں جب برآمد ہوئے تو حضرت نے فرمایا جو امین الدین تھا وہ میراں ہوا اور جو میراں تھا وہ امین الدین ہوا۔ حضرت شاہ میراں کو میراں جی خدانما کا خطاب عطا ہوا۔ چند روز مرشد کی خدمت میں رہے پھر خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور حیدرآباد جانے کا حکم دیا گیا۔ حیدرآباد آکر میراں جی نے سرکاری ملازمت سے علحدگی اختیار کی اور یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

لوگ کثرت سے آپ سے فیض یاب ہونے لگے۔ آپ کی روحانی تعلیم کے دور دور تک چرچے ہونے لگے آپ نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے فائدہ کے لئے دکنی زبان میں کئی صوفیانہ رسالے تصنیف فرمائے ہیں۔ جن میں سے رسالہ "وجودیہ" رسالہ "قربیہ" بہت مشہور ہیں۔ آپ نے سنہ ۱۰۰۰ھ ۱۸/ جمادی الاول کو وصال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک محلہ مستعدپورہ کے قریب واقع ہے۔ اس مقام کا ایک زمانے میں عبداللہ پور نام تھا۔ لیکن اب یہ نام بالکل گمنام ہے۔ آپ کا بھی عرس ہر سال ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی اولاد میں حضرت سید حسین شاہؒ کے بعد دو اور بزرگ حیدرآباد میں اپنے فیض روحانی اور کشف و کرامت کے اعتبار سے بہت مشہور ہوئے اور ان دونوں کا تعلق بھی قطب شاہی عہد سے ہے ایک حضرت سید اکبر حسینیؒ ہیں جن کا گنبد بیرون شہر غازی بنڈہ کے دروازہ کے قریب ہے۔ آپ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گذرے ہیں۔ تمام عمر گوشۂ قناعت میں بسر کی۔ کبھی بادشاہ یا امراء کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہمیشہ یادِ الٰہی

میں مستغرق رہے۔ آپ کے سجادہ اور جانشین آپ کے بھتیجے حضرت سید شاہ راجو رح ہیں جن کا مزار بیرونی فتح دروازہ واقع ہے اور جن کا عالی شان اور بہت ہی بلند گنبد سارے حیدرآباد میں اپنی رفعت اور عظمت کے لئے مشہور ہے

حضرت سید شاہ راجو بیجاپور میں پیدا ہوئے رسن شعور کو پہونچنے کے بعد حیدرآباد اپنے چچا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ظاہری اور روحانی تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ پھر آپ سے خلافت حاصل کی اور آپ ہی کے خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ چچا کے وصال کے بعد آپ اس مقام پر منتقل ہو گئے جہاں اس وقت آپ کا گنبد ہے۔ آپ کی قیامگاہ پر فقراء کی بڑی تعداد ہر وقت مصروف ریاضت رہتی تھی۔ ابوالحسن تاناشاہ آخری فرمانروائے گولکنڈہ آپ کا مرید خاص تھا۔ اس کی شادی عبداللہ قطب شاہ کی تیسری بیٹی سے محض حضرت شاہ راجو رح کی کرامت کا نتیجہ تھی۔ اس شہزادی کی شادی سید سلطان نامی نوجوان سے قرار پا چکی تھی اور شادی کی تمام ابتدائی رسمیں مکمل ہو چکی تھیں کہ اچانک بادشاہ کا بڑا داماد اور بڑی بیٹی جن کی تحریک سے یہ نسبت ٹھیری تھی اس کے مخالف ہو گئے اور بادشاہ کو مجبور کر دیا کہ شہزادی کی شادی کسی طرح سید سلطان سے نہ ہونے پائے۔ ابوالحسن جو شاہی خاندان سے قرابت قریبہ رکھتا تھا فقیرانہ زندگی اختیار کئے ہوئے حضرت شاہ راجو رح کی خانقاہ میں رہتا تھا۔ بلحاظ رشتہ داری اس کی دلی تمنا تھی کہ شہزادی اس سے بیاہی جائے۔ حضرت شاہ راجو رح نے اس کی شادی کے بارے میں پیشن گوئی فرمادی تھی، نیز آپ نے اپنی خانقاہ میں ابوالحسن کی شادی کی تمام ابتدائی رسمیں بھی ایکطرفہ طور پر اس طرح ادا کرائیں جیسے کہ ابوالحسن کی سچ مچ شادی ہو رہی ہے۔ ادھر بادشاہ نے اپنی بیٹی اور داماد کے

اصرار پر سلطان کے ساتھ نکاح کر دینے کا ارادہ تاریخ عقد سے عین ایک روز قبل بدل دیا اور ابوالحسن کے ساتھ شادی کر دینے کا تصفیہ کیا۔ اس کی تلاش کروا کر اسے خانقاہ سے محل میں بھجایا گیا جہاں دوسرے روز اس کی شادی نہایت تزک و احتشام سے ہوگئی۔ ابوالحسن تاناشاہ نے اپنے زمانہ حکومت میں آپ کی خانقاہ کے مصارف کے لئے بیش مواجب علاقے نذر کئے۔ آپ کے فرزندوں سے اپنی لڑکیوں کی نسبت بھی کی۔ آپ نے ۱۰۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔ ابوالحسن نے آپ کے مزار پر وہ عالیشان گنبد تیار کروایا جو دیکھنے کے لائق ہے۔ گنبد کی تعمیر مکمل ہو چکی مگر اندر کی استرکاری باقی تھی کہ سلطنت قطب شاہیہ کو زوال آگیا اور یہ کمی آج تک باقی رہ گئی۔ حضرت شاہ راجو کی درگاہ مرجع خلائق ہے۔ ہر روز زائرین کثیر تعداد میں حاضر ہوتے ہیں۔ آصف جاہی خاندان کے بادشاہوں کو بھی آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ گنبد پر جو طلائی کلس ہے وہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ نے نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں لگایا تھا۔ اس طرح گنبد کے اندر لکڑی کی خوبصورت بارہ دری ناصر الدولہ نے بنوا کر لگائی۔ حضرت شاہ راجو کے علاوہ حضرت سید اکبر حسینی کے ایک اور خلیفہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔

یہ حضرت شاہ زندہ حسینی ہیں جو عام طور پر شاہ جھاڑو کے لقب سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ خانہ کعبہ کے جاروب کش تھے۔ اتفاق زمانہ آپ اور آپ کے چھوٹے بھائی دریائی سفر کر رہے تھے کہ جہاز غرقاب ہوگیا۔ آپ کے سارے ساتھی ڈوب گئے آپ ایک تختہ کی مدد سے اپنی جان بچا کر خشکی پر پہونچے اور برسوں جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتے گھامتے حیدرآباد آئے۔

اس وقت عبداللہ قطب شاہ مسند پر متمکن تھا۔ یہاں آپ نے حضرت سید اکبر حسینی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور فقر و ریاضت کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ ایک جھاڑو ہر وقت آپ کی بغل میں رہتی تھی۔ جہاں کوئی مسجد دیکھتے اس میں جھاڑو دیتے۔ خس و خاشاک سے اس کو صاف کر دیتے تھے۔ آپ بھی بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے اور بہت سے لوگ آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ آپ نے ۱۰۸۰ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار پنج محلہ کے سامنے شاہ علی بنڈہ جانے والی سڑک پر واقع ہے جہاں بڑ کا ایک بڑا درخت سایہ کئے ہوئے ہے۔

ابوالحسن تاناشاہ کے معاصر بزرگوں میں ایک نامور شخصیت حضرت شاہ میر محمود صاحب قبلہؒ کی بھی ہے جن کا مزار مبارک تالاب میر عالم کے کنارہ بڑی بلندی اور نہایت پرفضاء مقام پر واقع ہے۔ آپ رضوی سلسلہ کے سید ہیں آپ کا وطن اصلی نجف اشرف ہے جہاں آپ کے بزرگوں کو بڑا اعزاز و اکرام حاصل تھا۔ آب و دانہ کی کشش اور سیر و سیاحت کے ذوق نے آپ کو ہندوستان میں پہونچایا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے آپ بیدر پہونچے۔ یہاں آپ نے حضرت شاہ خلیل اللہ بت شکن نعمت اللہ کے سجادہ حضرت شمس الدین حسینی کے ہاتھ پر بیعت کی اور تین سال تک مرشد کی خدمت میں حاضر رہے۔ پھر نعمت اللٰہی سلسلہ میں خرقۂ خلافت پایا اور وہاں سے عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں حیدرآباد آکر اس پہاڑ کی چوٹی پر قیام فرمایا جہاں اس وقت آپ کا مزار ہے جو اس وقت آپ ہی کے نام پر میر محمود صاحب کی پہاڑی کہلاتی ہے۔ آپ نے یہاں ایک خانقاہ اور گنبد تعمیر کروایا اور آخر وقت تک وہیں قیام فرما رہے ۱۱۰۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کے فرزند حضرت شمس اولیاء

کی وجہ سے بڑی بڑی سازشوں اور مخالفتوں پر قابو پایا، لیکن اس عہد میں خود شاہی دربار دو گروہوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ اور بالآخر ۱۶۸۷ء میں مغل افواج نے گولکنڈہ کے بعض غدار عناصر کی مدد سے گولکنڈہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

دیگر قطب شاہی سلاطین کی طرح ابوالحسن تانا شاہ بھی ایک اچھا شاعر اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کا دیوان ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے لیکن تذکروں میں اس کی دو ایک غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس عہد کے اہم شاعروں میں طبعیؔ اور فائزؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ طبعیؔ نے ۱۶۷۰ء میں ایک بے مثال مثنوی "بہرام و گل اندام" تصنیف کی اور فائزؔ نے جو قطب شاہی عہد کا آخری باکمال شاعر تھا ۱۰۹۴ھ میں اپنی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" لکھی۔

عرف شمس مولا جو اپنے عہد کے بڑے بزرگ تھے آپ کے جانشین ہوئے۔ آپ کی درگاہ بھی مرجع خلائق ہے اور ہر جمعرات کو کثرت سے لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔

اس عہد کی آخری شخصیت حضرت میر اسد اللہ شہیدؒ کی ہے۔ آپکے والد شاہ جہاں کے ملازم تھے۔ والد کی وفات کے بعد آپ اور آپ کے بھائی اورنگ زیب کی سلطنت میں ممتاز خدمات پر معمور ہوئے۔ جب اورنگزیب نے گولکنڈہ پر فوج کشی کی تو آپ بھی لشکر کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ گولکنڈہ کے محاصرے نے طول کھینچا۔ اورنگ زیب کو اپنی کامیابی کی مشکل نظر آنے لگی۔ آپ کی ریاضت اور کرامت سے بہت کم لوگ باخبر تھے۔ بعض اہل لشکر اس کا علم تھا۔ اورنگ زیب پریشان ہو کر اولیاء اللہ کی مدد کا طالب ہوا اور اپنے اہل دربار سے کہا کہ اس وقت کسی بزرگ سے استعانت کی ضرورت ہے۔ بغیر اولیاء اللہ کی دعا کے یہ مہم سر ہوتی نظر نہیں آتی۔ کسی درباری نے بادشاہ سے آپ کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے فوراً اپنے معتمد کو بھیج کر آپ کے حال کی تصدیق کرائی اور اس کے بعد خود آکر دعا کا خواستگار ہوا۔ آپ نے دعا بھی فرمائی اور خود بھی محاصرہ کے کام میں شریک ہوئے۔ آپ کی دعا سے فتح ہو گیا۔ مگر آپ اس کشمکش میں گولہ کی زد میں آکر شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۰۹۸ھ کا ہے۔ قلعہ کے قریب نیک نام پورہ میں آپ کو دفن کیا گیا ہے۔

غلام ربانی

حیدرآباد کی قطب شاہی مسجدیں

اسلامی فن تعمیر میں مسجد ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کی ابتداء مسجد نبوی سے ہوئی۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں کا سب سے پہلا کام ایک خانہ خدا کی تعمیر تھی جس میں شہنشاہ دو عالم مزدوروں کے لباس میں خود شریک تھے، صحابہ پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے اور رجز پڑھتے جاتے تھے۔ یہ مسجد ہر قسم کے تکلّفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، چھوارے کے پتوں کا چھپّر اور کھجور کے ستون تھے۔ فرش کچا تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی۔ یہ تھی مسجد نبوی کی شان جس میں حضرت بلال کو اذان کا حکم ہوا اور تکبیر کی آواز سے شہر مدینہ کیا سارا جزیرہ نمائے عرب گونج اٹھا۔

ہر قوم نے اپنے عبادت خانوں کی شان و شکوہ اور آرائش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں عبادت گاہیں اپنے وقت کی دوسری عمارتوں سے زیادہ خوبصورت اور شاندار ہوتی تھیں۔ جب اسلامی فتوحات کا سیلاب مشرق میں چین تک اور مغرب میں اسپین تک پہونچ گیا اور مسلمان دنیا

کے بہت بڑے حصہ پر چھا گئے تو مختلف ملکوں میں بڑی نفیس اور پاکیزہ مسجدیں تعمیر ہوئیں جن کی وضع اور طرز تعمیر کے لحاظ سے مختلف مکاتیب قائم کئے جا سکتے ہیں، لیکن اس وقت صرف حیدرآباد کی مسجدوں سے بحث ہے۔ دکن میں اسلامی دور کی ابتدائی عمارتوں میں ایرانی اثر غالب رہا لیکن یہ صورت بہت دنوں نہیں رہی، رفتہ رفتہ ہندو اثر اسلامی عمارات میں داخل ہونے لگا اب دیکھنا یہ ہے کہ مندر نے مسجد کو کہاں تک متاثر کیا۔

ہندو قدیم زمانے سے مندروں کی تعمیر میں مشاق تھے۔ خصوصاً سنگ تراشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے مگر اب تک وہ ایک ہی طرز کے مندر بناتے چلے آئے تھے۔ مسلمان دکن میں آئے تو اپنے ساتھ نئی نئی چیزیں لائے اور انہوں نے فن تعمیر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

مندروں میں خالی جگہ کو پاٹنے کے لئے ستونوں پر پتھر کی سلیں ڈال دی جاتی تھیں جو سر دل کا کام دیتی تھیں۔ مسلمانوں نے اس کی جگہ محراب بنانی شروع کی۔ دکن میں یہ ایک نئی چیز تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ محراب کا بانکپن اہل ملک کے دلوں میں اس قدر کھپ گیا کہ اس نے عمارتوں سے ذات پات کی تمیز کو اٹھا دیا۔ اور ہر فرقہ کی بڑی عمارتوں میں کمانیں نظر آنے لگیں۔ پتھروں میں جوڑ بٹھانے کے لئے مسلمانوں نے چونا استعمال کرنا شروع کیا جس کا رواج یہاں بہت کم تھا۔ اس زمانے میں مندر ہماڈ پنتھی طرز پر تعمیر ہوئے تھے یعنی بڑے بڑے وزنی پتھر ایک دوسرے پر اس طرح رکھ دیئے جاتے تھے کہ اپنے بوجھ سے پتھر ٹھیک جگہ بیٹھ جائیں مسلمانوں کے آنے کے بعد میں چونے کا استعمال عام ہو گیا۔

مندروں کی چھتیں اہرامی شکل کی ہوتی تھیں یا ان پر سکار ا بنادئے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے محراب کے اصول پر لداؤ کی چھتیں بنائیں اور ان پر گنبدوں کے تاج رکھ دئے یہ بھی ملک میں ایک نئی چیز تھی اس کا رواج اس قدر ہوا کہ ہر شہر ہر قصبہ یہاں تک کہ بعض دیہات میں بھی دور سے کوئی گنبد نظر آجاتا ہے۔

حیدرآباد میں مسجدوں کی وہ کثرت ہے کہ اگر اس کو "مسجدوں کا شہر" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں ہر طرز کی مسجدیں موجود ہیں لیکن اس موقع پر قطب شاہی دور کی چند ایسی مسجدوں کا ذکر کیا جائے گا جو تاریخی دلچسپی یا تعمیری خصوصیات رکھتی ہیں۔

گولکنڈہ میں سب سے پرانی مسجد قلعہ کی جامع مسجد ہے جو مسجد صفا کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کو قطب شاہی خاندان کے بانی سلطان قلی قطب شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ تعمیر کے ۳۵ سال بعد وہ اسی جگہ نماز پڑھتے ہوئے ۹۹ سال کی عمر میں شہید ہوا۔ اس مسجد کا دروازہ گنبدی ہے۔ اندر پانچ در کا سہ گہا دالان ہے جس کے دونوں پہلوؤں پر چار چار چھوٹے مینار گلدستہ کی شکل میں بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کی تعمیر میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن اس کے دروازہ پر جو کتبہ ہے وہ بہت اہم ہے۔ ڈاکٹر غلام یزدانی او۔ بی۔ ای نے اس کتبہ کو اپی گرافکا انڈو مسلمکا میں شایع کردیا ہے جس سے ایک بہت بڑی تاریخی غلطی دور ہوگئی ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان قلی نے ۹۰۸ ہجری (۱۵۱۲ء) میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس کتبہ میں صاف لکھا ہے کہ یہ مسجد ۹۲۴ ہجری (۱۵۱۸ء) میں سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ بہمنی کے عہد میں تعمیر ہوئی اس زمانہ میں سلطان قلی قطب الملک تلنگانہ کا صوبہ دار تھا۔ یہ کتبہ خط نسخ میں طغری

کی طرز پر ہے۔ عبارت یہ ہے۔

۱۔ بناء ہذا المسجد الجامع فی زمان سلطان الاعظم المتوکل علی اللہ الغنی ابی المغازی محمود شاہ ابن محمد شاہ البہمنی

۲۔ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ دبابۃ المبتہل الی اللہ مالک الملک سلطان قلی المخاطب بہ قطب الملک فی سنۃ اربع وعشرین وتسعمایہ۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ نگر کو آراستہ کرنے کے لئے جو خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں، ان میں یہاں کی جامع مسجد بھی ہے۔ فرشتہ نے چارمینار کے ساتھ اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ "محمد قلی قطب شاہ نے شہر کے بیچ میں ایک بڑی پاکیزہ مسجد تعمیر کرائی۔

دروازہ میں داخل ہونے پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی شاندار عمارت ہوگی لیکن اندر پہونچ کر نقشہ بدل جاتا ہے۔ مسجد کا وسیع دالان، ستونوں کی قطاریں، خوبصورت محرابیں اور مینار عمارت کے بانی کی اولوالعزمی کا پتہ دیتے ہیں۔

مسجد کا دالان در دالان سات در کا ہے جو ۷۲ فٹ لمبا اور ۳۲ فٹ چوڑا ہے۔ صحن میں سنگ خارا کا فرش ہے۔ جس کے شمالی جانب ایک حوض ہے۔ صحن میں شمالی ضلع کے ساتھ ساتھ قدیم دکنی طرز کے ستونوں اور دالانوں کا سلسلہ چلا گیا ہے جو نو در کا ہے چھت کی منڈیر پر بہمنی طرز کی محراب دار جالی ہے۔ اس مسجد کے ساتھ ایک قدیم ترکی حمام بھی تھا جس کو دس سال قبل توڑ دیا گیا ہے۔

مسجد میں دو کتبے ہیں۔ ان میں سے ایک داخلہ دروازہ پر سنگ سیاہ کی لوح (۲×۷) فٹ پر ہے۔ یہ کتبہ فارسی زبان میں بہت ہی خوبصورت نستعلیق خط

میں ہے۔ اس میں بادشاہ کا نام نہیں ہے لیکن اس کے وزیر امین الملک (سید میر محمد امین استر آبادی) کا نام ہے جس کی نگرانی میں یہ عمارت تیار ہوئی۔ کتبہ شاعری کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ عبارت یہ ہے۔

جہاں داری بہ شاہاں شہریاری — کہ نیکی دیدہ در عہدش نکوی
دل آسایش کند جان تازہ گردد — ز لعلش ہر زند چون گفتگوی
زمین را رشک جنت کرد خلقی — گلستان ارم گردیدہ روی
بام عالی خود مسجدی ساخت — کہ در سقفش فلک گردیدہ گوی
مگر در پیش صحن مو نماید — کند ہر لحظہ جنت رفت روی
کسے پرسد اگر تاریخ ادرا — زہی عالی بنای خیر گوی

تمام گشت بسعی ملک امین الملک حررہ بابا خان

دوسرا کتبہ محراب عبادت پر ہے یہ خط ثلث میں ہے جس میں قرآنی آیات کندہ ہیں۔

قطب شاہی مقبروں میں حیات بخشی بیگم کے مقبرہ سے متصل اس نیک بخت ملکہ کی مسجد کلاں ہے دکن کی یہ نامور خاتون ایک بادشاہ کی بیٹی، بادشاہ کی بیوی اور بادشاہ کی ماں تھی اور ہر حیثیت سے سلطنت کے انتظام میں دخیل رہی۔ اس مسجد سے اس کے تعمیری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ پوری عمارت پر اعلیٰ قسم کی استر کاری ہے اس نے پیچ درہ دالان در دالان ہے۔ چھت لداؤ کی ہے۔ بیرونی دالان کی چھت اونچی اور اندرون کی ذرا نیچے ہے منڈیر پر خوبصورت کنگورے ہیں، جن میں پانچ گلدستے بنے ہوئے ہیں۔ ایوان کے دونوں پہلوؤں پر دو بلند مینار ہیں جن کی برجیوں کے نیچے کنول کی پتیاں اور اناس کے خوبصورت

نمونے بنے ہوئے ہیں عمارت کی رو کار پر ہندسی اشکال کی جالیاں ہیں۔ بیرونی محرابوں کی پیشانی پر خوبصورت بیل اور زنجیرے بنے ہوئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ سنجاف کی پٹی میں جھاڑ ٹنگی ہوئی ہے۔ رو کار کی آرائش، میناروں کی گولائی اور محراب کے بانکپن نے عمارت میں رعنائی پیدا کر دی ہے۔ یہ عمارت اس قدر پاکیزہ اور سبک ہے کہ اس میں زنانہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ چاندنی رات کی خاموشی میں اسے دیکھتے ہیں تو قلب پر خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کوئی ملکہ سفید پوشاک پہنے کھڑی ہے۔

حیات بخشی بیگم کے مقبرہ کی سیڑھیوں سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں مشکل سے تین چار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اتنی چھوٹی مسجد ملک میں شاید ہی کہیں ہو۔ یہ مسجد اورنگ زیب نے اپنے لئے بنوائی تھی۔ گولکنڈہ کے محاصرہ کے وقت اس کا کیمپ انہی مقبروں میں تھا۔

مکہ مسجد دکن کی سب سے بڑی اسلامی عبادت گاہ ہے۔ جو قطب شاہی فرمانرواؤں کی عظمت اور شکوہ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ محمد قطب شاہ نے ۱۶۱۲ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ مسجد کی تعمیر عبداللہ شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں بھی جاری رہی۔ آخر کار اورنگ زیب نے گولکنڈہ کی فتح کے بعد اس کو مکمل کیا اس وقت قطب شاہی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہر چند اس کی تعمیر کوئی پون صدی جاری رہی مگر اپنے بنانے والوں کے مقصد کو پورا نہ کر سکی۔ عمارت پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ایوان کی بلندی اور حجم کے مقابلہ میں اس کے مینار بہت چھوٹے ہیں جس سے عمارت کی شان میں فرق آگیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اورنگ زیب نے نقشہ کے مطابق اس پر زیادہ روپیہ خرچ کرنا پسند نہیں کیا

اور یہ شعر پڑھ کر معاملہ کو ختم کر دیا۔

کار دنیا کسے تمام نہ کرد　　　ہر چہ گیرید مختصر گیر

مسجد میں پانچ در کا سہ گہا دالان ہے، اس کے بلند ستون ایک ڈال کے پتھر کے ہیں۔ اتنے وزنی پتھر کے ستون ہندستان کی کسی مسجد میں استعمال نہیں ہوئے فرانسیسی سیاح موسیو تھیونو کہتا ہے کہ کئی سو مزدوروں نے پانچ سال کی لگاتار محنت سے ان پتھروں کو کان سے نکالا تھا اور کان سے مسجد تک چودہ سو بیل کھینچ کر لائے تھے۔ پوری عمارت سنگ بستہ ہے۔ اطراف کی دیواروں میں استحکام پیدا کرنے کے لئے خشتی ڈاٹیں ہیں اور قبلہ کے رخ کی دیوار کسی قدر سلامی نما ہے جس سے اور مضبوطی پیدا ہوگئی ہے صحن میں سنگ خارا کا فرش ہے اس کے جنوبی حصے میں سنگ مرمر کے محجر ہیں، جن میں آصفیہ خاندان کے فرمانروا آسودہ ہیں۔

قطب شاہی حکومت اپنی دولت کے لئے دنیا میں مشہور تھی۔ اس زمانہ میں گولکنڈہ کا دوسرا نام "ہیروں کا شہر" تھا۔ اب یہاں ہیرا منڈی، ہیرا خانہ، ہیرا مسجد وغیرہ کے آثار باقی رہ گئے ہیں گولکنڈہ کی مسجدوں میں ہیرا مسجد بھی قابل ذکر ہے۔ عمارت ایک وسیع مستطیل کی شکل میں ہے۔ اس کے احاطہ کی دیواریں بلند ہیں جن کے آثار میں مسافروں اور طلبہ کے لئے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے صحن میں ایک چبوترے پر ایک حوض ہے۔ دالان سہ درہ ہے اور کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ پہلوؤں پر دو خوبصورت مینار ہیں۔ اس مسجد میں کئی کتبے ہیں۔ سب میں بڑا کتبہ لکڑی کی تختیوں پر منبت ہے۔ ان میں سے تین چھجے کے موتیے کے نیچے ہیں۔ کتبہ میں فارسی کے چار اشعار ہیں۔ اس زمانہ میں یہاں ایرانی خوشنویس بہت تھے چنانچہ اور کتبوں کی طرح اس پر بھی کاتب کا نام اسمٰعیل بن عرب شیرازی کندہ ہے۔

عبارت یہ ہے۔

شاہنشہ دین قطب شاہان — آں قبلۂ فیض اہل امید

مانند خلیل کعبۂ ساخت — کز ہمتمہ اودست ماہ وخورشید

از مہر جبیں بنای بافیض — سلطان حسین را پسندید

تاریخ بناش گفت ہاتف — ایں کعبۂ فیض باد جاوید

۱۰۷۹ ہجری

کتبہ اسمٰعیل بن عرب شیرازی

کتبہ کی تختیوں کے نیچے محرابوں کی پیشانی پر جو پھول ہیں ان میں قرآنی آیات طغری میں کندہ ہیں۔

عجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت — وعجلو بالتوبہ قبل الموت

دائیں جانب کی مرغول پر یہ اسماء پاک درج ہیں۔

اللہ، محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ حسنؑ حسینؑ

مشیر آباد کی مسجد قطب شاہی طرز تعمیر کا کامل نمونہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو معمار مسجدوں کی تعمیر میں اپنی استادی دکھاتے تھے۔ اس مسجد کے چار درجے ہیں جن کے پہلوؤں میں دو خوشنما مینار ہیں مسجد کی روکار پر آٹھ خوبصورت برجیاں ہیں اور جگہ جگہ چونے میں نفیس کاریگری کی گئی ہے۔ اس مسجد کا ایک مینار کہنگی کی وجہ سے کسی قدر جھک گیا تھا۔ اس کے اندر ایک آہنی سلاخ تھی محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے اس کی مرمت ہو چکی ہے۔ مسجد کے احاطہ کے گرد ایک وسیع رقبہ شاہی زمانہ سے وقف چلا آرہا ہے اس پر اب مکانات بن گئے ہیں جس سے عمارت کا خوشنما منظر تباہ ہو گیا ہے۔

کاروان شہر حیدرآباد کا نہایت قدیم محلہ ہے جب گولکنڈہ میں آبادی بہت بڑھ

گئی اور لوگوں کو رہنے سہنے کی تکلیف ہونے لگی تو قلعہ کے باہر سب سے پہلے اسی جگہ آبادی شروع ہوئی۔ غیر ملکوں کے سوداگر اور دور دراز کے قافلے یہیں ٹھہرتے تھے چنانچہ کاروان سرایوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ اس زمانہ میں یہاں بڑی گہما گہمی تھی۔ آبادی کا پتہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قطب شاہی زمانے کی جتنی مسجدیں یہاں ہیں اتنی کسی محلہ میں نہیں۔ یہ یادگاریں گولکنڈہ طرز تعمیر کے بہت اچھے نمونہ ہیں۔ لیکن زمانہ نے ان کی شکلوں کو بگاڑ دیا ہے۔ کہنگی سے پلاسٹر خستہ ہو کر گر رہا ہے۔ بارش اور خودرو نباتات نے تعمیر کی بندش کو ڈھیلا کر دیا جس سے عمارتوں میں جا بجا شگاف اور دیواروں میں رخنے پڑ گئے ہیں یہاں کی مسجدوں میں ٹولی مسجد سب سے خوبصورت ہے اور معلوم ہوتا ہے ابھی تیار ہوئی ہے اس مسجد کے گرد ایک وسیع باغ تھا جس کی آبیاری کے لئے احاطہ کے ایک کونہ میں بہت بڑی باولی ہے۔

اس مسجد کو موسیٰ خاں نے بنوایا تھا جو عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں محلدار تھا لیکن جنگ کے میدان میں سپہ سالاری بھی کرتا تھا۔

مسجد کی کرسی خاصی اونچی ہے عمارت کے تین طرف سیڑھیاں ہیں اس کے بعد صحن چبوترہ آتا ہے۔ دالان کے بیرونی حصے میں پانچ در ہیں اور اندرونی حصے میں صرف تین ہیں۔ پاکھوں کے آخر میں شمال اور جنوب کی طرف دو محرابیں ستون اور سردل طرز (PILLAR & LINTEL STYLE) میں بنی ہوئی ہیں۔ عمارت کے دونوں پہلوؤں پر کوئی ساٹھ فٹ بلند مینار ہیں چھت کو بہت چھوٹی چھوٹی برجیوں سے سجایا گیا ہے۔ عمارت کا نچلا حصہ تراشیدہ پتھروں کا بنا ہوا ہے اوپر کا حصہ اینٹوں اور چونے کی تعمیر ہے جس کی غرض

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

گولکنڈہ میں شعر و ادب کا نشوونما

(۱۵۰۸ء تا ۱۶۸۷ء)

بہمنی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہان قطبیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق دولت و ثروت تعمیر کاری اور علم و ادب کی سرپرستی ہمیشہ یاد رہے گی اردو زبان اور ادب نے بھی ان کے عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔ انہوں نے ۱۵۰۸ء سے سنہ ۱۶۸۷ء تک تقریباً (۱۸۰) سال تک گولکنڈہ اور دکن کے زیادہ تر آندھرا علاقوں پر حکمرانی کی۔ ان کے عہد کے اردو ادب کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

أ۔ ابتدائی کوششیں جو سنہ ۱۵۰۸ء سے ۱۵۸۰ء کے درمیانی (۷۲) سالوں پر مشتمل رہیں۔

ب۔ عروج کا زمانہ جو ۱۵۸۰ء سے ۱۶۷۲ء تک جاری رہا۔

ج۔ دور انتشار جو ۱۵۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۶۸۷ء پہ ختم ہوا

ابتدائی کوششیں ۱۵۰۸ء تا ۱۵۸۰ء گولکنڈہ کے پہلے چار بادشاہ سلطان قلی، جمشید قلی، سبحان قلی اور ابراہیم قلی زیادہ تر جنگ و جدل اور استحکام سلطنت میں

پلاستر میں نقش و نگار بنایا تھا۔ عمارت کی سب سے نمایاں چیز اس کی آرائش ہے جس میں ہندو اثر پوری طرح سرایت کر گیا ہے (ڈاکٹر غلام یزدانی نے محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ میں اس کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے)

۱۔ گول ہانڈی دکلس، جو تکمیل کی علامت ہے) ہندو تعمیری آرائش کی خصوصیات میں ہے۔ یہاں میناروں کی جڑ میں مصری رنجن کی شکل پتھر میں اس طرح تراشی گئی ہے گویا مینار ہانڈی میں سے نکل رہے ہیں۔ عمارت کی رو کار کو چھوٹی چھوٹی لیٹوں یا کلیوں کی قطار سے سجایا گیا ہے جن کو سنگ سیاہ میں تراشا گیا ہے

۲۔ ہاتھی، دولت اور خوش حالی کی علامت ہے۔ اسلام میں کسی جانور کی شکل بنانا منع ہے۔ یہاں اندرونی دالان میں ہاتھی دانت کے توڑے چھجے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

۳۔ دالان میں (Pillar & lintel) طرز کے جو طاق بنائے گئے ہیں، وہ مندروں کے ان طاقوں کے مشابہ ہیں جن میں مورتیاں بٹھائی جاتی ہیں۔

۴۔ مندر کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ اس کی اوپری سطح کو چھوٹے چھوٹے سکاروں سے سجایا جاتا ہے۔ یہاں اس کی بھی تقلید کی گئی ہے۔ اور مسجد کے طاقوں کے اوپر چھوٹی چھوٹی مسجدیں اور مینار بنائے گئے ہیں۔

۵۔ اسلامی عمارات میں تناسب اصل چیز ہوتی ہے اور آرائش ایک ذیلی امر ہے۔ اس کے برخلاف ہندو عمارتوں میں خوبصورتی کا معیار آرائش

کی نفاست ہے چنانچہ یہاں ہندو اصول پر کام کیا گیا ہے۔ مسجد کے اندرونی حصے، اس کے مینار، اس کے روکار پر آرائش کی بھرمار ہے۔ ہر جگہ خوبصورت جالیاں ہیں صحن میں بدردم، ماہی پشت نوزاتی، چھ ماس، اٹھ ماس، گل دار، زنبوری، انجم جالی، پان پھول وغیرہ ہر وضع کی جالیاں موجود ہیں آرائش کا یہ کام ایسا نفیس ہے کہ نظروں میں کھپا جاتا ہے اس کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ شعرا بعض موقعوں پر اپنے کلام کو صنائع بدائع سے کیوں سجایا کرتے ہیں۔

منارے کی اصل غرض عمارت میں استحکام پیدا کرنا اور مذہبی رفعت کو نمایاں کرنا ہے۔ یہاں معمار نے سمجھا کہ مینار بھی ایک آرائش کی چیز ہے چنانچہ اس کی ٹیپ ٹاپ میں جتنی دیدہ ریزی ہو سکتی تھی اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ مینار تناسب کے لحاظ سے موزوں نہیں کھلونا معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح اور بے جوڑ باتیں بھی اس میں موجود ہیں۔ مثلاً چھجا بوچھاڑ کو روکنے کے لئے ہوتا ہے جو عمارت کے بیرونی رخ پر بنایا جاتا ہے۔ یہاں چھجے کو بھی آرائشی چیز سمجھی گئی چنانچہ جب اندر کا دالان بنایا ہے تو اس کی محرابوں پر بھی چھجا بنا دیا ہے۔

مسجد کی محراب عبادت میں ایک کتبہ ہے جس کی عبارت یہ ہے۔

لمن الملک الیوم اللہ الواحد القہار

بنا کرد موسیٰ خاں این مسجد خوش — کہ شد مستعد دور عبداللہ شاہ

بتاریخ مسجد چنیں شد ندا — بنا کرد مسجد بنام خدا

اس کے علاوہ یہاں ایک اور کتبہ ہے جو سنگ سیاہ کی دو لوحوں

پر کندہ ہے۔ یہ دونوں پتھر مسجد کے عقب میں موسیٰ خاں کی بیوی
کے مقبرہ میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق غالباً کسی دوسری
مسجد سے ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی
کتبہ نستعلیق خط میں ہے جو لطف اللہ حسینی التبریزی نے لکھا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

محلات قطب شاہی

قطب شاہوں کے محلات دستبرد زمانہ کے باوجود اب بھی اپنی بلندی اور شان و شوکت کے باعث دیکھنے کے قابل ہیں۔ یہ محلات قلعہ گولکنڈہ کے اندر ایک اور چھوٹے سے قلعے میں تعمیر کئے گئے تھے۔ یہ اندرونی قلعہ دو جداگانہ حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ بالاحصار۔ ۲۔ محلات اور ایوانات شاہی

بالاحصار اس قلعہ کے جنوب مغربی حصہ میں واقع ہے اور اس پر زیادہ تر سپہ سالار اور فوجی عہدہ داروں کا عمل دخل رہتا تھا۔ اس حصہ کو اونچی اونچی دیواروں سے اس طرح علحدہ کیا گیا ہے کہ محلات اور ایوانات شاہی پر اوپر سے نظر نہیں پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ تک لوگ صرف بالاحصار کی چڑھائی چڑھ کر اور اوپر کا شاہی ایوان دیکھ کر واپس ہو جاتے تھے۔ ان کو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ اسی پہاڑی کے دامن میں عالیشان محلات اور ایوانات شاہی بھی واقع ہیں

چونکہ یہ اندرون قلعہ صرف خاص کے قبضہ میں تھا اور اس میں قلعدار

گولکنڈہ سے اجازت نامے کر داخل ہوسکتے تھے۔ اس لئے جو سپاہی اس کی حفاظت پر مامور تھے انہوں نے گذشتہ دو سول کے طویل عرصہ میں ان محلات کو خزانوں اور دفینوں کی تلاش میں بہت سخت نقصان پہونچایا۔ اور جگہ جگہ کھود ڈالا۔ اور چونکہ اس کی صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اسلئے بڑے بڑے درخت ان محلات کی چھتوں پر اُگ آئے اور ان کی جڑوں نے بہت سی عمارتیں گرادیں۔ اس طرح یہ تمام محلات باہر سے بالکل کھنڈر نظر آتے تھے مگر ایک بار ان کے اندر داخل ہونے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی بہت سی چھتیں اور کمرے محفوظ ہیں۔ اور تحقیق و جستجو کرنے والوں کو ان کی ترتیب و تزئین وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

باب الداخلہ اس اندرونی قلعہ کے حصار کا باب الداخلہ فتح دروازہ سے آنے والی سڑک کے مقابل واقع ہے۔ اور اس کا رُخ مشرق کی سمت ہے۔ اس کے سامنے ایک محافظ دیوار بہ شکل ہلالی بنائی گئی ہے جس پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور اس طرح اصل دروازہ دشمن کے حملہ سے بالکل محفوظ تھا۔ یہ دروازہ ایک کمان کے اندر ہے جس کے بیرونی چہرے پر قطب شاہی سلطنت کے نشان شیر اور شرزہ اور مورکچھ پتھر پر کندہ ہیں اور کچھ گچ کے نقش ونگار میں اُبھارے گئے ہیں دروازے کے اندر دونوں طرف پہرے کے سپاہیوں کے لئے مسقف گنبد نما نشست ہے۔ اسکے بعد ایک برآمدہ یا پورٹیکو ہے جس میں کھڑے ہوکر تالی بجائیے تو ایوان بالا حصار پر اس کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ ایوان اس مقام سے کافی دور اور بہت زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز کسی جادو کے زور سے وہاں پہونچ گئی۔ مگر اس پورٹیکو کی گنبد نما چھت اور اطراف کی دیواروں اور فضا ء کی گونج کی مدد سے یہ آواز وہاں تک پہنچتی ہے اور اسی کے پہنچانے کے لئے یہ اسباب

عمداً تیار کیے گئے تھے ۔

حمام اس پورٹیکو کی دائیں جانب ایک ترکش باتھ ہے جہاں شاہی دربار اور محل سرا میں داخل ہونے والے مہمان نہا کر اور شاہی خلعت پہن کر نکلتے تھے اس میں متعدد کمرے، حوض اور درمیانی ہال ہے۔ اس حمام میں داخل ہوتے ہی پہلے ایک چھوٹا سا حوض ملتا ہے تاکہ چلنے والے پاؤں دھو کر اس حمام میں جائیں۔ اس تمام حمام میں میناکاری کا کام تھا جو بعد کو جھڑ گیا۔ اور اب بھی اس کے رنگ برنگ کام کے ٹکڑے ایک گوشہ میں پڑے ہوئے ہیں جن کے دیکھنے سے نقش و نگار کی اعلیٰ کاریگری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس حمام کے مقابل جانب مغرب نگینہ باغ واقع تھا۔ جس کے آثار مٹے جھٹے سے موجود ہیں ۔ اسی نگینہ باغ میں گولکنڈہ کا آخری وفادار سپہ سالار عبدالرزاق لاری زخموں میں چور پایا گیا تھا اور جس کے دیکھنے کے لئے ابوالحسن تاناشاہ گرفتار ہونے سے قبل اس باغ میں آیا تھا۔

حوض پورٹیکو کی بائیں جانب حصار سے متصل ایک مسقف حوض ہے جس میں دفاتر اور ایوانات شاہی میں روزمرہ کے آنے والے پاؤں دھولیا کرتے تھے ۔ پورٹیکو کے ایک طرف حمام اور دوسری طرف پاؤں دھونے کے حوض کا التزام ظاہر کرتا ہے کہ قطب شاہی بادشاہوں کو صفائی اور پاکیزگی کا کتنا زیادہ خیال تھا۔

دفتر خانہ شاہی اس حوض کی جانب جنوب شاہی دفتر تھا جس کی کئی منزلہ عالیشان عمارت اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے اور جس کو آجکل اسلحہ خانہ کہا جاتا ہے کیونکہ زوال گولکنڈہ کے بعد فاتح فوجیوں نے تمام قلعہ کے ہتھیار یکجا کر کے اس میں محفوظ کر دیئے تھے جن میں سے بعض اب بھی یہاں موجود ہیں۔

اور اس قدیم عہد کے اسلحہ کی صورت شکل ان سے ظاہر ہوتی ہے۔

اسی دفتر خانہ شاہی کے اوپر وہ مقام ہے جہاں شاہی محل کی خواتین تاناشاہ کے آخری دیدار کے لیے جمع ہوئی تھیں جبکہ مغل اس کو قید کر کے لے جا رہے تھے۔ مشہور ہے کہ جب تاناشاہ کی سواری نظر سے اوجھل ہوگئی تو یہ عورتیں ماتم کرتی ہوئی اس باولی میں کود گئیں جو اس عمارت کی پشت پر محلات کی سمت میں واقع ہے چنانچہ اس باولی میں سے پچیس سال پیشتر تک ان خواتین مرحوم کے زیورات اور جواہر اور سونے کے ٹکڑے لوگوں کو ملا کرتے تھے۔

مسجد دفتر خانہ اس دفتر خانہ کے سامنے ایک گوشہ میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو ملازمین دفتر کی سہولت کے لئے بنائی گئی تھی۔

دربار عام دفتر خانہ شاہی سے جانب مغرب آگے بڑھنے کے بعد دو بلند دیواریں نظر آتی ہیں۔ یہ قطب شاہی دربار یا دیوان عام کے باقی ماندہ آثار ہیں انھیں کے درمیان لکڑی کی چھت کا عالیشان ایوان تھا جس کا رخ مشرق کی طرف تھا ان دیواروں کی بالائی منزلوں پر جو کمانیں اب تک موجود ہیں ان میں چونے کی نفیس اور نازک جالیاں بنی ہوئی تھیں جو دس سال قبل تک موجود تھیں اور جن کو بعد میں بےجان لگا کر غالباً محکمہ آثار قدیمہ نے نکال لیا ہے۔ اس جالی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اب اس ایوان کے اطراف مٹی میں نظر آتے ہیں اور ایک ٹکڑا ادارہ ادبیات اردو میں بھی بطور نمونہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔ محل کی خواتین ان جالیوں کے پیچھے سے دربار کے مناظر اور کاروبار سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ اس لئے کہ اس کی بلند دیواروں کے پچھلے حصے دو منزلہ تھے۔

نشست گاہ میر جملہ و پیشوائے سلطنت دربار عام کی پشت پر یعنے جانب مغرب

صحن کی دوسری طرف میر جملہ اور پیشوائے سلطنت کے دفاتر اور نشست گاہیں تھیں جو مشرق رویہ تھیں۔ ان کے آثار بھی اب تک موجود ہیں۔ اور پیش دالان کے ستونوں کے نچلے حصے بھی اپنی جگہ پہ ہیں۔ جو منقش و مصفیٰ سنگ موسیٰ میں تراشے ہوئے ہیں۔

دربار خاص دربار عام اور نشست گاہ پیشوائے سلطنت کے درمیان جو صحن ہے اس کے جنوب کی سمت میں دربار خاص یا دیوان خاص کی عمارت کے آثار ہیں۔ اس کی دیواروں کے نچلے حصے میں میناکاری کے کام کے نمونے اب تک محفوظ ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری دیواریں ایسے ہی رنگین خوشنما نقش و نگار سے آراستہ تھیں۔ اس نقش و نگار کے ٹکڑے روز لوگ توڑ توڑ کر بطور سوغات اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اور یقین ہے کہ کچھ ہی عرصے میں یہ سب قیمتی رنگین آثار غائب ہو جائیں گے۔

زنانی دروازہ دیوان خاص سے جانب مغرب تھوڑے سے فاصلہ پہ زنانہ محلات میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ اس کی دونوں جانب، خواجہ سراؤں کی نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ جو ہر آنے جانے والوں کی جھڑتی لیتے تھے اور اندر داخل ہونے کی اجازت داروغہ محلات سے حاصل کر کے دیتے تھے۔ اس دروازے میں تھوڑی دور جنوبی سمت چلنے کے بعد یہ راستہ جانب مشرق مڑتا ہے۔ اور یہ سب راستہ مسقف ہے۔ اس پہ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک بہت بڑا صحن ملتا ہے جس کے جنوب کی سمت میں زنانی محلات کی بلند کمانیں نظر آتی ہیں۔

زنانی مسجد زنانی راستہ سے جب صحن میں داخل ہوتے ہیں تو دائیں ہاتھ کی طرف ایک بلند و بالا مسجد نظر آتی ہے جو آج بھی محفوظ ہے۔

اسی میں محل کی عورتیں نماز باجماعت ادا کرتی تھیں اور باہر سے آنے والی مہمان خواتین یہاں پہلے نماز ادا کر کے محلات کا رخ کرتی تھیں۔

محلات مسجد سے کافی فاصلہ پر صحن عبور کرنے کے بعد بڑی بڑی کمانوں میں داخل ہوتے ہی قطب شاہوں کے زنانی محلات میں پہنچ جاتے ہیں، جن کی نچلی منزلیں بالکل محفوظ ہیں اور اپنی بلندی وسعت اور خوشنمائی کی وجہ سے قابل دید ہیں۔ ان کا سلسلہ جانب جنوب بہت دور تک چلا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے متصل دوسری عمارت حسب ضرورت یکے بعد دیگرے بنتی گئی ہے۔ اور کمانوں، گنبد دار چھتوں، غلام گردشوں، اور کمروں کا ایک لامحدود سلسلہ قائم ہو گیا ہے جس کو عبور کرنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے اور شاید ہی کوئی شخص ان سب ایوانوں اور کمروں کی سیر ایک وقت میں پوری طرح کر سکے۔ ان میں جگہ جگہ خزانوں کے متلاشیوں نے رخنے ڈال دیئے ہیں اور بعض جگہ چھتوں میں سے بھی ان کو خزانوں کے صندوق لٹکے رہنے کے نشان اب بھی موجود ہیں۔ یہ محلات کئی منزلہ تھے اور ان کی بالائی منزلیں خود بادشاہ اور شہزادیوں کی قیام گاہیں تھیں جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

ملکہ کا محل محلات کی ان بیرونی شاندار بھول بھلیوں کو عبور کرنے کے بعد ایک بڑا ہرا بھرا صحن ملتا ہے جس کے درمیان ایک وسیع خوشنما حوض ہے اور چاروں طرف عمارتیں بنی ہوئی ہیں ان میں درمیانی عمارت جو شمال رویہ ہے اصل ملکہ کا محل ہے جس کی چھتیں چونکہ مطلا و مذہب تھیں اور ان میں خزانے بھی پوشیدہ تھے اس لئے مغل فاتحوں نے بارودی ہوائیوں کے ذریعہ ان کو ڈھا دیا تھا۔ اس محل میں ہر طرف لکڑی کے ستونوں کے آثار موجود ہیں۔ یہ تمام ستون یا تو جل گئے

یا بعد کو نکال لئے گئے۔ مگر پتھروں کے درمیان خلا اب بھی موجود ہے۔

مثمن برج اس محل کے مقابل میں صحن کے بہ جانب شمال ایک مثمن برج کا بچا حصہ موجود ہے۔ اسی برج کی بالائی منزلوں سے بادشاہ اور شہزادے زنانی محلات کا معائنہ کرتے تھے اور اہل حرم کی رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسی برج کی دو تین منزلیں پچیس سال تک محفوظ تھیں۔

بھاگ متی کا محل ملکہ کے محل کے بعد ایک جداگانہ حصار کے درمیان بھاگ متی حیدر محل کے عالیشان سہ منزلہ محل کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں جن میں وضع وضع کے خوبصورت طاقچے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں جواہرات چینی اور یشب کے گلدان اور زیبائش و آرائش کا قیمتی سامان جگمگاتا رہتا تھا۔ اس محل کی چھتوں پر خالص سونا مڑھا ہوا تھا جس میں قیمتی جواہرات سے نقش و نگار بنائے گئے تھے اور پورے محل میں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ جو اتنے بڑے تھے کہ لپیٹنے کے بعد دروازوں میں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اس لئے مغل عہدیداروں نے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ چونکہ اس کی چھتیں لکڑی کی تھیں اور ایسی ہی چھتوں میں خزانے چھپائے جاتے تھے اس لئے باوودی ہوائیوں کے ذریعہ ان کو بھی منہدم کرکے ان کے خزانے حاصل کئے گئے۔ یہ باوودی ہوائیاں جگہ جگہ فرش پر جائی گئی تھیں جن میں سے بعض مقامات کی ہوائیاں تیس سال قبل تک اپنی اصلی جلی ہوئی حالت میں موجود تھیں اسی محل میں اورنگ زیب کے پہلے محاصرہ گولکنڈہ کے وقت بھاگ متی حیدر محل کی دختر ملکہ حیات بخشی بیگم مقیم تھیں اور جب زنانی محلات تک مغلوں کے گولے پہنچنے لگے تو اسی محل سے نکل کر وہ اورنگ زیب کے ڈیرے میں صلح کی بات چیت

معروف رہے۔ جمشید فارسی کا اچھا شاعر اور ارباب شعر اور اصحاب علم کا قدردان تھا۔ اس کا فارسی کلام موجود ہے اور کلام الملوک (سلسلہ یوسفیہ) میں شائع ہو چکا ہے۔

جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم قلی قطب شاہ (سنہ ۱۵۵۰ء تا سنہ ۱۵۸۰ء) اگرچہ خود شاعر نہیں تھا لیکن علم و فضل اور شعر و سخن کا دلدادہ تھا اور دراصل اس کے دور میں گولکنڈہ میں اردو زبان و ادب کا ایک ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ عوام کے علاوہ خود اس کا فرزند محمد قلی عالم شہزادگی ہی سے اردو شاعری کا رسیا ثابت ہوا۔

ابراہیم اپنے والد سلطان قلی کی شہادت اور جمشید کی تخت نشینی کے بعد سے وجیانگر میں سات سال تک پناہ گزیں رہا اور آخر کار وہیں کی اخلاقی تائید سے گولکنڈہ پر قابض ہوا تھا اس لئے اس کے دل میں غیر مسلم رعایا کے لئے خاص جگہ تھی اور مذہب و مسلک کے لحاظ سے بھی اس نے بڑی وسیع النظری سے کام لیا اور اپنے شہر اور محل کو مختلف مذہبوں اور کلچروں کا گلدستہ بنائے رکھا۔ چنانچہ اس کی اولاد بھی مختلف زبانیں بولنے والی اور مختلف مذہبوں کے ماننے والی عورتوں سے تھی۔ اس کے بڑے شہزادہ شاہ عبدالقادر کی ماں بیدر کے ایک مشہور مشائخ خاندان سے تھی۔ شہزادہ محمد قلی اور شہزادہ خدا بندہ کی ماں ایک آندھرا خاتون بھاگیرتی تھی۔ اور شہزادہ محمد امین کی والدہ ایران کے سادات سے تھی اور شہزادہ حسین قلی ایک شیعہ خاتون کے بطن سے تھا۔ اس نے آندھراؤں، حبشیوں، دکنی مسلمانوں اور ایرانیوں کو اپنے دربار میں مساوی ترقی کے مواقع دئے اور دور دور کے صاحبان کمال اس کے پایہ تخت میں جمع ہوتے گئے۔

وہ ہمیشہ سفر و حضر میں اہل فضل و ہنر کو اپنے ساتھ رکھتا تھا جو اس کی مجلس میں علوم دینی اور مسائل دینوی پر بحث و مباحثہ کرتے۔ اس نے گولکنڈہ میں ایسے مدرسے قائم کئے جن میں مفت تعلیم کے علاوہ طلباء کو وظیفے اور انعام بھی دیئے جاتے

کی گئی تھیں۔

مسجد اور مندر

بھاگ متی کے محل کی جانب مغرب حصار سے متصل باہر کی طرف ایک مسجد اور اس کے برابر ایک مندر بنایا گیا تھا۔ مسجد تو اب بھی بری حالت میں محفوظ ہے مگر مندر کا صرف ایک بلند ستون کھڑا رہ گیا ہے۔ دوسرے ستونوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے وہیں پڑے ہوئے ہیں۔ اور کچھ عرصہ قبل تک اس عمارت کے اندرونی حصہ کے نقش ونگار کے پتھر بھی جو مصفی سنگ موسیٰ میں بنے ہوئے تھے وہاں موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آثار قدیمہ والے ان کو اب وہاں سے اٹھالے گئے ہیں۔ مسجد اور مندر کی اس طرح ساتھ ساتھ تعمیر قطب شاہوں کی مذہبی رواداری کا ثبوت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے محلات میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو عورتیں بھی ملازم تھیں جو رات دن وہیں رہتی تھیں۔

سرنگ

اسی مندر کے قریب مگر اس کے احاطہ کے باہر اس زمین دوز سرنگ کا باب الداخلہ ہے جو چار مینار تک جاتی ہے۔ یہ دراصل بالا حصار سے یہاں تک آتی ہے اور یہاں سے محلات اور قلعہ کے نیچے نیچے ہوتی ہوئی باہر میدان میں چلی جاتی ہے جہاں سے موسیٰ ندی کے نیچے سے نکلکر داد محل پہونچتی ہے۔ داد محل کا راستہ بھنوارہ کے نام سے ۱۵ سال قبل تک موجودہ مسجد چوک کے قریب موجود تھا اور سر مرزا اسمٰعیل کے عہد وزارت میں اس کو صاف بھی کرایا جارہا تھا۔ اور چار مینار کے جانب جنوب مشرق جو مینار ہے اس کے نیچے کے کمرے میں اس سرنگ کا راستہ ہے۔ اس کمرہ کے باہر ایک ستون پر اب تک اہل ہنود پوجا پاٹ کیا کرتے ہیں قلعہ کے اندرونی محلات کی

سرنگ کا یہ راستہ آج سے (۲۰) سال قبل تک کھلا ہوا تھا۔ اب اس میں پتھر اور کوڑا کرکٹ بھر دیا گیا ہے۔

خواص پورہ اس سرنگ کے متصل جو راستہ جانب مغرب جاتا ہے وہ ان بیوتاتیہ تک پہنچتا ہے جو محلات کی ملازم عورتوں یا معتوب خواتین اور خواصوں کی رہائش گاہ تھے۔

راستہ بالاحصار ان بیوتات کے قریب بالاحصار کے بالائی ایوان تک پہنچنے کی سیڑھیاں ہیں جن کے ذریعہ سے بادشاہ اور اہل حرم اس ایوان تک آتے جاتے تھے۔ یہ دراصل زنانی راستہ ہے اور محلات سے شہزادے اور خواتین گوشہ پردے کے اندر چاندنی راتوں کا لطف اٹھانے کے لئے بالائی ایوان تک جاتے تھے۔ اس ایوان کی چھت پر سیڑھیوں کے اوپر جو چبوترہ ہے اس کو عوام تاناشاہ کی گدی کہتے ہیں اور مشہور ہے کہ یہیں بیٹھ کر وہ ان گانے والیوں کے گانے سے محظوظ ہوتا تھا جو قلعہ کے باہر کئی فرلانگ کے فاصلے پر بنی ہوئی بارہ دری میں گاتی تھیں۔ یہ بارہ دری اور اس کے محاذی ٹیلہ پر جو مسجد ہے وہ تارامتی اور پیما متی کے نام سے اب تک موسوم ہے۔

بادشاہوں کی خوابگاہیں بالاحصار اور اس کے ایوان کی تفصیلات تو کسی اور موقع پر بیان کی جائے گی۔ اب ہم اس راستہ سے واپس ہوکر سرنگ کے پاس سے پھر زنانی محلات میں داخل ہوتے ہیں۔ اور ملکہ کے محل کے وسیع صحن کی جانب مغرب جو سیڑھیاں ہیں ان پر سے چڑھ کر بادشاہوں کی خوابگاہوں میں پہنچتے ہیں۔ یہ خوابگاہیں انھیں ایوانات کی

بالائی منزلوں پر واقع ہیں۔ جن میں سے گذر کر ہم ملکہ کے محل کے صحن میں داخل ہوتے ہیں۔

ایوان سلطان محمد قطب شاہ ان شاہی خوابگاہوں میں سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آنے کے بعد سب سے پہلے جانب شمال سلطان محمد قطب شاہ کی خوابگاہ ملتی ہے۔ جو شرق رویہ ہے یہ خوابگاہ سلطان محمدؒ کی بنائی ہوئی تمام عمارتوں (مکہ مسجد خود اس کے مقبرے اور گنبد۔ تارامتی کے چاروں گوشوں کے ستونوں) کی طرح ڈریسڈ اسٹون سے آراستہ کی گئی تھی چنانچہ سنگِ خارا بیسمنٹ کے اوپر مصفی سنگ موسیٰ کا جو منقش حاشیہ بنایا گیا ہے وہ اس بادشاہ کی طبیعت کی سادگی اور صفائی کا بہترین ثبوت ہے اس ایوان کی بھی صرف دیواریں رہ گئی ہیں اور اوپر کی منزل منہدم کردی گئی ہے۔ یہ محض خوابگاہ نہیں ہے بلکہ بجائے خود ایک مکمل ایوان ہے۔ جس کے صحن میں بڑا خوبصورت سنگین بیضوی حوض ہے جو ترشے ہوئے سنگِ خارا میں بنایا گیا ہے۔ اصل خوابگاہ دالان۔ پیش دالان۔ حمام بیت الخلاء اور خوابگاہ کے متعدد کمروں پر مشتمل ہے

ایوان سلطان محمد قلی قطب شاہ ایوان محمد قطب شاہ کے محاذی اس کے چچا اور خسر سلطان محمد قلی کی خوابگاہ کا ایوان ہے جس کی دیواروں پر میناکاری کی گئی تھی اور خوبصورت پھول پتیاں مختلف رنگوں میں بنائی گئی تھیں۔ اس میں نیلا رنگ بہت نمایاں تھا۔ یہ قطب شاہوں کا شاہی رنگ تھا۔ ان خوابگاہوں میں موجودہ طرز کی طرح بیڈ روم کے ساتھ ڈریسنگ اور باتھ روم تعمیر کئے گئے ہیں۔ بیت الخلاء

واش ڈاؤن طریقے پر بنائے گئے ہیں۔ اور ہر کمرہ کی دیواروں میں پانی کے سفالی نل موجود تھے رحن میں گرم اور سرد پانی رات دن دوڑتا رہتا تھا۔ یہ نل باہر سے نظر نہیں آتے تھے بلکہ دیواروں کے اندر مخفی تھے مگر اب جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی دیواروں میں سے ان کا سلسلہ نمایاں ہوگیا ہے۔

ایوان سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ کی خوابگاہ کے صحن میں جانب شمال اس کے والد کی خوابگاہ ہے جس کی نچلی منزل پوری طرح محفوظ ہے یہ ایوان شمال رویہ ہے۔ اور اس کے درمیان میں تین بڑے ہال ہیں رحن کے پہلوؤں میں ہشت پہلو کمرے بنے ہوئے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ محمد قلی جانب مشرق کے ایک کمرے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ مسلسل تین ہشت پہلو کمرے ہیں جن میں سے ہر ایک کمرے کے اندر ہی حمام، بیت الخلاء اور اوپر کی منزل پر جانے کی سیڑھیاں موجود ہیں۔ ان کمروں کی ساخت انجینری کے کمالات پر مبنی ہے۔ اسی ایوان کے بالائی حصے میں جانب مغرب کونے میں لکڑی کا ایک بہت موٹا ستون پتھر کی دیواروں کے درمیان کھڑا کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستون دراصل کسی بڑے درخت کا پیڑ ہے جو کسی بھی ماہر نباتات کے لئے اب بھی دعوتِ تحقیق دیتا ہے۔ ایسے ہی چوبیس ستون جملہ دیواروں کے گوشوں میں چھتوں کا بوجھ سنبھالنے کیلئے پوشیدہ طور پر دیئے گئے ہیں۔

تاناشاہ کی آخری قیام گاہ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کا یہ ایوان بھی تاناشاہ کی گولکنڈہ کی آخری قیام گاہ تھا۔ اس لئے کہ زنانی محلات سے علحدہ اور بالا حصار کے باب الداخلہ دھیر جملہ کی نشست گاہ

سے قریب تر واقع ہے۔ محاصرۂ گولکنڈہ کے وقت تاناشاہ نے اسی ایوان کو اپنی قیام گاہ قرار دیا تھا۔ تاکہ مادنا دیوان اور رستم راؤ سپہ سالار فوج سے قریب تر رہ کر حالاتِ جنگ سے واقف ہوتا رہے اور شکست کی صورت میں حملہ آوروں کو اس کے گرفتار کرنے کے لئے زنانی محلات کے اندر نہ آنا پڑے۔ اسی ایوان میں اس نے آخری خاصہ کھایا تھا اور اپنے گرفتار کرنے والوں کو اپنے دسترخوان پر شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔

چنانچہ اسی شاہی دسترخواں سے فارغ ہونے کے بعد اسی جگہ سے وہ گرفتار ہوکر باہر نکلا تھا۔ اور اس کی گرفتاری کی خبر سن کر محلات کی خواتین اسی حصہ میں سے باہر نکل کر اس کے مقابل کی عمارت یعنی دفتر خانہ شاہی کی چھت پر چڑھی تھیں اور بالآخر شدت رنج والم کے باعث وہاں سے اس باؤلی میں کود گئی تھیں جو اس ایوان کی صحن میں شمالی سمت میں موجود ہے۔

اس ایوان میں جانب مشرق جو کمرہ ہے وہ دراصل تاناشاہ کی خوابگاہ تھا۔ اور چونکہ ہشت پہلو ہے اس لئے اس کے ہر پہلو میں خزانے پوشیدہ تھے۔ جو اس کی گرفتاری کے بعد دیواریں توڑ کر نکال لئے گئے۔ انھیں میں سے ایک پہلو میں بیت الخلاء ہے اور اس سے متصل حمام کی عمارت بھی ہے بیت الخلاء کے ایک گوشہ میں پانی کا ایک بہت بڑا اسفالی نل بھی پوشیدہ ہے جو اوپر کی منزل سے نیچے کی طرف آیا ہے۔

شاہی جھروکہ ایوان ابراہیم قلی قطب شاہ کے محاذی جانب مغرب بڑی اونچی اونچی کمانیں بناکر اس کے اوپر ایک باغ اور کئی حوض اور جانب مغرب اصل عمارت سے متصل پنج گوشہ شاہی جھروکہ بنایا گیا ہے جو کئی

منزلہ ہے۔ نچلی منزلوں کی کمانوں میں چونے کی جالیاں بنائی گئی ہیں۔ ان میں سے محلات کی خواتین اور ملکہ سپاہیوں کی پریڈ دیکھتی تھیں۔ اوپر کی شاہی منزل کی چھت اب موجود نہیں ہے۔ دیواریں کچھ موجود ہیں۔ اس جھروکہ کے سامنے ایک بہت بڑا مربع میدان مغرب کی طرف نظر آتا ہے اور جھروکہ کے عین مقابل میں اس جلوخانہ میں داخل ہونے کی کمان محفوظ ہے۔ اس کمان اور جھروکہ کے درمیان میدان کے وسط میں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی گئی تھی۔ جس وقت فوجیں کمان میں داخل ہوتیں اور بادشاہ کو سلامی دیتی تھیں تو یہ سلام گویا خدا کو پہنچتا تھا۔ اس جلوخانہ شاہی میں اب جدید فوجی بیارکس بن گئے ہیں۔ مگر جھروکہ اتنی بلندی پر واقع ہے کہ وہاں کھڑے رہنے سے میدان جلو خانہ کی وسعت کا اندازہ اور اس کے حدود معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور پورے قلعہ شہر حیدرآباد اور اطراف واکناف کے دلکش مناظر وہاں سے نظر آجاتے ہیں۔

اس جھروکے کے نیچے جو کمانیں ہیں وہ افسر الملک کے دور سپہ سالاری میں پچاس سال قبل گھوڑوں کے طویلے کا کام دیتی تھیں۔ ممکن ہے کہ قطب شاہی عہد میں بھی شاہی سواری کے ہاتھی اور گھوڑے اسی جگہ تیار رکھے جاتے ہوں تاکہ فوری ضرورت کے وقت کام آئیں۔

پدم شری فیاض الدین نظامی

قطب شاہوں کے عہد میں تشکیل شہری اور فن تعمیر

قبل اس کے کہ میں قطب شاہی عالیشان عمارتوں کے دلکش نوک و پلک اور خوبیوں کو بیان کروں ۔ اس کی شہری منصوبہ بندی کے خدوخال پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ کیونکہ شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی تشکیل یا ٹاؤن پلاننگ قطب شاہوں کے پاکیزہ ذوقِ سلیم، بلند حوصلگی اور دور اندیشی کا ایک زرین کارنامہ ہے۔ دراصل یہ شہر قرونِ وسطیٰ کی زبردست یادگار ہے ۔ جو مدتوں قطب شاہوں کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے آج بھی ماشاء اللہ یہ خوبصورت اور مبارک شہر آندھرا پردیش کی ناک ہے اور اس کی سماجی اور تمدنی تہذیب کا ایک عظیم گہوارہ ہے اب اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس شان و شوکت کا شہر بنانے کی نہ ہمت ہے نہ حوصلہ ۔ اگر اس کی خوبصورتی کو بحال رکھا جائے تو یہی موجودہ زمانہ کی بڑی کارگذاری ہوگی ۔ چنانچہ آج کل جو (clean city) کی مہم شروع کی گئی ہے وہ واقعی بڑی ہمت افزا اور قابل ستائش ہے ۔ اس موقع پر مجھے اہلِ یونان کی حلف یاد آتی ہے جو انہوں نے شہر ایتھنز کے متعلق اٹھایا تھا کہ ”ہم شہریانِ ایتھنز اپنے بزرگوں کے عطا کئے ہوئے ۔ خوبصورت شہر کو ہرگز نہیں بگاڑیں گے ۔ بلکہ اس کو بہتر سے بہتر بنائیں گے تاکہ ہمارے بعد آنے والی

نسلوں کو معلوم ہو کہ ہم اپنے بڑوں کے اچھے جانشین تھے۔"

زمانہ قدیم سے گولکنڈہ کو بہ حیثیت دارالسلطنت جو اہمیت حاصل تھی وہ محتاج بیان نہیں البتہ شہر کی منتقلی اور توسیع کے بتدریج مراحل کے متعلق تاریخ بتلاتی ہے کہ قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کی راجدھانی صرف گولکنڈہ ہی میں تھی جہاں شہر کے عوام کی آبادی بھی حصار کے اندر تھی۔ لیکن اس میں کشادہ راستوں کے ساتھ حکومت کی عمارتیں۔ رفاہِ عام کی عمارتیں اور بازارت کافی تعداد میں موجود تھے اور عوام کے لئے باغ بغیچے بھی سیر و تفریح کے لئے فراہم کئے گئے تھے۔ لیکن جوں جوں سلطنت کے سیاسی اغراض اور بڑھتی ہوئی سماجی اور بلدی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا۔ گولکنڈہ کی قدیم آبادی اس قدر گنجان ہو چکی تھی کہ حفظانِ صحت کے اعتبار سے شہر تقریباً ناقابل رہائش ہو گیا تھا۔ مزید براں پڑوسی ریاستوں کے انقلاب اور سیاسی قدر جز رنے مہاجرین کو اسی امن والے شہر کی طرف متوجہ کیا۔ خصوصاً احمد نگر کی تباہی کے بعد سینکڑوں خاندانوں کا یہاں آکر بس جانا شہر کو اور بھی متاثر کرنے کا باعث ہوا۔ یہ ایسی وجہ اطراف و اکناف کے باغات اور کھلے میدان اس کی زد میں آگئے اور من مانے مکانات اور بازارت خودرو طریقہ پر قلعہ کے باہر بننے لگے۔ یہاں تک کہ اس کا پھیلاؤ ٹولی چوکی اور کاروان سرائے تک پہنچ گیا۔ اس نازک صورتحال کا اندازہ کرتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ جو قدرتی طور پر ایک بیدار مغز، سلیقہ مند اور دور اندیش حکمران تھا۔ اپنے تدبر اور وزیر اعلیٰ حضرت میر محمد مومن کے زرین مشورہ سے موسیٰ ندی کے قریب و جوار میں ایک ایسا پر فضا خوش منظر اور وسیع رقبہ کا انتخاب کیا جو نہ صرف صورتِ حال کے لئے بلکہ آئندہ کی صدیوں میں آنے والی ضروریات کو پورا کر سکے۔

فی الحقیقت تشکیل شہری کے اعتبار سے یہ انتخاب نہایت موزوں ثابت

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ہوا جس کا فائدہ ہم آج تک اٹھا رہے ہیں۔ موسیٰ ندی کے علاوہ تالابوں، پہاڑوں اور دلکش وادیوں اور سبزہ زاروں سے بھرپور ہونے کی وجہ یہاں ایک خوبصورت شہر کے آباد ہونے کے قدرتی وسائل مکمل طور پر موجود تھے۔ یہ عجیب خوش قسمتی کی بات ہے کہ حضرت میر مومن جیسے بلند حوصلہ اور ذوق سلیم رکھنے والے پیشوائے سلطنت موجود تھے۔ جن کا شمار مملکت ایران کے صف اول کے سیاست دانوں اور دانشوروں میں کیا جاتا تھا اور خصوصاً جن کا اعلیٰ ذوق تعمیر شاہ عباس کی حکومت میں شہر اصفہان کی تعمیر میں جو ایران کا دارالخلافہ تھا پورا اترا تھا۔ چنانچہ ان کے سب دیرینہ تجربے اس شہر کی داغ بیل کے نکھارنے میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔ بقول نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول۔ حضرت میر مومن کی دلی آرزو تھی کہ یہ قطب شاہی شہر بھی ایران کے عظیم الشان شہروں کی ٹکر کا بن جائے۔ قدرت نے اس کو پورا کر دیا۔

تاریخ کے بموجب محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ برس بعد ۱۵۹۱ء م ۹۹۹ھ کی مبارک ساعتوں میں اس کی بنیاد ڈالی گئی اس کا صدر خاکہ قرون وسطیٰ کے شہروں کی طرح اس ڈھنگ سے تیار کیا گیا شہر کے بیچوں بیچ ایک عالیشان یادگاری عمارت ہو اور اس کے چاروں سمت کشادہ راستے ترتیب دیے جائیں اور پھر شاہی محلوں اور امراء کے مکانوں کے علاوہ عوام کے لئے منطقہ واری بستیاں جس میں مدارس، شفاخانے، بازارات، مہمان خانے اور کارخانے نہایت کشادہ راستوں کے ساتھ مربوط کئے جائیں اور سایہ دار درختوں سے آراستہ ہوں۔ اور ہر منطقہ کے لئے باغیچے اور تفریح گاہیں بھی فراہم ہوں۔ چنانچہ اس وضع اور قطع سے اس عالیشان شہر کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی۔ جس کی ابتداء چار مینار جیسی لاجواب عمارت سے ہوئی۔ اور خانۂ خدا کے لئے اس کے قریب دیوار میں اونچے مقام پر جگہ فراہم کی گئی۔ جہاں مکہ مسجد جیسی شاندار مسجد تعمیر کی گئی۔ چار مینار

تھے ۔ وہ شاعروں اور عالموں کا اتنا قدر دان تھا کہ جب کبھی شاہی باغوں سے میوہ آتا تو اس کا کچھ حصہ ان کے لئے ضرور روانہ کرتا ۔ اس نے جمشید کے قائم کئے ہوئے لنگر خانے کی امداد میں بھی کافی اضافہ کر دیا تھا ۔ جس کی وجہ سے عالموں اور شاعروں کو زیادہ فراغ حالی نصیب ہو گئی تھی ۔

ابراہیم نے تلنگی شاعری کی بھی بڑی قدر دانی کی ۔ اس کے عہد میں کئی تلنگی شاعر شاہی سرپرستی سے مستفید ہوئے ان میں سے ایک پونی گنٹی تیلی گنانے جو اس کے ایک امیر امین خاں کا متوسل تھا اپنی ایک نظم یاتی چرتر میں پانچ سو سطروں میں اپنی قدر دانی کا ذکر لکھا ہے اور کہتا ہے کہ جب میں نظم سنانے کے لئے گیا تو مجھے قریب بیٹھنے کی عزت بخشی گئی ۔ میرے جسم پر خوشبوئیں لگائی گئیں ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کا شال میرے کندھوں پر ڈالا گیا ۔ اور جواہرات کا ایک ڈبہ مجھے دیا گیا اور پھر نظم سنانے کی فرمائش کی گئی ۔

ان تمام بین قومی اور بین لسانی قدر افزائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی فضا اردو کے لئے بہت ہی سازگار بن گئی ۔ چنانچہ ابراہیم کے دور میں گولکنڈہ میں جو شاعر اردو شعر و سخن کی صورت گری کر رہے تھے ۔ ان میں ملّا خیالی فیروز اور سید محمود بہت مشہور رہیں ۔ ملّا خیالی اتنا مشہور اور خوشحال شاعر تھا کہ اس نے سنہ ۱۵۶۶ء میں ایک دو منزلہ خوبصورت مسجد قلعہ گولکنڈہ کے باہر اپنے پُر فضا باغ میں بنائی تھی ۔ جواب بھی موجود ہے ۔ ملّا خیالی کا کلام اب نہیں ملتا[1] لیکن بعد کے اساتذہ سخن ابن نشاطی وغیرہ نے اس کو استاد مانا ہے اور

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) میں ملّا خیالی کی ایک نو دریافت شدہ غزل شائع کی ہے (محمد علی اثر)

کے جانب شمال و مغرب عالیشان دولت خانہ عالی بنایا گیا جس کے جلو خانہ میں چاروں سمت چار بلند کمانیں کھڑی کی گئیں اور وسط جلو خانہ میں ایک مشت پہلو حوض جس کو "سو کا حوض" کہتے ہیں اور جس کی رفتار زمانہ نے سو کھا حوض اور بعد میں "گلزار حوض" کے نام سے شہرت دی۔ تعمیر کیا گیا۔ دراصل اس حوض کو "سو کا حوض" اس لئے کہا گیا کہ اس میں شہر کی داغ بیل کے صحیح سمت مقرر کرنے کے لئے Bench mark قائم کیا گیا۔ جو آج بھی اس حوض میں ہے جو کوئی سیاہ پتھر کی شکل میں چاروں سمت کے نشانوں کے ساتھ موجود ہے۔ دولت خانہ عالی سے گذرنے کے بعد شمال کی جانب لشکریوں۔ حوالداروں اور سلحداروں کے بڑے بڑے ایوان بنائے گئے تھے۔ اور ان سے گذرنے کے بعد متعدد عالیشان محلوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جن میں قابل ذکر چندن محل، گگن محل، سجن محل، ندی محل، حیدر محل خدا محل، داد محل، خدا داد محل، اور محل کوہ طور جا اکثر و بیشتر ندی کے کنارے اور اس کے قریب و جوار کے اونچے مقاموں پر تقریباً چھ سات مربع میل کے رقبہ پر ترتیب دیئے گئے تھے جن کے نام و نشان باقی نہیں۔ ان کی بلندی اور عالیشان ہونے کا ثبوت شہنشاہ عالمگیر کے اس جملہ سے ملتا ہے جب گولکنڈہ کے ختم ہونے کے بعد ان کی نظر "داد محل" پر پڑی تو دریافت فرمایا "این ملند بلند چیست" جب نعمت خان عالی نے عرض کیا کہ "این داد محل است" تو طنزاً فرمایا "آرے بیداد محل است" اور غالباً یہ اس کے بعد ہی ختم کر دیا گیا۔ شہر و عمارات کی اس خوش اسلوبی اور عظمت کے مدنظر متعدد نامور مورخین، سیاح اور شعراء جن میں تیوزنیر (reverneær) ولیم متھولڈ (Methold) فرشتہ اور شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد کے مشہور مورخ خافی خاں اور محمد ساقی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ شہر آب و ہوا اور گل و گلزار کی بدولت قدرت کا عجیب و غریب نمونہ ہے کوئی اس کو زمین پر بہشت کا ایک ٹکڑا کہتا ہے۔ بقول سکندر علی وجد ~

فضا مان فضا ذرہ فتنہ حسین ہے   حقیقت میں ملک دکن گل زمین ہے
بہت خوش نما شہر دیکھے ہیں میں نے   مگر تیرا جیا دو کہیں نہیں ہے۔

حضرت میر مومن نے بھی اپنے قصیدہ تہنیت میں فرمایا ہے ؎

چو صفاہان نو شد از شاہجہان عباس شاہ

حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوے

تشکیل شہری کی اس مختصر داستان کے بعد اب میں قطب شاہی فن کی تعمیر کی خصوصیات عرض کروں گا۔ جو اپنی جسامت، بلندی اور مضبوطی کے ساتھ ساتھ اپنی خوبصورتی اور لطافت میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان عمارتوں میں، میناروں، کمانوں اور گنبدوں کو نمایاں اور خصوصی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ ان کو شاہی محلوں رفاہِ عام کی عمارتوں مسجدوں، عاشور خانوں اور شاہی مقبروں میں بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ چار مینار کو لیجئے۔ اس کے دو اہم اجزائے عمارت ایک سو نو دفیٹ بلند فلک بوس مینار اور خوبصورت بلند و بالا ۸۰ فیٹ اونچے کمان ہیں ان دونوں میں جو نہایت نیا تلا تناسب اور امتزاج پایا جاتا ہے وہ قطب شاہی فنِ تعمیر کا ایک حسین کرشمہ ہے اور ساتھ ہی ان کا مناسب نقش و نگار اس کے حسن کو دو بالا کرتا ہے۔ اس کے چاروں مینار جن میں اوپر پہنچنے کی سیڑھیاں بھی ہیں جہاں سے شہر کا پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔ مہندس معماری کمال الدین شیرازی نے ان بلند میناروں کو چار حصوں میں نہایت مناسبت سے بانٹ کر تین خوبصورت گنگیتوں کو جہرد کون اور نشستوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی سجیلی کمانوں سے مرصع کیا ہے۔ جو بندریج اونچائی کی مناسبت سے کلس تک پہنچ کر مینار کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ اسی طرح سامنے کے چاروں رخ والی زبردست اسّی فٹ اونچی کمانوں پر خوبصورت بالاخانوں اور برامدوں کی زیبائش نے چاروں رخ کی زینت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اوپر کی منزل پر پانی کا خزانہ، خوبصورت مسجد اور عاشور خانہ بنایا گیا ہے جس کی بدولت زبردست سوکوں میں بھی یہ عمارت محفوظ رہ سکی۔ کیوں نہ ہو اس فلک بوس عمارت کی تاریخ بھی "یا حافظ" سے نکلتی ہے تعجب ہے کہ یہ جسیم عمارت جو صرف چونے پتھر اور اینٹ سے تعمیر کی گئی ہے تقریباً چار سو برس سے بغیر کسی نقص کے اپنی جگہ پر تزک و احتشام سے قائم ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس عالیشان عمارت کی نگہداشت خاطر خواہ نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کے ماحول کو جاذب نظر بنایا گیا۔ بلکہ گذشتہ بیس پچیس برس کے عرصہ میں گندی عمارتیں گرد و پیش بنا دی گئیں۔ علاوہ ازیں چاروں مرکزی راستوں پر دوکانوں کا بڑھ بڑھ کر آگے ہونا نہ صرف راستوں کو تنگ بنا دیا بلکہ چارمینار اور چار کمان کے منظر کو بھی کافی متاثر کیا۔

قطب شاہی عمارتوں کا دوسرا شہکار مکہ مسجد ہے جس کا شمار اس کی وسعت اور شان کے اعتبار سے ہندستان کی چنندہ بڑی مساجد میں ہوتا ہے۔ لیکن اس مسجد کی بعض تعمیری خصوصیات ہندستان ہی نہیں بلکہ ایشیاء کی بڑی بڑی مسجدوں سے بھی نمایاں ہیں۔ خصوصاً اس کے اونچے اونچے زبردست کمانوں کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھروں کو جو تقریباً چالیس فیٹ اونچے ہیں خمیدہ تراشے گئے ہیں تاکہ دو خمیدہ پتھر مل کر کمان تعمیر ہو جائے یہ انوکھی طرز تعمیر ہندستان اور بیرون ہند میں بھی عنقا ہے۔ مسجد کی مکمل تعمیر صرف گرانائیٹ پتھر سے کی گئی ہے۔ جو نہایت سخت مانا گیا ہے۔ اسی پتھر میں براکٹ، جالیاں اور دیگر نقوش تراشے گئے ہیں۔ لیکن اس شاندار مسجد کے میناروں کو شہنشاہ عالمگیر کے حکم "ہرچہ گیرید مختصر گیرد" کی بناء پر پست کر دیا گیا۔ جس سے مسجد کی شان و شوکت بے حد متاثر ہوئی۔ ورنہ عمارت کی وسعت اور بلندی کی وسعت اور بلندی کی مناسبت سے ان میناروں کی اونچائی چارمینار سے کم نہیں ہوتی۔ بہرصورت اب بھی ہر اعتبار سے نہ صرف قطب شاہی دور کی بلکہ ہندستان

کی ایک منفرد عمارت ہے یہاں بھی مجھے عرض کرنا ہے کہ مکہ مسجد کے ماحول کو کافی درست کرنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ یہ مقام قلب شہر میں ہونے کی اہمیت رکھتا ہے جہاں اکثر اوقات مختلف ممالک کے سیاح آتے رہتے ہیں۔ میری ناچیز رائے ہے کہ مکہ مسجد اور چارمینار کے درمیان تمام گندی عمارتوں کو حاصل کرکے منہدم کیا جائے اور صرف چمن بندی کی جائے تو یہ نہایت دلفریب منظر ثابت ہوگا۔ علاوہ ازیں مسجد کے اندرونی صحن میں جو شاہی مقبرے ہیں وہ مدتوں سے بغیر کسی عمارت کے تھے کچھ عرصہ قبل اس پر پتھر کی عمارت بناکر مسجد کے رُخ کو کافی متاثر کیا گیا۔ کاش کہ پھر اس کو نکال دیا جائے اور قبور زیر آسمان کردئے جائیں تو قلی قطب شاہ کی روح خوش ہوگی۔

ڈاکٹر محمد سلیمان صدیقی

صوفیائے گولکنڈہ

تمدنی ارتقاء کے عظیم الشان دھارے میں مختلف اقوام اور انسانی طبقوں کی ہیئت زندگی ایسے ایسے تغیرات سے دوچار ہوتی ہے کہ بعض دفعہ کسی قوم یا طبقے کی شکل جب ماضی کے آئینہ میں دیکھی جاتی ہے تو وہ اپنی موجودہ حالت سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ بسا اوقات یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ماضی کے آئینہ میں جو تصویر دکھائی دے رہی ہے وہ اس قوم کی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ہیئتوں میں جو تبدیلی آتی ہے وہ مادی مظاہر سے جھلکی پڑتی ہے اور تاریخی عجائب خانوں میں گزری ہوئی تہذیبوں کے چھوڑے ہوئے ساز و سامان اس کی اصل شکل و صورت کا پتہ دیتے ہیں۔ لیکن کسی تہذیب کی خارجی ہیئت کا تغیر اس قدر اہم نہیں ہوتا جس قدر اس کا داخلی تغیر اہم ہوتا ہے یہ داخلی تغیر حقیقتاً اقدار کا تغیر ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بعض احباب جو ملا استثنا تمام اقدار کو ابدی سمجھتے ہیں وہ شاید میری اس رائے سے مطمئن نہ ہوں کہ تہذیب کے مادی مظاہر کی طرح تہذیبی اقدار بھی ارتقاء پذیر اور تغیر پذیر رہتی ہیں۔ درحقیقت یہ اقدار تغیرات ہی ہوتے ہیں جو پہلے کسی تمدن کے نفس میں واقع ہوتے ہیں جو بالآخر کسی تہذیب کی

خارجی ہیئت کی شکست وریخت اور پھر اس کی تشکیل جدید کا سبب بنتے ہیں۔ عجائب خانوں میں تاریخی نوادر کو دیکھ کر کسی گذرے ہوئے تمدن کا تصور سہل ہے لیکن کسی گذرے ہوئے تمدن کی اقدار کو نئی قدروں کے زمانے میں سمجھنا نہایت مشکل کام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی نئی نسل کے وجود کا احساس ہونا ہی اس وقت ہے جب وہ نسل ماضی کی اقدار سے گریزاں اور نئی اقدار کی تخلیق میں سرگرم ہوتی ہے۔ ہر نئی نسل کا ایسا عمل بجائے خود ایک قانون فطرت ہے۔ لیکن کسی بھی قوم میں تہذیبی اور تمدنی توازن اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک اس میں نئی اور پرانی قدروں کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، ورنہ جب کسی ایک ہی زمانے میں متقدم نسلیں جب نئی نسلوں کی اقدار کو سمجھنے اور سراہنے سے انکار کرتی ہیں اور بالآخر نئی قدروں کو سمجھنے کے قابل نہیں رہتیں اور دوسری طرف متاخر نسلیں جب قدیم اقدار کو سمجھنے سے انکار کرتی ہیں اور بالآخر نابلد رہ جاتی ہیں تو تمدنی ساخت میں ایسا شگاف پڑ جاتا ہے جس سے نقصانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ نئی اقدار اور پرانی قدروں میں کسی امتزاج کی مصنوعی کوشش کی جائے۔ نئی قدروں کا بہرحال استقبال کرنا ہوگا۔ تاہم قدیم اقدار کا عرفان حاصل کرنے سے اس کا امکان ہے کہ نئی اقدار کی تخلیق زیادہ صحت مند، مفید اور مستحکم اصولوں کے مطابق ہوسکے۔

قدیم اقدار میں سب سے زیادہ قابل ذکر روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں جو مذہب کے سائے میں تخلیق ہوئی ہیں اور مذہب ہی کے سائے میں پروان چڑھی ہیں۔ ایسی ہی اقدار میں صوفیانہ اقدار شامل ہیں۔ ہندستان کی تاریخ کے قدیم ترین ادوار سے یہاں کی تہذیب و تمدن پر کسی نہ کسی مذہب کے تصوف کا گہرا اثر رہا ہے۔ قرون وسطیٰ

میں ہندوستانی تمدن پر اسلامی تصوف کا جس قدر زبردست اثر رہا ہے۔ تاریخ تمدن کے طالب علم کو وہ ایک حیرناک صورت حال سے دوچار کرتا ہے۔

دکن میں صوفیائے اسلام کی آمد کا پتہ چھٹی صدی ہجری یعنی بارھویں صدی عیسوی سے چلتا ہے حاجی رومی (وفات ۵۵۵ ہجری) جن کا وصال شاہ پیٹ قلعہ ارک بیجاپور میں ہوا۔ ان کے علاوہ پیر میٹھے[1] پیر جمنا، پیر معبری کھنڈایت، پیر مقصود، شیخ نصیر الدین نصر اللہ ولی[2] سید شاہ حسام الدین[3] (وفات ۶۸۰ ہجری) بابا شرف الدین (وفات ۶۸۷ ہجری) شیخ فرید الدین[4] (وفات ۷۳۹ ہجری) شیخ سعد زنجانی[5] (وفات ۷۴۰ ہجری) امیر حسن علی سنجری[6] (وفات ۷۳۸ ہجری) منتخب الدین[7] برہان الدین کے بھائی (وفات ۷۰۹ ہجری) سید یوسف سید راجہ[8] والد حضرت بندہ نواز وفات ۷۳۱ھ دکن میں آئے۔ یہ صوفیا کرام بیجاپور، خلد آباد اورنگ آباد گلبرگہ گولکنڈہ کے علاقوں میں آکر مقیم ہوئے اور ان کی آخری آرام گاہیں آج تک ان علاقوں میں موجود ہیں۔ جب محمد تغلق اپنا پائے تخت دہلی سے دولت آباد میں منتقل کیا

---

[1] مولوی محمد ابراہیم۔ روضۃ الاولیاء بیجاپور صفحہ ۲۱-۲۲-۲۳-۲۵ [2] محمد سلطان ارمغانی سلطانی صفحہ ۱۸۸ دیکھیے عبد الجبار ملکاپوری۔ محبوب ذی المنن تذکرہ اولیاء دکن حصہ اول صفحہ ۳۹۳ [3] عبد الجبار صفحہ ۱۶۳ اور حدیقہ رحمانی صفحہ ۵۳ [4] مولوی بشیر الدین واقعات مملکت بیجاپور صفحہ ۵۲۳ [5] مولوی بشیر الدین واقعات مملکت بیجاپور صفحہ ۵۲۲

[6] روشن علی روضۃ الاقطاب صفحہ ۲۰۰ [7] رونق علی۔ روضۃ الاقطاب صفحہ ۲۰۹
[8] رونق علی صفحہ ۷۰، دیکھو محمد سلطان ارمغانی سلطانی صفحہ ۳۰ اور ڈی ین دیورائے شارٹ ہسٹری آف پرشین لٹریچر۔

تو ذی مرتبت صوفیا کی ایک بڑی تعداد دکن آگئی[1]۔ چنانچہ دکن میں بہمنی سلطنت کے آغاز سے پہلے یعنی ۷۴۸ ہجری[2] / ۱۳۴۷ عیسوی سے قبل خلد آباد۔ اورنگ آباد، بیجاپور گلبرگہ۔ رائچور، حیدرآباد، کمٹریہ، اننت پور اور جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں مختلف سلسلہ ہائے سلوک کے صوفیائے اسلام دکن میں آچکے تھے۔

۷۴۸ ہجری / ۱۳۴۷ عیسوی میں بہمنی سلطنت کے قیام میں شیخ سراج الدین جنیدی کی شخصیت کا بڑا دخل رہا ہے۔ معتبر اور معاصر تاریخی ماخذ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ علاؤ الدین حسن بہمنی شاہ حضرت سراج الدین جنیدی ہی کی وجہ سے حکمران بن سکا[3]۔ حضرت شیخ نے اس سلسلہ میں جو تدبیریں کی تھیں وہ ظاہری تدبیروں کی تاویل کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں لیکن اس کے باوصف تاریخ کا نہایت محتاط طالب علم بھی اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تدابیر ظاہری اتنی اہم نہیں تھیں جس قدر ایک عظیم ترین صوفی شخصیت کا وہ طلسمی اثر کار فرما تھا۔ جس کی مادی تعبیر و توجیہہ بظاہر ممکن نہیں ہے۔ حضرت سراج الدین جنیدی کے بعد سلطنت بہمنیہ میں ہندوستان اور بیرون ہند سے مختلف سلسلوں کے اور اکابر صوفیا بھی آئے جن میں ۸۵۳ ہجری میں سید محمد گیسو دراز[4] ۸۳۱ ہجری میں حضرت سید شاہ نور اللہ کرمانی[5]۔ اور پھر ۸۳۴ ہجری میں حضرت سید شاہ خلیل اللہ کرمانی[6]

---

[1] رونق علی۔ دیکھو صفحہ ۵، ہارون خان شروانی: بہمنیز آف دی دکن پہلا اور دوسرا باب [2] محمد قاسم فرشتہ، انگریزی بزگ۔ جلد دوم صفحہ ۲۹۰ [3] رفیع الدین شیرازی تذکرۃ الملوک مخطوطہ آصفیہ نمبر ۱۰۸۱ دیکھو مولوی ظہیر الدین احمد شاہ بہمنی صفحہ ۸ اور محمد سلطان ارمغان سلطانی [4] محمد اکبر حسینی جوامع الکلم دیکھو محمد علی سامانی سیر محمدی صفحہ ۳۲ تا ۴۳ [5] سید علی طباطبائی برہان صفحہ ۵۴ اور ۶۵ [6] محمد متونی جامع منیدی صفحہ ۴۴ دیکھو سید علی طباطبائی برہان ماثر صفحہ ۶۵ اور فرشتہ انگریزی جلد دوم صفحہ ۴۱۹

اور اسی زمانہ میں سید سادات سید محمد حنیف[1] حضرت ابراہیم ملتانی[2] بھی دکن آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ سلطنت بہمنیہ کے اختتام تک دکن میں قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ رفاعیہ۔ سلسلوں کے صوفیا کی ایک پوری تنظیم قائم ہو چکی تھی۔

ان ہی حالات میں سنہ ۹۲۴ ہجری ۱۵۱۸ عیسوی[3] میں سلطان قلی قطب شاہ نے دکن میں اعلان خود مختاری کیا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ کم و بیش اس زمانہ تک عالم اسلام میں شیعہ اور سنی کشمکش کی وہ نوبت ہرگز نہیں تھی جو ۱۵۰۱ عیسوی میں ایران کے صفوی انقلاب کے بعد شدید تصادم اور نفرت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ صفوی انقلاب سے پہلے ان دونوں طبقوں کے عظیم رہنما کم و بیش مشترک تھے جس کی سب سے اچھی مثال حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانی کی ہے اور اس کے بعد خود اسماعیل صفوی کے والد حضرت شاہ صفی الدین کی ہے کہ اہل تشیع ان بزرگوں کو اپنا رہنما مانتے تھے اور آج بھی مانتے ہیں۔ دوسری طرف اہل طریقت انھیں اپنے وقت کے اکابر صوفیا میں شمار کرتے تھے اور ان سے سلسلہ بیعت قائم تھا[4]۔

صفوی انقلاب کے بعد سنی اور شیعہ قیادت کی یک جہتی ختم ہو گئی۔ ایران میں یہ خلیج زیادہ وسیع تھی لیکن ہندستان اور بالخصوص گولکنڈہ میں اس انقلاب کی

---

[1] محمد سلطان آئینہ بیدر، دیکھو غلام یزدانی۔ بیدر اکس ہسٹری اینڈ مانیومنٹس صفحہ ۲۰۸ اور ۲۰۹ [2] شیخ عبد القادر مخزن الکرامات۔ ۲۵۹ [3] شاہ رو کور گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہ صفحہ ۵

[4] محمد متوفی، جامع مفیدی

کی نوعیت اس قدر تلخ اور شدید نہیں تھی - چنانچہ حضرت میر محمد مومن استرآبادیؒ[1] کو شیعہ اور سنی دونوں آج بھی مانتے ہیں - صفوی دور سے یہ غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی کہ شیعہ صوفی نہیں ہوتے اور صوفی شیعہ نہیں ہوتے لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں اب ایسا محسوس کیا جا رہا ہے کہ نفس واقعہ ایسا نہیں ہے حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانی کے فرزند حضرت شاہ خلیل اللہ بت شکن کرمانی اور ان کے فرزند شاہ نور اللہ کرمانی کے مزارات بھی دکن میں موجود ہیں - شیعہ احباب انھیں شیعہ سمجھتے ہیں - لیکن اس خانوادہ کے جو سجادہ نشین اس وقت ہیں وہ بھی سنی صوفی ہیں - اس خانوادہ کے یہاں جو عظیم الشان تاریخی اسناد موجود ہیں ان کے ملاحظہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گھرانہ بہر صورت ایک صوفی گھرانہ تھا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان کا باشندہ تھا دوازدہ آئمہ کا پرستار[2] اور اس بات کا مدعی تھا کہ اس نے بارہ اماموں کی بندگی صفویوں کی اتباع میں شروع نہیں کی تھی بلکہ صفوی انقلاب سے پہلے ہی یہ اس کا عقیدہ تھا سلطان قلی قطب شاہ کو حضرت شاہ نور الدین نعمت اللہ ثانی سے ارادت تھی[3] جنکی یہ پیشنگوئی تھی کہ سلطان قلی بادشاہ بنے گا ساتھ ہی ساتھ ایسے تاریخی اسناد اور خود سلطان قلی کے فرامین موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو حضرت خواجہ بندہ نواز حضرت شاہ ابراہیم ملتانی کے خانوادوں سے بھی گہری عقیدت تھی سلطان قلی کے علاوہ

---

[1] محمد مستوفی - جامع مفیدی

[2] ڈاکٹر زور میر محمد مومن - دیکھو مراد علی طالع تذکرہ اولیائے حیدرآباد صفحہ ۴۴

[3] مجید صدیقی - تاریخ گولکنڈہ - صفحہ ۱۴ - ۲۸ - ۲۷ -

اس کی صاحب کمالی کا ذکر کیا ہے۔

سید محمود کا ذکر بھی بعد کے اردو شاعروں خصوصاً وجہی اور ابن نشاطی نے کیا ہے۔ اور اس کے ذوق سخن کی تعریف کی ہے۔ لیکن اس کا کلام بھی اب تک نہیں ملا۔[۱]

فیروز۔ اصل میں بیدر کا باشندہ تھا۔ اور اس کا ذکر بہمنی دور کے تحت آ چکا ہے۔ اور وہ ان صاحبانِ کمال میں تھا جو مختلف مقامات سے گولکنڈہ آکر ابراہیم قطب شاہ کی قدردانی سے سرفراز ہوئے تھے۔ انہوں نے گولکنڈہ میں جو کلام لکھا اس کا اب تک پتہ نہ چل سکا[۲] لیکن وجہی اور ابن نشاطی دونوں اس کے مداح سرا ہیں۔ وجہی لکھتا ہے ؎

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں ۔۔۔ دعا دے کہ چومے مرے ہاتھ کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس ۔۔۔ کہ پڑھنے کو عالم کرے سب ہوس
تو یوں کر کر خصلت یو تجھ آئے نا ۔۔۔ کہ توں خوش اپس ہور کسے بھائے نا
توں ایسی طرز دل تے پنجا نوی ۔۔۔ کہ دوسرے کریں سب تری پیروی

ب۔ عروج کا زمانہ
سنہ ۱۵۸۰ء سے ۱۶۷۲ء تک

ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت گولکنڈہ اردو کا ایک مرکز بن چکا تھا۔ وجہی، احمد اور غواصی اسی کے دور میں پیدا ہوئے اور اردو شعر و سخن کے ذوق سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کا فرزند محمد قلی قطب شاہ

---

[۱] [۲] ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ اردو ادب" (جلد اول) میں محمود اور فیروز کی بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار یکجا کیے ہیں (محمد علی اثر)

اس کے ورثاء ابراہیم قطب شاہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ جو شیعہ مسلک کے پیرو سمجھے جاتے ہیں، صوفیائے کرام سے ان لوگوں کے تعلقات نہایت گہرے اور عقیدت مندانہ تھے۔ قطب شاہی خانوادہ صوفیائے کرام کا بے انتہا ادب کرتا تھا اور ان سے گہری عقیدت اور ارادت تھی یہاں تک کہ قطب شاہی خاندان اور صوفی گھرانوں میں متعدد رشتے بھی ہوئے۔ جس کی بہترین مثالیں حضرت حسین شاہ ولی اور خود ابوالحسن تاناشاہ کی ہیں۔

قطب شاہی سلطنت کے قیام اور استحکام میں صوفیا کا جو حصہ رہا ہے۔ اس میں سلطان قلی کا واقعہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح ابراہیم قطب شاہ کا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ ابراہیم قطب شاہ جمشید قطب شاہ کا بھائی اور تخت سلطنت کا آرزومند تھا۔ زمانہ شہزادگی میں ملک میں نامساعد حالات سے گھبرا کر اس نے وجیانگر کی راجدھانی میں پناہ لی۔[1] وجیانگر جانے سے پہلے اس نے حضرت محمد شمس الدین ملتانی[2] (وفات ۹۳۵ھ) کے پوتے حضرت بدرالدین ملتانی[3] اس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں انہوں نے وجیانگر میں ابراہیم قطب شاہ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ ان کی دعا قبول ہوئی ہے بہت جلد جمشید کا تخت خالی ہو جائے گا اور ابراہیم قطب شاہ بادشاہ بنے گا۔[4]

۱۔ ہارون خان شیروانی کلچرل اینڈ ایڈمنسٹریٹو سٹ اپ انڈر ابراہیم قطب شاہ اسلامک کلچر ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۳۲ دیکھو مجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ

۲۔ عبدالقادر مخزن الکرامات صفحہ ۲۹۱

۳۔

شیخ ابراہیم ملتانی

↓

شیخ محمد شمس الدین ملتانی

شیخ ابراہیم محی الدین — شیخ اسحاق — شیخ فخرالدین — شیخ بدرالدین — شیخ اسماعیل

۴۔ عبدالقادر مخزن الکرامات صفحہ ۱۹۷، اور ۱۹۸۔

جس وقت ابراہیم قطب شاہ بدرالدین ملتانی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت اسے فی الفور کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔ وجیا نگر جانے سے پہلے اس نے اس غرض کے تحت حضرت خواجہ بندہ نواز کے پوتے حضرت ید اللہ (وفات ۸۵۲ ہجری) کی خدمت میں حاضری دی تھی۔ حضرت ید اللہ حسینی نے ابراہیم قطب کو ایک کلاہ ارادت اور آفتاب گیری عطا کی جو سلسلہ ارادت سے منسلک ہونے اور تخت پر رونق افروز ہونے کی علامتیں تھیں۔[۱] ابراہیم قطب شاہ ان تحفوں کے ساتھ وجیانگر پہونچا اور جب جمشید قطب شاہ کا انتقال ہوگیا تو وہ گولکنڈہ واپس آیا اور اس کا جانشین ہوا۔[۲]

خانوادہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے ایک اور بزرگ حضرت سید حسین شاہ ولی کو (وفات ۱۰۶۸ھ اور ۱۶۵۷ء) ابراہیم قطب شاہ نے بیدر سے گولکنڈہ آنے کی دعوت دی اور انھیں نہ صرف فوج کا ایک ذی اقتدار حاکم بنایا بلکہ محکمۂ تعمیرات بھی ان کے سپرد کیا اور اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی۔[۳] حیدرآباد کا مشہور تالاب حسین ساگر اور خیریت آباد کی جامع مسجد اور دیگر اہم تعمیری کام حسین شاہ ولی کے کارناموں کی یادگار ہیں۔[۴]

محمد قلی قطب شاہ اگرچہ سختی کے ساتھ شیعہ عقیدہ کا پابند سمجھا جاتا ہے لیکن وہ نہایت وسیع المشرب اور صوفی دوست بادشاہ تھا۔ حضرت خواجہ بندہ نواز

---

[۱] عبدالقادر مخزن الکرامات صفحہ ۱۹۷ - ۱۹۸ اور ۱۹۹ [۲] عبدالقادر مخزن الکرامات صفحہ ۱۸۰ اور ۱۸۵ [۳] علی طالع تذکرہ اولیائے حیدرآباد صفحہ ۵ [۴] عبدالجبار ملکاپوری، محبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن جلد اول صفحہ ۲۷۲ مجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ [۵] سید علی اصغر بلگرامی مآثر دکن بلگرامی، ہسٹارکل اینڈ ڈسکرپٹیو اسکیچ آف ہز ہائینس ان دی نظام ڈومینین صفحہ ۵۷۱

حضرت ابراہیم ملتانی حضرت نور اللہ کرمانی کے خانوادوں سے اس کی عقیدت بہت قوی تھی ان خانوادوں کے حضرات کے نام اس نے جو فرامین اور سندیں جاری کی ہیں وہ عقیدت اور احترام میں ڈوبی ہوئی ہیں ان فرامین اور اسناد پر ادب اور عقیدت کے اظہار کے طور پر اس نے شاہی مہر ثبت کرنے کے بجائے دستخط ثبت کیے ہیں۔

گولکنڈہ کے صوفی خانوادوں کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے بعد محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ نے بھی حسن مراسم اور حسن سلوک کی روایات کو باقی رکھا جو انعام اور معاشیں پہلے حکمرانوں نے دی تھیں نہ صرف یہ کہ وہ بحال رکھی گئیں بلکہ ہر قطب شاہی بادشاہ نے اپنے زمانے میں اس میں اضافہ کئے۔ محمد قطب شاہ اپنے پیشروں اور جانشینوں کی نسبت بہت بڑا عالم اور علم دوست تھا۔ تصوف سے اس کی دلچسپیاں زیادہ تر علمی نوعیت کی تھیں۔ اس کے دربار میں ایسے علماء کی آمد و رفت زیادہ تھی جو علوم معرفت میں گہری نظر رکھتے تھے خود اس کی نظم و نثر میں علوم معرفت کی بصیرت جھلکتی پڑتی ہے۔ اس کے جانشین عبداللہ قطب شاہ کی تعلیم و تربیت اگرچہ بہت اچھی ہوئی تھی لیکن اسے علوم معرفت سے زیادہ اہل طریقت سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ ایسی شہادتیں ملتی ہیں کہ وہ صوفیائے کرام کی خانقاہوں پر حاضری دیا کرتا تھا[۱]۔ ابوالحسن تاناشاہ حضرت شاہ راجو کا مرید تھا آپ حضرت خواجہ بندہ نواز کے خانوادہ کے اہم صوفی تھے[۲] اس نے آپ کی خانقاہ میں فقیرانہ زندگی گزاری تھی[۳]۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی لڑکی کی شادی جن حالات میں ابوالحسن

---

[۱] ڈاکٹر زور سیر گولکنڈہ صفحہ ۴۸ - دیکھو ڈاکٹر زور فرخندہ بنیاد حیدرآباد صفحہ ۲۴، ۲۶

[۲] عبدالجبار ملکاپوری محبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن جلد اول صفحہ ۳۴۱

[۳] عبدالجبار ملکاپوری صفحہ ۳۴۱ جلد اول۔

کے ساتھ ہوئی ان روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ پر صوفیائے گولکنڈہ کا کس قدر اثر تھا ابوالحسن تانا شاہ کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ ابوالحسن کے بادشاہ بننے کے بعد حضرت شاہ راجو نے ایک انار بھیجا ابوالحسن نے انار کے صرف چودہ دانے کھائے اور باقی واپس کر دیا جس پر شاہ راجو نے یہ کہا افسوس اس کی قسمت میں چودہ سال ہی کی بادشاہت ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور چودہ سال بعد ابوالحسن کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

صوفیوں اور قطب شاہی بادشاہوں کے تعلقات کے بارے میں ایسی کئی روایات مل جاتی ہیں جن کو خوارقات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور آج کے ذہن کے لئے خوارقات کو سمجھنا ایک مشکل کام ہے لیکن تاریخ اور علوم معرفت کا طالب علم ان واقعات کے امکان سے انکار نہیں کر سکتا۔

سطور ما قبل میں ان مختلف صوفی خانوادوں کی جانب اشارے کئے گئے ہیں جو گولکنڈہ سے تعلق رکھتے تھے۔

یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ ان سب خانوادوں کے سارے صوفیا اور مشائخین کا مفصل تذکرہ پیش کیا جا سکے تاہم ان میں سے چند بزرگوں کے حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں[۱]

(۱) حضرت شاہ چراغ
وفات سنہ ۹۵۰ھ ۱۵۴۳ء

(۲) حضرت شاہ نورالہدیٰ
وفات سنہ ۱۰۰۰ھ / سنہ ۱۵۹۲ء

(۳) حضرت شاہ نوراللہ حسینی
وفات سنہ ۱۰۱۵ھ سنہ ۱۶۰۶ء

---

[۱] مراد علی طالع تذکرہ اولیائے حیدرآباد۔

(۴) حضرت مومن چپ

وفات سنہ ۱۰۲۵ھ سنہ ۱۶۱۵ء

(۵) حضرت مخدوم سالار چشتی

وفات سنہ ۱۰۳۵ھ سنہ ۱۶۲۵ء

(۶) حضرت میراں حسین حموی

وفات سنہ ۱۰۴۹ھ سنہ ۱۶۳۸ء

(۷) حضرت شاہ شبلی

وفات سنہ ۱۰۵۰ھ سنہ ۱۶۳۹ء

(۸) حضرت برہنہ شاہ

وفات سنہ ۱۰۶۴ھ سنہ ۱۶۵۴ء

(۹) حضرت حسین شاہ ولی

وفات سنہ ۱۰۶۸ھ سنہ ۱۶۵۷ء

(۱۰) حضرت میراں جی حسینی خدانما

وفات سنہ ۱۰۷۰ھ سنہ ۱۶۵۹ء

(۱۱) حضرت امین الدین ثانی چشتی

وفات سنہ ۱۰۷۴ھ سنہ ۱۶۶۳ء

(۱۲) حضرت شاہ راجو

سنہ ۱۰۹۲ھ سنہ ۱۶۸۲ء

ان صوفیاے کرام میں میراں جی خدانما اور شاہ راجو قتال صاحب سلوک ہونے کے علاوہ صاحب قلم بھی تھے۔

حضرت میراں جی خدانما نے دکنی اور فارسی میں نظم و نثر کی کثرت سے تصانیف چھوڑیں جن سے اب کم دستیاب ہوتی ہیں آپ کی تصنیفات میں شرح تمہیدات عین القضات، رسالہ وجودیہ، شرح مرغوب القلوب کے علاوہ شاعری میں بھی مثنویاں ہیں۔ دکنی میں آپ کے رسائل اردو نثر کے اولین آثار سمجھے جاتے ہیں۔[1]

---

[1] ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ میراں جی خدانما صفحہ ۲۰۲ دیکھو۔ عبدالحق اردو کی نشو ونما میں صوفیاے کرام کا حصہ صفحہ ۵۲ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب ذی المنن تذکرہ اولیاے دکن جلد دوم صفحہ ۵۹ و خباب بلگرامی۔ مآثر دکن صفحہ ۴۱ سید داؤد اشرف مضمون مطبوعہ رہنماے دکن میراں جی خدانما۔

حضرت شاہ راجو قتال بن سید نصر اللہ حسینی بھی بلند پایہ عالم اور مصنف تھے۔ نظم و نثر میں آپ کی کئی یادگار تصنیفات موجود ہیں جو آپ کے ارشادات ملفوظات مواعظ اور نصائح پر مشتمل ہیں ان کے علاوہ فارسی اور دکنی زبان میں آپ کا کلام بھی موجود ہے۔ یہ آپ کے ایک سو پچیس خطبات کا مجموعہ "زاد الموحدین" آپ کے ایک مرید حسین ابن حسین نے مرتب کیا تھا جو اب بھی موجود ہے۔

افسوس ہے کہ صوفیائے گولکنڈہ کے بہت سے علمی اور تہذیبی کارنامے جن میں خاص طور پر دکنی زبان میں ان کے منظوم اور نثری رسائل شامل ہیں یا تو تلف ہو گئے ہیں یا گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تاہم جن اہل علم کو ان تصنیفات سے دلچسپی ہے ان کی تحقیق میں آئے دن کوئی نہ کوئی نئی چیز نکلتی رہتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے اس زمانے کے مذہبی اور علمی ذہن کو کس طرح متاثر کیا تھا۔

قطب شاہی ملفوظات میں۔ ان صوفیائے کرام کے خوارق اور کرامات کی تفصیلی داستانیں ملتی ہیں جن پر یہاں تبصرہ غیر ضروری ہے۔ لیکن صوفیائے کرام کی وجہ سے گولکنڈہ کی تہذیب و تمدن پر جو اہم اثرات پڑے ہیں یہاں ان کی جانب چند اشارات ضروری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ ان صوفیا کی خانقاہیں مذہب کی نشر اور علمی تعلیم کے اہم اداروں کی حیثیت رکھتی تھیں جس سے سلطنت کے دانشمند طبقے کے ذہن و کردار کی تشکیل ایک طرف ہوتی تھی تو دوسری طرف عوام کے مذہبی مزاج کی تربیت ہوتی تھی۔ یہ صوفیائے گولکنڈہ کے مذہبی رویہ کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے باشندے ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام ایک دوسرے کے ساتھ وا دداری اور تہذیبی اختلاط کا جذبہ پیدا ہوتا قلوب میں رقت اور مزاجوں میں گھلاوٹ پیدا ہوئی یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کے بعد بھی ان کے آستانے بلالحاظ مذہب و ملت مرجع

خلائق بنے رہے۔ ان صوفیائے کرام نے فارسی اور بالخصوص دکنی زبان کو زبردست علمی اور ادبی سرمایہ دیا ہے جس کا اثر آج بھی اس علاقے کے مذہبی طبائع اور وسیع طور پر ساری اردو زبان پر موجود ہے درگاہیں اور خانقاہیں کئی اہم تہذیبی تقاریب کا مرکز تھیں۔ جس میں بیسیوں اعراس رسوم صندل مالی وغیرہ اور خاص طور پر قوالی قابل ذکر ہیں۔

عرس کے موقعوں پر بڑے بڑے میلوں کے سجنے اور ہزارہا عوام کے یکجا ہونے کی وجہ سے تہذیبی تال میل کے اہم مواقع پیدا ہوتے تھے۔ ان سب کے علاوہ اس زمانے کے کئی سلسلے آج بھی باقی ہیں اور اپنے صوفیانہ مشن کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نئی نسلیں اب ان چیزوں سے بڑی حد تک نابلد ہو گئی ہیں۔ لیکن حیدرآباد کی تہذیب میں اس کے اثرات دوررس رہیں۔ آج بھی یہاں کے باشندوں کی نرم اور مفاہمت پسند طبیعت پرخلوص میل جول تواضع اور انکسار علمی شغف اور روحانی میلانات صوفیائے گولکنڈہ کی گراں قدر روایات کے رہین منت ہیں۔

ڈاکٹر اشرف رفیع

گولکنڈہ کی خواتین

گولکنڈہ کے قطب شاہی سلاطین ایران اور ترکی کی سرحد پر واقع کوہ ارارات کے دامن پر مشہور جھیل ارجیش کے کنارے رہنے والے ترکمانوں کے قبیلہ قراقوین لو سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان میں رفتہ رفتہ ایران کے جلائر بانی ہوں، آرمینہ کی عیسائی خواتین اور اردبیل کے صوفی بزرگ سید شاہ صفی الدین کے علاوہ نعمت اللہ شاہ کرمانی اور خاندان تیموری سے بھی رشتے ہوئے۔ اس گھرانے میں جہاں ایسے جرّار سردار اور سپہ سالار پیدا ہوئے کہ جنھوں نے امیر تیمور جیسے فاتح کو پانچ دفعہ شکست دی، وہیں مار نغا حلیمہ، آرائش بیگم اور اوراق سلطانہ جیسی صاحب فراست اور علم دوست خواتین بھی پیدا ہوئیں۔ ایک روایت کے مطابق تیمور کے بیٹے شاہ رخ کی بیٹی گوہر شاد کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی جس کی علم دوستی پورے مشرق وسطیٰ میں مشہور تھی اور جس کا عظیم الشان مدرسہ آج بھی ہرات میں باقی ہے۔

گولکنڈہ میں قطب شاہی خواتین نے تہذیب و تمدن کی نشوونما اور

ملکی معاملات اور خارجی سیاست میں نمایاں حصّہ لیا۔ سیاسی الجھنوں، انتشار اور آپسی رقابتوں کو سلجھانے اور خاص طور پر طاقت اور اقتدار میں توازن پیدا کرنے کے لئے دکن کی ریاستوں میں باہمی ازدواجی رشتے قائم کئے گئے چنانچہ احمدنگر، بیجاپور اور گولکنڈہ سے تعلقات مضبوط کرنے کے لئے حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی بی بی جمال، ابراہیم قطب شاہ سے بیاہ دی۔ ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی چاند سلطانہ سے ابراہیم عادل شاہ کی شادی کی گئی اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی بہن خدیجہ سلطانہ کو مرتضیٰ نظام شاہ کے بیٹے میراں حسینی سے بیاہ دیا ان خواتین نے بالراست سیاست میں حصہ لیا ہو یا نہ لیا ہو اس کا اثر سیاسی امور پر ضرور پڑا جنگ تالیکوٹ میں وجیانگر کے راجہ کو شکست اٹھانی پڑی۔ قطب شاہی تاریخ میں جس خاتون نے پہلی مرتبہ سیاست میں بذات خود حصہ لیا وہ جمشید قلی قطب شاہ کی بیوی بلقیس زمانی تھی۔ بلقیس زمانی نے سبحان قلی کی تخت نشینی کے لئے بہت کوشش کی۔ اس لئے سیف خاں عین الملک کو احمدنگر سے بلوا کر وکالت اور پیشوائی کی خدمت جلیلہ تفویض کرنے کا وعدہ کیا سیف خاں نے خاصی جدوجہد کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

قطب شاہی خواتین میں بالخصوص عقلمند حیات بخشی بیگم کا نام سرِفہرست ہے سیاست اور تمدن کی تعمیر و تشکیل میں اس کا تدبّر اور دوراندیشی کارفرما رہی۔ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس کی غیرمعمولی قابلیت سے ملک کو بہت فائدہ پہونچایا۔

سنہ۱۰۳۰ھ میں ایران عباس صفوی نے اوغور لو سلطان کو ایک سو چھبیس افراد کے ساتھ گولکنڈہ بھیجا۔ ان کے ساتھ کئی قیمتی تحفے تھے جن میں بارہ گوشوں والا

وہ تاج بھی تھا جو شاہان صفویہ کے ملک اور اس کی تبلیغ کی نمائندگی کرتا تھا۔ یہ سفارتی وفد اپنے ساتھ شاہ عباس صفوی کا خط بھی لایا تھا جس میں خواہش کی گئی تھی کہ شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی شاہ عباس صفوی کے ایک شہزادے سے کی جائے۔ مسلسل چھ سات برس تک کوشش کے باوجود ایرانی سفیر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک اہم وجہ یہ تھی کہ محمد قلی قطب شاہ کی لے دے کے یہی ایک اولاد تھی اور اگر اس کی شادی ایران میں کر دی جاتی تو محمد قلی کے بعد جانشینی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا اس لیے حضرت میر مومن پیشوائے سلطنت کے مشورے سے حیات بخشی بیگم کی شادی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے شہزادہ محمد سلطان سے کر دی گئی اس تقریب میں ایرانی سفیر بھی شریک رہا۔ ملا معینی میرک سبزواری نے جو گولکنڈہ میں سلطنت احمد نگر کا ایلچی تھا، اس موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع تھا ؎

دوش سر کردہ خیالم رہ بزمے چو بہشت

اہل آن بزم چو حوراں ہمہ نورانی چہرہ

سلطان محمد قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ کے بھائی شہزادہ مرزا محمد امین کا بیٹا تھا۔ مرزا محمد امین کی شادی خانم آغا دختر میر مقصود علی طباطبا سے ہوئی تھی۔ سلطان محمد قطب شاہ کی ماں خانم آغا نے ایک تالاب بنوایا تھا جو آج کل ماں صاحب کے تالاب کے نام سے مشہور ہے اس تالاب پر دو مینار تھے جن پر خانم آغا کے نام کا کتبہ بھی نصب تھا لیکن بعد میں یہ تالاب حیات بخشی بیگم کے نام سے مشہور ہوا۔ کیونکہ حیات بخشی بیگم ہی "ماں صاحبہ" کہلاتی تھیں۔

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) تو علم و ادب کا پروانہ تھا۔ اس نے فارسی اردو اور تلنگی تینوں زبانوں میں شعر لکھے۔ اس کا اردو کلام بچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ پورا کلام اب موجود نہیں ہے۔ تلنگی کے مجموعہ کا تو پتہ ہی نہ چل سکا۔ البتہ فارسی اور اردو کا کچھ کلام دستیاب ہو چکا ہے۔ چنانچہ کلام الملوک (سلسلۂ یوسفیہ) میں اس کا فارسی کلام چھپا اور راقم الحروف نے اس کا اردو کلیات جو (۱۲۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔

موجودہ معلومات کے لحاظ سے محمد قلی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اس کے دیوان میں غزلیں مثنویاں قصیدے مرثیے اور رباعیات غرض جملہ اصناف سخن کے وافر نمونے موجود ہیں۔ اس نے ایسے ایسے موضوعوں پر بھی لکھا ہے جن کی طرف اردو کے شعراء نے سوائے نظیر اکبر آبادی کے عام طور پر توجہ نہیں کی۔ اس نے اپنے عہد کی عام زندگی۔ رسم و رواج۔ تہواروں اور تقریبوں کی تفصیلات موسموں کی خصوصیات اور کھیل کود غرض کہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع اور معمولی سے معمولی واقعات پر بھی اعلیٰ پایہ کی نظمیں لکھی ہیں۔ بادشاہ ہونے کے باوجود وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھا اس کی غزلیں سادگی اور لطافت کے اعتبار سے حافظ کی غزلوں سے ملتی جلتی ہیں اس کی قادرالکلامی کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ اس نے ان حالات کو بھی نہایت روانی اور خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے جو فارسی میں اس وقت پیش کیے گئے تھے۔ جب کہ اس کا لسانی ارتقاء عروج پر پہونچ چکا تھا۔

محمد قلی ابتداء میں معانی تخلص کرتا تھا۔ بعد میں قطب شاہ اختیار کیا۔ بسنت اور آمد برسات پر اس نے متعدد قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں بسنت کھیلنے کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد حیات بخشی بیگم کم و بیش چالیس سال زندہ رہی اور اپنے بیٹے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں امور سلطنت میں دخیل تھیں۔ منتخب اللباب کے اس فقرہ سے کہ

"والدۂ عبداللہ قطب شاہ کہ در کلّ امور ملکی ومالی دخیل مستقل گردیدہ بود"

حیات بخشی بیگم کے سیاسی تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کی فراست نے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں نہایت نازک موقعوں پر قطب شاہی سلطنت کو سہارا دیا۔

سنہ ۱۶۱۶ء کے لگ بھگ گولکنڈہ پر مغلوں کے دباؤ کو روکنے کے لئے خفیہ طور پر شاہ عباس صفوی کے پاس ایک وفد بھیجا گیا جس میں خانم آغا اور اس کی بیٹی شہر بانو شامل تھیں۔ یہ وفد قاضی ظہیر الدین نجفی کے ساتھ ایران گیا۔ شاہ اس وقت قزوین میں مقیم تھا۔ یہ وفد اپنے ساتھ جو خط ایران لے گیا تھا اس میں عبداللہ قطب شاہ نے شاہ ایران سے مغلوں کے خلاف سیاسی مدد مانگی تھی۔ اس کے بعد ایران سے تہذیبی تعلقات اور سفارتی روابط بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ ایرانی سفیر گولکنڈہ میں رہنے لگے۔ اس پر مغلوں کو سخت اعتراض ہوا۔ اگرچہ انقیاد نامے کی تکمیل کے بعد عبداللہ قطب شاہ نہایت بے بس ہو چکا تھا تاہم ایران اور دوسرے ممالک سے اس کا اندرونی ربط و ضبط جاری رہا۔ نیز ظاہری طور پر مغلوں سے اپنے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی بڑی کوشش کی جاتی تھی۔ اس بارے میں حیات بخشی بیگم نے ہمیشہ نہایت فراست سے کام لیا اور مغل شہزادیوں سے اچھے مراسم رکھے۔ چنانچہ

حیات بخشی بیگم اور شاہجہاں کی بیٹی جہاں آراء کے درمیان تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔ ایک موقع پر جہاں آراء نے حیات بخشی بیگم کے لئے مرصع بازوبند اور طلائی پہونچیوں کی ایک جوڑ بھیجی تھی اور حیات بخشی بیگم نے اس سرفرازی کا نہایت عجز و انکسار سے اظہار شکر و سپاس کرتے ہوئے ایک طویل خط لکھا ہے۔

گولکنڈہ کی اسی سیاسی کمزوری کے زمانے میں اورنگ زیب نے شہزادہ محمد سلطان کو گولکنڈہ کی مہم پر بھیجا۔ بعد میں خود بھی محاذ پر پہونچ گیا۔ یہ مہم عبداللہ قطب شاہ کے مدبر میر جملہ محمد سعید کی سرکشی اور چالاکی سے پیش آئی تھی۔ جب حالات نازک ہو گئے اور دفاع کی کوئی صورت نہ رہی تو مجبوراً عبداللہ قطب شاہ نے صلح اور معافی کی درخواست کی۔ ملکہ حیات بخشی بیگم خود یہ درخواست لے ہوئے اورنگ زیب کے خیمے میں گئیں اور شرائط صلح طے کئے۔ اسی صلح کی ایک شرط کے طور پر عبداللہ قطب شاہ کی ایک بیٹی شہزادہ محمد سلطان کے عقد میں دی گئی۔ اس وقت حیات بخشی بیگم کی جرأت اور سیاسی تدبر نے سلطنت کو سنبھالا نہ ہوتا تو گولکنڈہ کا خاتمہ ہو جاتا۔

عبداللہ قطب شاہ کا عہد حکومت کوئی (۴۶) سال طویل رہا اور اس عرصہ میں حیات بخشی بیگم نے نہ صرف حکومت کے اندرونی معاملات پر نظر رکھی بلکہ خارجی امور کی دیکھ بھال، دفاعی انتظامات اور مغلوں سے سیاسی معاہدے کئے، قطب شاہی مقبوضات پر قابو رکھا۔ انگریزی کمپنی سے قطب شاہی آئین کی پابندی کروائی اور ملک کی خوشحالی کا خیال رکھا۔ علاوہ

ازیں اس عہد میں کئی تعمیری اور رفاہی کام بھی ہوئے۔ سلطان عبداللہ نے جتنے محل تعمیر کروائے ان کی تعمیر حیات بخشی بیگم کے مشوروں سے ہوئی۔ حیات آباد یا حیات نگر اسی ملکہ کا تعمیر کردہ شہر ہے جو اب بھی مضافات حیدرآباد میں واقع ہے۔ ملکہ نے اپنے استاد ملا عبدالملک کے لئے خیریت آباد میں ایک مسجد بنوائی۔ اسی مقام پر ایک مقبرہ بھی ہے جس میں حیات بخشی بیگم کی ایک بیٹی خیریت النساء بیگم دفن ہے اور محلہ خیریت آباد اسی کے نام سے مشہور ہے۔ حیات بخشی بیگم کی ایک اور بیٹی کلثوم بیگم کا مقبرہ محمد قلی قطب شاہ کے مقبرے کے جنوب میں واقع ہے

عبداللہ قطب شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی نظام الدین سید احمد سے بیاہی گئی دوسری شہزادہ محمد سلطان سے اور تیسری بیٹی 'بادشاہ بی بی' کی شادی ابوالحسن سے غیر متوقع حالات میں ہوئی جس میں حضرت شاہ راجو حسینیؒ کی روحانی توجہ اور مصلحت کو بڑا دخل ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی سلطنت گولکنڈہ کے عمائد سید مظفر، موسیٰ خان، پیش کار اکنا اور مادنا وغیرہ کی تائید سے ابوالحسن تاناشاہ کو قطب شاہی سلطنت مل گئی۔

محمد قلی قطب شاہ کے بسائے ہوئے شہر کا پہلا نام بھاگ نگر تھا۔ بھاگ متی، ایک چھوٹے سے گاؤں چیچلم میں رہتی تھی جہاں اب چار مینار، مکہ مسجد، مغل پورہ، واقع ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد بھی وہیں قیام پذیر رہی۔ ابراہیم قطب شاہ کو جب خبر ملی کہ شہزادہ محمد قلی دریا پار آتا جاتا ہے جو خطرے سے خالی نہیں ہے تو اس نے رود موسیٰ پر

ایک پل تعمیر کروایا جسے ہم آج پرانا پل کہتے ہیں۔ اس پل کی تاریخ آغاز "صراط مستقیم ۹۸۱ھ ہجری" اور تاریخ تکمیل "گذر گہہ ماہ ۹۸۶ھ ہجری مطابق ۱۵۷۸ عیسوی ہے۔

بھاگ متی کے بعد دیگر طلائفی خواتین میں تارہ متی اور پیم متی کے نام خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں اکثر مورخین نے ان کا ذکر نہیں کیا لیکن قطب شاہی گنبدوں میں پیم متی کے مقبرے کی موجودگی سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ماثر دکن میں پیم متی کو سلطان عبد اللہ کی منظور نظر بتایا گیا ہے۔ اس کے گنبد پر تاریخ وفات

"بود از اول محل صفتی پیم متی ۱۰۷۳ ہجری"

کندہ ہے۔ اس کے قریب ایک اور گنبد ہے جو متاثل ہے اور تارہ متی سے منسوب ہے۔

ان طلائفی خواتین کو بادشاہوں کا تقرب دیئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے ذریعے سے رعایا اور عوام کے دلوں میں جگہ حاصل کی جائے اور باہم تہذیبی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے میں سہولت ہو ورنہ ترکمان قبیلے کے بادشاہ اتنے مختصر عرصہ میں اس درجہ ہر دلعزیز ہوجائیں ہندوستانی رنگ میں اتنے رنگ جائیں کہ ہومن و تو کا فرق باقی نہ رہے مشکل تھا حیدرآباد میں گنگا جمنی تہذیب کے خوبصورت اور رنگارنگ امتزاج میں قطب شاہی دور کی خواتین کے رول کو فراموش کردینا قرین انصاف نہیں۔

نجمہ صدیقہ

قطب شاہی مورخین

قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ۱۵۱۸ء میں پڑی اور تقریباً پونے دو سو سال بعد ۱۶۸۷ء میں اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے خاتمے پر بھی تین سو برس کے لگ بھگ گذر چکے ہیں۔ اس کے آغاز سے اب تک ساڑھے چار سو سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے اور اس تمام عرصہ میں مورخین نے قطب شاہی سلطنت کے کسی نہ کسی پہلو کی تاریخ کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ قطب شاہی عہد کی تاریخ پر مواد کی اس قدر فراوانی ہے کہ ان سب سے استفادہ کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے قلعہ گولکنڈہ اور بیسیوں قطب شاہی عمارتوں کے علاوہ اس زمانے کا فارسی، دکنی اور تلنگی ادب اور پھر فارسی، تلنگی، ڈچ، فرانسیسی، انگریزی اور پرتگیزی اسنادی کاغذات سکے، مہریں، کتبے، ظروف و آلات، زیور اور لباس، اور کتنے ہی ایسے ماخذ ہیں جن کی بنیاد پر قطب شاہی عہد کی مبسوط تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ ایسے مواد سے استفادہ کرتے ہوئے شاہ منعم، حکیم سید شمس اللہ قادری، سید علی اصغر بلگرامی، پروفیسر عبدالمجید صدیقی نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے موجودہ دور میں قطب شاہی دور

کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے نئی نسلوں کو روشناس کرایا ہے۔ نیز حال ہی میں گولکنڈہ میں محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے جو کھدائیاں ہو رہی ہیں ان سے بھی غیر معمولی نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ لیکن نئے زمانے میں اس دور کی سب سے جامع اور مبسوط تاریخ لکھنے کا اہم ترین کارنامہ پروفیسر ہارون خاں شروانی نے انجام دیا ہے اس کے باوجود نئے نئے ماخذ کا انکشاف ہو رہا ہے اور اس دور کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف محققین تلاش و تحقیق میں مصروف ہیں۔ قطب شاہی دور کے خاتمے کے بعد سے اس دور کی تاریخ پر جو کچھ کام ہوا ہے اس کا جائزہ بجائے خود ایک اہم موضوع ہے تلاش و تحقیق کا یہ کارواں آگے بڑھتا رہے گا۔ لیکن اس وقت ہماری گفتگو صرف ان تاریخی کارناموں تک محدود رہے گی جو قطب شاہی دور میں معاصر مورخین نے انجام دی ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قطب شاہوں کو شاہی مورخین کے تقرر کا مغل حکمرانوں جیسا شوق نہیں تھا۔ بلکہ ان کے یہاں تاریخ نویسی کا کام جن لوگوں نے انجام دیا ہے وہ اگرچہ قطب شاہی امراء اور حکمرانوں کو کسی نہ کسی حد تک سرپرستی کا رہین منت رہے ہے تاہم ان کارناموں کا محرک۔ دراصل ان مورخین کی اپنی دلچسپی ہی معلوم ہوتی ہے۔ قطب شاہی مورخین میں ایسے کم ہیں جو مستقلاً گولکنڈہ ہی میں سکونت پذیر رہے ہوں یا جنھوں نے صرف قطب شاہوں کی تاریخ لکھنے پر اکتفا کیا ہو۔ بیشتر مورخین نے قطب شاہی سلطنت کے علاوہ نہ صرف دکن کی دیگر سلطنتوں اور سلطنت مغلیہ کی تاریخیں لکھی ہیں بلکہ ان کی تاریخ بھی لکھ ڈالی ہے۔ اس طرح قطب شاہی مورخین دو زمروں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جنھوں نے صرف قطب شاہی تاریخیں لکھی ہیں جن میں حدیقۃ السلاطین کا مصنف۔ مرزا نظام الدین احمد بن عبد اللہ الصاعدی شیرازی

ہے اور دوسرا تاریخ قطب شاہی یا تاریخ محمد قطب شاہ کا مصنف ہے جس کے نام کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ دوسرے زمرے میں وہ مورخین ہیں جنھیں سولھویں اور سترھویں صدی کے بعد ایرانی پیشہ ور مورخین کی حیثیت سے موسوم کیا جا سکتا ہے ایسے مورخین میں مجموعی طور نے گولکنڈہ کے کسی نہ کسی عہد کی تاریخ لکھی ہے۔ خور شاہ، میر علی طبا طبا، ابوالقاسم فرشتہ، اسکندر منشی، علی بن طیفور البسطامی محمد مفید مستوفی محمد شریف و توجی عبدالباقی نہاوندی وغیرہ شامل ہیں۔

قطب شاہی سلطنت کا پہلا مورخ خور شاہ بن قباد الحسینی ہے جو عراقی الاصل تھا۔ اس نے ۹۷۱ھ میں ایک تاریخ عالم لکھی۔ اسی تاریخ عالم میں ایک حصہ قطب شاہی کے لئے مختص ہے اس تاریخ کے نام کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ بالعموم تاریخ ایلچی نظام شاہ کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ تاریخ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں لکھی گئی ہے۔

اسی طرح ملا محمد شریف نیشاپوری نے بھی عالم اسلام کی ایک جامع تاریخ "جامع الاخبار" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں گولکنڈے کی تاریخ بھی شامل ہے۔ محمد شریف نیشاپوری جمشید قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ آیا تھا۔ اور یہاں اس نے چند دن ملازمت بھی کی اور ابراہیم قطب شاہ کے انتقال تک گولکنڈہ میں رہا۔

ان دو تاریخوں کے بعد سب سے اہم کام سید علی طبا طبا کے سمنانی کی "برہان مآثر" ہے "برہان مآثر" بنیادی طور پر دکن کی تاریخ ہے۔ طبا طبا کو قطب شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نے دکن کی جو تاریخ ۹۹۹ء میں شروع کی وہ ۱۰۰۳ھ میں مکمل ہوئی طبا طبا اور فرشتہ کا زمانہ کم و بیش ایک ہی ہے اور دونوں نے کم و بیش ایک ہی زمانے میں تاریخ لکھنا شروع کی لیکن فرشتہ کو سید علی طبا طبا کی "برہان مآثر" سے استفادہ کا

موقع نہیں ملا۔ حکیم ابوالقاسم فرشتہ خود بھی ایک اہم قطب شاہی مورخ ہے، فرشتہ کی تاریخ "گلشن ابراہیمی" قرونِ وسطیٰ کے ہندستان کی مکمل تاریخ ہے۔

اسکندر منشی کی تاریخ عالم آرائے عباسی، علی بن طیفور کی "حدائق السلاطین" محمد بن عبداللہ نیشاپوری کی مآثر قطب شاہی عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی" محمد شریف وقوعی کی مجمع الاخبار" اس لحاظ سے ایک ہی زمرے کی تاریخیں ہیں۔ ان میں قطب شاہوں کے علاوہ ایران اور ہندستان کی دوسری سلطنتوں کی بھی تاریخیں ہیں۔ اس زمرے کی ایک اور کتاب محمد مفید مستوفی کی جامع مفیدی ہے لیکن اس کو اسی زمرے میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ ان سب کی بہ نسبت زیادہ علمی اور غیر رسمی انداز میں لکھی گئی ہے اس کا تیسرا حصہ جو ایران میں شائع ہوا ہے وہ ٹائپ کے باریک حرفوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے باقی حصے دستیاب نہیں ہوتے۔

قطب شاہی دور کی تمام تاریخوں میں "حدیقۃ السلاطین" اور تاریخ محمد قطب شاہ" کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ خالصتہً قطب شاہی تاریخیں ہیں اور مورخین نے بنیادی طور پر اس دور کی تاریخ بیان کی ہے جس کو انہوں نے خود دیکھا تھا اس ماضی قریب کی تاریخ لکھی ہے۔ جس کے واقعات اور اس ماضی کو دیکھے ہوئے افراد مورخ کے عہد تک باقی تھے۔ ان تاریخوں کے لکھنے والوں نے بھی اپنی زندگیاں گولکنڈہ ہی میں گذار دیں لہذا ان کے مندرجات زیادہ معتبر سمجھے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ "تاریخ قطب شاہی" کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ تاریخ محمد قطب شاہ کے دور ہی میں مرتب کی گئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کام اسی بادشاہ کی فرمائش پر ہوا ہو۔ اس میں سلطان قلی قطب شاہ کے دور سے لے کر یہ کام محمد قلی قطب شاہ کے اختتام تک چار قطب شاہی بادشاہوں کے دور کی

مفصل تاریخ چار طویل ابواب میں قلم بند کی گئی ہے اور سلطان محمد قطب شاہ کے دور حکومت کے ابتدائی چند سالوں کے حالات پر ختم ہوئی۔

حدیقۃ السلاطین میں اگرچہ ابتداً سلطان قلی سے لے کر عبداللہ قطب شاہ تک تمام بادشاہوں کی مجمل تاریخ درج کی گئی ہے لیکن دراصل یہ ضخیم تاریخ عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی سے پندرہ جلوس تک محاربات خارجی تعلقات، تجارتی حالات امرائے سلطنت کا تذکرہ ہے۔

قطب شاہی دور کی ان تاریخوں کے علاوہ فرشکی کی ایک منظوم تاریخ جو نسب نامہ قطب شاہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے تذکرہ کے بغیر یہ اجمالی جائزہ مکمل نہیں ہوگا۔ فرشکی نے "نسب نامہ" میں قطب شاہی سلطنت کی ابتدا سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد تک کی تاریخ منظوم کی ہے۔ یہ منظوم تاریخ "واقعات قطب شاہی" کے نام سے بھی موسوم کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں کے تقریباً سبھی مورخین ایرانی الاصل تھے خورشاہ اگرچہ عراقی الاصل تھا لیکن غالباً اس کی زبان فارسی ہی تھی ورنہ وہ تاریخ فارسی میں نہ لکھتا جہاں تک فن تاریخ نویسی کا سوال ہے ان سب کے یہاں بنیادی اصول کم بیش مشترک ہیں ہر ایک بنیادی طور پر واقعات کی صحت کے درپئے ہے۔ ان مورخین کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقایع کو صحت و تفصیل سے بیان کریں، قابل ذکر سوانح اور وقایع کے انتخاب میں بھی ان مورخین کے درمیان زیادہ اختلافات اور تفاوت نہیں ہے واقعات کے انتخاب میں رجحان کی یک نیتی کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تاریخ نویسی کی عبارت کا تسلسل ہے یہ تسلسل کچھ تو ظاہر ہے کہ علمی اصولوں کے طور پر چلا آیا ہے

لیکن اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہے وہ یہ کہ ان مورخین نے معاصر تاریخ تو متعلقہ ماحول کی دید شنید کے بعد مرتب کی ہے۔ لیکن اپنے سے پہلے کے زمانوں کے بارے میں جو طریقہ کار اختیار کیا ہے وہ عموماً یہی ہے کہ اکثر مورخین اپنے پیشرو مورخین کی تاریخوں کے ابواب کے ابواب اپنی تاریخ میں نقل کر لیتے تھے۔ مثلاً علی بن طیفور البسطامی کی "حدائق السلاطین" میں بہمنیوں کا حال دراصل طبا طبا سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح خور شاہ کے یہاں ریلنوں اور کیانیوں کا حال دراصل اس کے پیشرو مورخین کے کارناموں سے ماخوذ ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی تاریخ کا ایک حصہ جو قدیم ماخذ سے نقل کیا گیا ہو اس کے اسلوب اور وسعت کا اثر اس تاریخ پر بھی پڑے گا جو مورخ نے معاصر عہد کے بارے میں لکھی ہو۔

ماخذ سے استفادہ میں بہت کم مورخین نے چھان بین کے بعد کسی واقعہ کی نسبت اپنا فیصلہ دیا ہے۔ سب سے زیادہ الجھن اس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قطب شاہی مورخین اپنے ماخذ کے حوالے نہیں دیتے بیشتر مورخین کی نشان دہی سے بالکل بے نیاز ہیں البتہ ذمہ دار مورخین نے اپنی تاریخوں کے مقدمے میں ان ماخذ کی صراحت کر دی ہے۔ جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً محمد مفید مستوفی اور سید علی طبا طبا نے اپنے بنیادی ماخذ کی صراحت ابتداء ہی میں کر دی ہے اور متعدد واقعات کے حوالے میں ماخذ کی صراحت متن میں کی گئی ہے لیکن یہ کیفیت عام نہیں ہے۔

قطب شاہی مورخین کے فن و اسلوب تاریخ نویسی کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ کائنات کے بارے میں ان کے بنیادی تصورات ہیں جو درحقیقت ایک خاص دور کے مذہبی ذہن کے تشکیل کردہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان تاریخوں کا آغاز حمد، نعت اور مدح سلطانی سے ہوتا ہے جو بظاہر اس زمانے کی کتابوں کی تصنیفی ہیئت کی محض ایک رسم سمجھی جا سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تاریخ 'خدا' رسول 'علی'

بسنت کھیلیں عشق کی آپیارا

تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں تارا

یہ مخمل کمند لال کے تار الا رنگ مجھونا

بندی کم موں پھندر بند سوں کر سنگارا

بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں

کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

پیا پگ پر ملا کر لیائی پیاری

بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا

نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ

رنگیلا ہور حبیبا تر لوک سارا

محمد قلی قطب شاہ کے دور کے اردو شعراء میں وجہی سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا۔ اس نے ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں ایک کتاب قطب مشتری لکھی۔ جس میں خود بادشاہ کی بھاگ متی کے ساتھ عشق کی داستان استعارے کے پیرائے میں بیان کی ہے۔ یہ کتاب اپنے دلکش اسلوب اور اعلیٰ تخیل کی وجہ سے قدیم اردو کی بہترین کتابوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اس کے دیباچہ میں وجہی نے اس طرح اپنے کلام کی بڑائی ظاہر کی ہے۔

نہ پہنچے نہ پہنچا ہے گن گیان میں

سو طوطی منجھ ایسا ہندوستان میں

کہ باتاں یہ سن کر مری گیسان کیاں

لہیاں تھک ہو طوطیاں خراساکیاں

آئمہ اطہارؓ اور سلطان سبھی سے ان کی عقیدت اور وابستگی کے تاثرات ' ان کے انتخاب واقعات ' طرز استدلال ' حقائق کی تعبیر اور تاریخ نویسی کے مقاصد پر نمایاں طور پر ثبت ہیں اس دور کے مورخ کے لئے تاریخ کا آغاز تخلیق آدم کے واقعہ سے شروع کرنا مشکل نہیں ہے ۔ اگرچہ آدم سے مورخ تک کے واقعات کسی مورخ کی کاوشوں سے نہیں ملتے تھے لیکن مورخ کے عقیدے نے مقدس صحیفوں کے ان امثال و نظائر کو تاریخی طور پر قبول کر لیا جو ان صحیفوں میں ابلاغ حکمت کی خاطر بہترین مثالوں کے طور پر پیش کیے گئے تھے ۔ صحائف مقدس جن کا تعلق زبان الہٰی سے ہوتا ہے ۔ ان کے حقائق کو زمان تاریخی پر منطبق کرنے کے لئے جس امور خالۂ تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے وہ صرف ہمارے زمانہ کا خاصہ ہے ۔ قطب شاہی مورخین کا طرز عمل اس معاملے میں ایمان بالغیب سے زیادہ نہیں تھا ۔ جہاں تک مقام نبیؐ اور مقام علیؓ کا تعلق ہے شیعہ اور سنی مورخین کے یہاں یہ واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ قطب شاہی دور کا مورخ اپنی تاریخ کا آغاز مذہبی عقیدے سے کرتا ہے اور واقعات کی تفصیل سلاطین دوراں اور امراء کے مزاجوں کے مطابق کرتا ہے جن سے وہ وابستہ رہتا ہے اس کے باوجود بہ حیثیت مورخ اس کی پیشہ ورانہ ذمہ داری اس کو بیان حق پر جس طرح آمادہ کرتی ہے وہ اپنے میں کچھ کم قابل محسوس نہیں ہے ۔

بعض مورخین نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں اپنی تاریخ نویسی کے اصولوں کے بارے میں وضاحت بھی کی ہے ۔ جن میں محمد مفید مستوفی اور نظام الدین احمد شیرازی قابل ذکر ہیں یہ اور ان کے علاوہ دوسرے قطب شاہی مورخین نے اپنی تاریخ نویسی کے جن اصول و مقاصد کی صراحت کی ہے اس سے مذکورہ بالا تجزیے کی تردید نہیں ہوتی ۔

بعض مورخین نے مختلف معاصر سلطنتوں کی تاریخ ایک ساتھ بیان کی ہے جیسا کہ سید علی طبا طبائی نے "برہان مآثر" میں کیا ہے لیکن فرشتہ اور علی بن طیفور نے ہر نسل کے حکمرانوں کے لئے علحدہ شعبہ قائم کر دیا ہے۔

یہاں تاریخ نویسی کے جائزے میں صرف ان کتابوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو تاریخ کی تعریف میں آتی ہیں کسی اور نوعیت کے تاریخی ادب خاص طور پر تذکروں سے یہاں بحث نہیں ہے لیکن یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ بعض قطب شاہی مورخین نے اپنے تاریخی کارناموں کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے ایک حصہ میں تو وہ عہد بہ عہد سیاسی تاریخ بیان کرتے ہیں اور دوسرا حصہ ٹھیٹ تذکرے پر مشتمل ہوتا ہے۔ محمد مفید مستوفی جامع مفیدی ایسی ترتیب و تدوین کی بہتر مثال ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا واقعات کے انتخاب میں مورخ کی طرز فکر اور معتقدات کا بڑا دخل ہے۔ آج کا طالب علم جب قطب شاہی تواریخیں پڑھتا ہے تو بعض اہم واقعات کو تشنہ پاتا ہے اور بعض واقعات کا تو پتہ ہی نہیں چلتا لیکن کئی غیر اہم واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی تفصیل پڑھنے سے وقت اور توانائی کے زیاں کا اذیت ناک احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قطب شاہی مورخین کی نظر میں سلاطین و امراء کی شخصیتوں پر مرکوز رہتی ہیں اور تاریخ کی تعبیر مادی اور روحانی بنیاد پر کی جاتی ہے جس کے سبب عوام کی تہذیبی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا صرف اچٹتا سا ذکر یہاں تہاں مل جاتا ہے لیکن ان کی پوری تصویریں بن نہیں پاتیں اس کے بجائے کسی سلطان یا امیر کے کسی محل یا کسی تقریب یا کسی کارنامے کا جب ذکر آتا ہے تو اس کی جزوی تفصیلات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ سوائے محمد مفید مستوفی کے کوئی ایسا قطب شاہی مورخ نہیں ملتا جس نے تاریخ کی تعبیر میں روحانی اور اخلاقی

اقدار کے ساتھ مادی اقدار کو ملحوظ رکھا ہو۔ ان حالات میں یہ سہل ہے کہ قطب شاہی عہد کے درباروں امراء کے پڑھے لکھے طبقے کے تصورات سیاسی ریشہ دوانیوں اور ان سے متعلق دیگر امور کی مبسوط تاریخ مرتب کی جائے لیکن قطب شاہی مورخین کے کارناموں کی مدد سے اس دور کے عوام کی معاشی تاریخ لکھنا اور خود اس سلطنت کی آبادی کی ساخت کا معتبر تجزیہ کرنا بھی تقریباً ناممکن سا ہے۔

جہاں تک صحت واقعات کا تعلق ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مورخین نے اپنی حد تک مخلصانہ کوشش کی ہے تاہم تاریخوں کی صراحت اور بعض دفعہ واقعات کی تفصیلات میں اس دور کے تقریباً سبھی مورخین سے کچھ نہ کچھ لغزشیں ہوئی ہیں۔ اکثر قطب شاہی تاریخوں کا مطالعہ اس دور کے اسناد کتبات اور دیگر تاریخی ماخذ کی روشنی میں کیا جائے تو ان جزوی تسامحات کی تصحیح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آج کا محقق جب فرشتہ یا طباطبا نظام الدین یا مستوفی سے دوسرے ماخذ کے ساتھ تقابلی طور پر استفادہ کرتا ہے تو وہ ان مورخین کی تسامحات پر تنقید کرتا جاتا ہے۔ لیکن ان جزوی کوتاہیوں کی وجہ سے ان تاریخوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ یہ تاریخیں بہرحال ایک خاص دور کی معاصر تاریخیں ہیں اور اپنی ساری کوتاہیوں کے باوجود یہی وہ سارا سرمایہ ہے جو آج کے مورخ کو تاریخ نویسی کے لئے میسر ہے۔

غلام ربانی

قطب شاہی مقبرے

عمارتیں رہنے سہنے کے لئے بنتی ہیں لیکن مقبرہ ایسی عمارت ہے جو صرف دیکھنے کے لئے بنتی ہے۔ اس کا مقصد بنانے والے کی یادگار قائم کرنا ہوتا ہے اس لئے سارا زور اس کی مضبوطی اور استحکام پر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مقبرے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں۔ گولکنڈے کے شاہی محل محل سرائیں۔ ایوانات اور دروازے کھنڈر ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن ان ہی بادشاہوں کے مقبرے اچھی حالت میں ہیں۔ ان عالی شان عمارتوں نے کہیں سے جنبش نہیں کھائی ہے۔

دکن میں سب سے پہلا مقبرہ سلطان علاء الدین حسن بہمنی کا ہے جو تغلقی طرز پر تعمیر ہوا تھا۔ تغلقی گنبد چپٹے ہوتے تھے، دیکھنے میں اچھے نہیں معلوم ہوتے تھے" ان کے نیچے گردن بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گلبرگہ کے معماروں نے گنبد کو بلند کرنے کے لئے اس کا پایہ اونچا کیا اور گنبد کی وضع کو اتنا رعنا بنا دیا۔ رفتہ رفتہ ان میں گولائی آتی گئی چنانچہ بعد کے سب گنبد گول ہی ہیں اور بہمنی طرز ایک مستقل عنوان بن گیا۔ یہی بہمنی طرز گولکنڈہ پہونچا چنانچہ قطب شاہی مقبروں کا نقشہ وہی ہے جو بہمنی مقبروں کا ہے۔ لیکن یہاں ان میں بہت کچھ ترمیم و اصلاح ہوئی اور بعض جدتیں ایسی ہوئیں جن سے عمارتوں میں رعنائی پیدا ہو گئی۔

تلنگانہ خوب صورت مندروں سے مالا مال ہے۔ اس سرزمین کے معماروں نے قطب شاہی مقبروں میں کام کیا، انہوں نے مقبروں کی تعمیر میں وہ چیزیں داخل کر دیں جن کو وہ پشتوں سے مندروں میں بناتے چلے آئے تھے۔ اس وقت تک مقبروں میں نقش و نگار کا رواج نہیں تھا۔ تلنگانے کے کاریگروں نے ان کو بیل بوٹوں اور پھول پتوں سے سجایا۔ یہ نقش و نگار رچنے میں اس خوبی سے منبت کئے گئے کہ آخر کار یہی منبت کاری گولکنڈہ طرز تعمیر کی خصوصیت بن گئی۔

قطب شاہی مقبرے بادی النظر میں ایک سے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ان کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقبروں کا یہ خوب صورت جھرمٹ گولکنڈہ اسٹائل کی ایک کتاب ہے جس سے اس طرز کے ارتقائی مدارج آسانی سے سمجھ میں جاتے ہیں۔

یہاں سب سے پرانا مقبرہ سلطان قلی قطب شاہ کا ہے جو اس خاندان کا بانی تھا۔ اس مقبرہ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تغلق آباد (دلی) سے غیاث الدین کا مقبرہ لاکر یہاں رکھ دیا گیا ہے۔ دونوں کی دیواریں گاؤدم ہیں۔ مخروطی ہونے کی وجہ سے ان کے کونے کر کی شکل کے ہو گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دروازے اندر کو دھنسے ہوئے ہیں۔ پوری عمارت میں نقش و نگار کا نام نہیں ہے، حجم میں بھی برابر ہیں، دونوں میں اس قدر مشابہ ہیں کہ دونوں ایک سانچے میں ڈھلے معلوم ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اس کی کرسی نیچی ہے اور تغلق کے مقبرے کی کرسی بہت بلند ہے۔

یہ مقبرہ یہاں کے شاہی مقبروں میں سب سے چھوٹا ہے اور قلی قطب شاہ اولوالعزم سلطان کی آخری آرام گاہ کے لئے شایان شان نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تمام عمر سلطنت کے استحکام میں لگا رہا، اسے مقبرہ بنانے کی فرصت نہیں ملی۔ یہ مقبرہ اس کے

مرنے کے بعد تعمیر ہوا۔ اس کے بعد کے دوسرے فرماں رواؤں نے اپنے اپنے مقبرے اپنی زندگی ہی میں بنوالئے تھے۔

اس کے برابر جمشید قلی کا مقبرہ ہے جو قلی قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے۔ اس پر نیچے سے اوپر تک مہین چونے کی استرکاری کی گئی ہے۔ وضع میں مثمن پہلو ہے اس شکل کا مقبرہ ہندستان میں کہیں نہیں ہے، البتہ بیجاپور میں حضرت خواجہ امین الدین اعلیٰ شیر خدا کا مقبرہ اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

جمشید کے بعد اس کے کم سن بیٹے سبحان قلی کو تخت پر بٹھایا گیا، لیکن چند مہینے بعد وہ تاریخ سے اس طرح غائب ہوا کہ اس کی قبر تک کا پتہ نہیں ہے۔ البتہ سلطان قلی قطب کے مقبرے کے برابر ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے جو "چھوٹے ملک کا مقبرہ" کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مقبرہ سبحان قلی کا ہو مگر اس پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔

سبحان قلی کی جگہ اس کا چچا ابراہیم قطب شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کا مقبرہ پہلے دونوں مقبروں سے بڑا ہے اور بیدر کے بہمنی مقبروں کے نمونے پر بنا ہے۔ اس کی دیواروں پر چینی کا کام تھا جو خستہ ہو کر جابجا سے گر گیا ہے۔ لیکن کچھ نقش و نگار اب بھی باقی ہیں۔

اس مقبرے سے گزر کر جب محمد قلی کے مقبرے پر پہونچتے ہیں تو نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ یہ عمارت زیادہ خوب صورت اور شاندار ہے۔ اس کی تعمیر میں چالوکی طرز کی خصوصیات موجود ہیں۔ دروازوں کے سامنے جو برآمدے ہیں ان کے ستون ایک ڈال کے پتھر کے ہیں۔ کاکتیائی مندروں میں اسی قسم کے تراشیدہ ستون جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ ان ستونوں کے سروں پر چار چار توڑے ہیں جن پر سلیں پاٹ کر چھت بنا دی گئی ہے۔ یہ چھتیں چالوکی طرز کی ہیں۔ ورنہ اسلامی عمارتوں میں ہر جگہ لداؤ کی چھتیں ہوتی ہیں

دیواروں پر سطح سے ابھری ہوئی پٹیاں ہیں جو ایک دوسری کے متوازی چاروں طرف چلی گئی ہیں اس طرح کی پٹیاں مندروں میں عام ہیں، کہیں یہ پٹیاں افقی ہوتی ہیں کہیں عمودی، اس مقبرے میں افقی ہیں۔ غرض کہ تراشیدہ ستون، سردل، پٹیاں توڑے اور چھجے سب جالو کی طرز کے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کیاندوں میں کھڑا ہو کر ادھر اُدھر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی مندر میں کھڑا ہے۔

عمارت کے رو کار پر چونے میں نقش و نگار بنائے ہیں جن میں کنول کے پھول پتے، کنول کی کلیاں اور کنول کی پتیاں بنائی گئی ہیں کنول کو ہندو دیو مالا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مقبرے پر ہندو مسلم طرز تعمیر کا امتزاج بہت نمایاں ہے محراب اور مینار جو خاص اسلامی چیزیں ہیں، اس عمارت میں نمایاں نہیں۔

محمد قلی کے کوئی بیٹا نہ تھا، اس کے بعد اس کا بھتیجا محمد قطب شاہ جانشین ہوا۔ ان دنوں دکن میں بڑے مقبرے بنانے کا رواج تھا۔ چنانچہ جتنے بڑے مقبرے دکن میں ہیں، شمالی ہند میں نہیں ہیں محمد قطب شاہ کا مقبرہ بہت بڑا ہے۔ یہ عمارت اندر سے ہشت پہل اور باہر سے چوکور ہے، جس کے گرد سات سات در کی گیلری چاروں طرف بنی ہوئی ہے۔ اصل عمارت ایک مکعب کی شکل کی ہے، یعنے اس کا طول و عرض اور بلندی سب برابر ہیں۔ چبوترہ پر جو عمارت ہے اس کی بلندی گنبد کی بلندی کے برابر ہے۔ اس زمانے میں جتنے بڑے مقبرے پائے جاتے تھے ان میں عموماً یہی تناسب رکھا جاتا تھا۔ عمارت میں شان پیدا کرنے کے لئے گنبد دوہرے بنائے جاتے تھے، یعنے ایک گنبد کے اوپر دوسرا گنبد بناتے تھے، اور دونوں کے بیچ میں خلا ہوتا تھا۔ اس میں کیا خوبی یہ ہے کہ زائر کسی زاویئے سے دیکھے اس کا ایک وقت میں صرف ایک ہی گنبد دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کا دوہرا گنبد سب سے

پہلے دلی میں سکندر لودھی کے مقبرے میں بنایا گیا تھا۔ یہ جدّت اتنی مقبول ہوئی کہ ملک میں عام طور پر دوہرے گنبد بننے لگے۔ چنانچہ محمد قطب شاہ کے مقبرے کا گنبد بھی دوہرا ہے۔

اس مقبرے کی تعمیر میں بہت بڑے بڑے پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ پتھر بیس بیس پچیس فٹ لمبے ہیں۔ گیلری کے دروں کی پوری محرابیں صرف دو دو پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ قطب شاہی عمارتوں میں بڑے بڑے پتھروں کا استعمال عام ہے۔ یہ ہمارے بہمنی طرز تعمیر کا اثر ہے۔ اس عمارت پر شروع میں مینا کاری کی گئی تھی جس کے نشان اب بھی کہیں کہیں باقی ہیں۔

اس کے پاس ہی حیات بخشی بیگم کا مقبرہ ہے۔ اس خاتون نے بادشاہت تو نہیں کی مگر ایک بادشاہ کی بیٹی، بادشاہ کی بیوی اور بادشاہ کی ماں تھی، اور ہر حیثیت سے ملکی معاملات میں دخیل تھی، اسی لیے اس کا مقبرہ بھی شاہی مقبروں کے برابر بنایا گیا ہے۔ اس کا نقشہ بالکل وہی ہے جو اس کے شوہر سلطان محمد قطب شاہ کے مقبرے کا ہے۔ اس کا گنبد بھی دوہرا ہے، یہ مقبرہ شاہانہ عظمت و شان رکھتا ہے۔

اس شاہی قبرستان میں پچیس مسجدیں ہیں۔ بعض ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں اتنی مسجدیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ سب غیر آباد ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور خوب صورت مسجد حیات بخشی بیگم کی مسجد کلاں ہے جو اس کے مقبرے سے متصل ہے۔ اس عمارت سے اس کے تعمیری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ پوری عمارت پر اعلیٰ قسم کی استر کاری ہے۔ اس میں پانچ در کا دالان در دالان ہے منڈیر پر خوب صورت کنگورے بنے ہیں

- پانچ گلدستے ہیں۔ دونوں پہلوؤں پر دو بلند مینارے ہیں جن کی برجیوں کے نیچے کنول کی پتیاں اور اناناس بنے ہوئے ہیں۔ روکار پر ہندسی اشکال اور جالیاں ہیں۔ بیرونی محرابوں کے بانکپن سے رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ عمارت اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں زنانہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ چاندنی رات کی خاموشی میں اگر اس کو دیکھتے ہیں تو قلب پر خاص کیفیت طاری ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ حیات بخشی بیگم نورانی پوشاک پہنے کھڑی ہے۔

ساتواں بادشاہ عبداللہ قطب شاہ تھا۔ اس کا مقبرہ بہت بڑا ہے۔ دو منزلہ عمارت ہے، گنبد بھی دوہرا ہے مگر نشیب میں واقع ہے جس سے اس کی عظمت میں فرق آ گیا ہے اس عظیم الشان عمارت میں تناسب اور موزونی کی کمی ہے۔ کرسی نیچی ہے چبوترہ بھی وسیع نہیں۔ اس بلند عمارت کے لئے بہت وسیع اور بلند چبوترے کی ضرورت تھی۔ برجیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کھلونا معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اس کی جگہ بلند مینار ہوتے تو عمارت میں بڑی شان پیدا ہو جاتی۔

ابوالحسن تاناشاہ اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اس نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح مقبرہ بنوانا شروع کیا تھا مگر ابھی گنبد نہیں بنا تھا کہ اس کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس بدنصیب کے آخری ایام قلعہ دولت آباد کے چینی محل میں بسر ہوئے اور وہیں انتقال ہوا۔ اس کی قبر خلد آباد (ضلع اورنگ آباد) موجود ہے۔

یہ قطب شاہی قبرستان آج کل ویران ہے مگر اس نے اپنے اچھے دن دیکھے ہیں کہ ہندوستان کے کسی شاہی قبرستان کو نصیب نہیں ہوئے۔ قبر کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی اور جہاں بہت سی قبریں ہوں وہاں ایک قسم کی اداسی اور افسردگی چھائی ہوتی ہے لیکن اس قبرستان کی خاموش فضا میں دہشت پیدا نہیں ہوتی۔ یہاں اب بھی عظمت اور شان باقی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں ایک قسم کی پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہوتی ہے اور ناظر جب یہاں داخل ہوتا ہے تو یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کسی مقدس جگہ آ گیا ہے اور یہی ان مقبروں کا مقصد تھا۔

سید ضیاء الحق

قلعہ گولکنڈہ

یہ قلعہ شہر حیدرآباد کے مغرب میں پانچ میل کے فاصلہ پر پہاڑی کی چٹان پر واقع ہے۔ زمین کی سطح سے قلعہ کی بلندی (۴۰۰) فٹ ہے۔ قلعہ کی فصیل کا دور چار میل ہے جس پر نصف دائرہ کی شکل کے (۸۷) برج ہیں جن میں پیٹلہ برج اور موسیٰ خاں برج زیادہ شہرت کے حامل ہیں۔ ان کی بلندی پچاس سے ساٹھ فٹ تک ہے۔ بڑے بڑے وزنی پتھر دیوار کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں فصیل کے باہر پچاس فٹ چوڑی خندق ہے۔

زمانہ قدیم میں راجایان کاکیتیا نے اس قلعہ کی بنیاد ڈالی زمانۂ مابعد میں تقریباً تمام بادشاہان بہمنیہ اور قطب شاہیہ نے اس کی تعمیر، استحکام اور مرمت میں حصہ لیا۔ اس قلعہ کی تعمیر عرصہ دراز تک ہوتی رہی۔

اس کا ابتدائی نام "منکال" تھا۔ بعض تاریخوں میں "منگل وارم" بھی بتلایا گیا ہے، اس وقت اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے اطراف مٹی کی ابھری دیوار کھڑی ہوئی تھی۔ تیرھویں صدی کے آخری زمانے میں مسلمانوں نے دکن کا رخ کیا۔ ملک

جتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے
سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے

وجہی کی قطب مشتری کے علاوہ اردو نثر میں دو کتابیں سب رس اور تاج الحقائق بھی اب تک دستیاب ہو چکی ہیں سب رس تو بہت بعد کو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں سنہ ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۴ء میں قلم بند ہوئی قطب مشتری اور سب رس دونوں چھپ چکی ہیں۔ تاج الحقائق کو راقم الحروف نے مرتب کیا ہے لیکن ابھی شایع نہیں ہوئی۔ افسوس کہ وجہی کا اردو کلیات اب تک دستیاب نہ ہوا[1]۔ البتہ فارسی دیوان موجود ہے۔

محمد قلی کے کلیات کی طرح وجہی کی سب رس بھی قدیم اردو کی بہت ہی قابل قدر تصنیف ہے۔ قطب مشتری کی طرح یہ قصہ بھی استعارے کے پیرائے میں لکھا گیا اور اردو کی پہلی ادبی نثر سمجھا جاتا ہے۔

وجہی گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعراء تھا اور اس کے زمانے میں آندھرا پردیش میں اتنے ادیب اور شاعر پیدا ہو چکے تھے کہ اس نے اپنے وطن کے متعلق یہ فخریہ شعر لکھے تھے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہی لگ

---

[1] گزشتہ چند سالوں کے دوران وجہی کی چند غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جنھیں راقم نے اپنے مضمون "وجہی کا تغزل" میں یکجا کر دیا ہے دیکھیے "مجلہ تحقیقات اردو ۱۹۸۰ء شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ (محمد علی اثر)

کافور کے طوفانی حملوں نے دکن کی کئی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا۔ حکومت کاکیتیا بھی اس کے حملوں کی زد سے بچ نہ سکی۔ یہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ سلطنت بہمنیہ کو فروغ ہوا، اور سلطنت کاکیتیا کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا۔

۱۳۷۱ء میں کرشنا دیو کاکیتیا، اور محمد شاہ بہمنی اول (۱۳۵۸ء۔۱۳۷۵ء) کے مابین جنگ ہوئی۔ کرشنا نے شکست کھائی اور قلعہ گولکنڈہ سے اس کو دست بردار ہونا پڑا۔ سلطنت بہمنیہ میں گول کنڈہ شامل ہوگیا۔

اس صلح کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ کا اظہار ضروری ہے۔ کرشنا نے محمد شاہ اول کی خدمت میں ایک نفیس آبنوس کا تخت بطور تحفہ پیش کیا جس میں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے، وقت ضرورت اس کے تمام حصے علٰحدہ کر کے ایک چھوٹے سے صندوق میں بند کیے جا سکتے تھے، اس وقت اس کی قیمت کا اندازہ تیس لاکھ روپے کیا گیا تھا۔

محمد شاہ اول کے بعد اس کے جانشین کے دور میں اس میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن محمد شاہ بہمنی دوم (۱۳۷۸ء۔۱۳۹۷ء) نے تخت کے جواہرات شراب کی پیالیوں کی آرائش کے لیے نکلوا دیے۔

محمود گاواں کے قتل کے بعد سلطنت بہمنیہ میں انتشار پیدا ہوگیا اور ۱۵۱۸ء میں اس سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس وقت سلطان قلی گولکنڈہ کا صوبیدار تھا۔ اس کا خطاب قطب الملک تھا۔ سلطنت بہمنیہ کے دوسرے صوبیداروں کی طرح یہ بھی ۱۵۱۸ء میں سلطان قلی قطب شاہ کا لقب اختیار کر کے خود مختار بن بیٹھا۔ یہاں سے قطب شاہی سلطنت کی ابتدا ہوتی ہے اور گولکنڈہ کو پایہ تخت بننے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

قطب الملک نے اپنے دورِ صوبیداری میں قلعہ گولکنڈہ کو مستحکم کیا، شہر کو آباد اور خوبصورت بنایا اور اس کا نام "محمد نگر" رکھا۔ اپنی بادشاہت کے زمانہ میں قلعہ کی فصیل کو سنگین بنایا اور اس کو سلطنت کی مرکزی حیثیت دی، اور یہ حکومت کے اہم ترین قلعوں میں شمار ہونے لگا۔

ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰ــــ۱۵۸۰ء) نے برجوں کی تعمیر کی اور ان کو پتھر اور چونہ سے مضبوط کیا۔

عبداللہ قطب شاہ (۱۶۳۶ــــ۱۶۷۲ء) کے دورِ حکومت میں سلاطین مغلیہ کی دلچسپیاں دکھن میں بڑھتی جا رہی تھیں اور وہ دکن کے معاملات میں زیادہ حصہ لینے لگے تھے۔ اورنگ زیب نے عبداللہ قطب شاہ سے خراج کا مطالبہ کیا جس کی ادائی میں عبداللہ لیت و لعل کرتا رہا۔ ۱۶۶۲ء کے بعد دونوں کے تعلقات بے حد کشیدہ ہو گئے۔ جس کا سبب محمد امین فرزند میر جملہ کا مقید کر دیا جانا تھا۔ میر جملہ سپہ سالار افواج گولکنڈہ تھا، محمد امین کی گستاخانہ حرکت پر عبداللہ نے اس کو قید کر دیا۔ میر جملہ ناراض ہو کر اورنگ زیب سے جا ملا اور اس کی سازشوں کے باعث اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر حملہ کر دیا، مغل افواج پیش قدمی کرنے لگیں، یہاں تک کہ انہوں نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرہ کے دوران میں موسیٰ خاں وزیر اعظم گولکنڈہ کے حکم سے ایک توپ سر کی گئی۔ مغل جنرل میر میراں اس کی زد میں آ کر شدید زخمی ہوا اور تین دن کے بعد انتقال کر گیا، اس کے بعد صلح ہو گئی۔ اس صلح کی یادگار میں جس مقام سے گولہ چلایا گیا تھا ایک زبردست برج تعمیر ہوا اور یہ وزیر موسیٰ خاں کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر دو کتبے ہیں، ایک فارسی اور دوسرا تلنگی میں جن میں اس قلعہ کے محاصرہ

کی کیفیت درج ہے۔

اس صلح کے سلسلہ میں بھی ایک دلچسپ واقعہ کا اظہار بے جا نہ ہوگا۔ صلح نامہ کی رو سے عبداللہ قطب شاہ نے خراج دینے اور اپنی بیٹی کو شہزادہ سلطان محمد کے نکاح میں دینے کا وعدہ کیا۔ سلطان عبداللہ کے کوئی لڑکا نہ تھا، اس لئے شہزادہ سلطان محمد کو ولی عہد تسلیم کر لیا گیا۔ عنایت خاں مصنف "شاہ جہاں نامہ" نے شادی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ یکم جمادی الثانی ۱۰۶۶ھ کو عقد مقرر کیا گیا، ایک روز پیشتر سلطان محمد نے اپنے دیوان محمد طاہر کو قاضی اور خلعت کے ساتھ عبداللہ کے پاس بھیجا، دوسرے روز نکاح خوانی ہوئی اور دیگر رسومات بھی انجام پائے۔ ایک ہفتہ کے بعد شہزادہ سلطان محمد دوبارہ اپنے دیوان اور بخشی کو دولہن کو لانے کے لئے روانہ کیا۔ امرائے قطب شاہیہ نے شہر پناہ کے باہر استقبال کیا۔ دوسرے روز اورنگ زیب نے ایک خاص فرمان اور خلعت سے عبداللہ کو سرفراز کیا جس کو اس نے بہت ہی تعظیم کے ساتھ حاصل کیا مگر بدقسمتی سے سلطان عبداللہ کے انتقال سے پیشتر ہی شہزادہ سلطان محمد چل بسا، اور باہمی صلح اور رضامندی کی بنا پر دونوں سلطنتوں کا انضمام عمل نہ آسکا۔

سلطان ابوالحسن تاناشاہ (۱۶۷۲ ——— ۱۶۸۷ء) قطب شاہی خاندان کا آخری تاجدار ہے۔ ابوالحسن نے اورنگ زیب کو وقت پر خراج ادا نہیں کیا اور مرہٹوں سے ساز باز شروع کی گولکنڈہ پر حملہ کرنے کے لئے اورنگ زیب بہانے تلاش کر رہا تھا اس لئے اس موقع کو غنیمت جان کر گولکنڈہ پر حملہ کر دیا۔ آٹھ مہینوں تک قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ رہا۔ مغل افواج قلعہ کے اندر داخل ہونے میں ہر مرتبہ ناکام رہیں۔

بالآخر اورنگ زیب نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے گولکنڈہ کے اکثر امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا، اور ایک روز ایک غدار عبداللہ خاں نے موقع پا کر قلعہ کا ایک دروازہ کھول دیا، مغل افواج قلعہ میں داخل ہو گئیں۔ اور اس طرح ۱۶۸۷ء میں قلعہ فتح ہو گیا۔

جس دروازے سے مغل فوجیں گولکنڈہ میں داخل ہوئیں اس کا نام اورنگ زیب نے اپنی فتح کی یادگار میں "فتح دروازہ رکھا"۔ قدیم قلعہ کے پہلو میں اورنگ زیب نے ایک اور چھوٹا سا قلعہ بھی بنایا۔ اس کا دروازہ نئے قلعہ کا دروازہ کہلاتا ہے ان دو دروازوں کے علاوہ قلعہ کے اور چھ قدیم دروازے بھی ہیں۔ جن کو مختلف اوقات میں شاہان قطب شاہیہ نے بنوایا تھا۔

(۱) پٹن چرو دروازہ۔ شہر پٹن چرو اور قلعہ کے درمیان آمد و رفت کا ذریعہ تھا۔ چونکہ قلعہ کے اندر ایک بڑی آبادی تھی اس لئے آمد و رفت کے علاوہ تجارت کی بھی سہولت تھی۔ اس دروازے کے قریب شاہان قطب شاہیہ کے عالی شان مقبرے واقع ہیں۔

(۲) مکہ دروازہ۔ اس دروازے کا رخ مکہ شریف کی جانب رکھا گیا ہے اور عقیدۃً مکہ دروازہ سے موسوم کیا گیا ہے۔

(۳) بنجارہ دروازہ۔ سلطنت کے مختلف حصوں سے قبائلی لوگ (بنجارے) اپنا اپنا سامانِ تجارت لاتے تھے، اس دروازے سے کچھ دور پہاڑیوں کے دامن میں خیمے ڈال کر ٹھہرتے تھے اور دن میں اسی دروازے سے قلعہ کے اندر چلتے اور اپنا سامان فروخت کر کے شام میں پھر اپنے خیموں کو واپس

ہو جاتے۔ ان خانہ بدوش قبائلی لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے اس کا نام
بنجارہ دروازہ مشہور ہوگیا۔

(۴) جمل دروازہ ۔ سامانِ تجارت سے لدے ہوئے اونٹ سلطنت
کے مختلف حصوں سے آتے تھے۔ اور تا ختم کاروبار اس دروازے کے قریب ٹھہر
جاتے۔ یہاں اونٹوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

(۵) موتی دروازہ ــــ موتی محل میں شاہی بیگمات رہتی تھیں۔ ان
کے اور بادشاہ کی آمد و رفت کے لئے یہ دروازہ مختص تھا۔

(۶) بہمنی دروازہ ــــ اس کا رخ سلطنت بہمنیہ کے پایہ تخت
گلبرگہ شریف کی جانب ہے یہ قلعہ اور گلبرگہ شریف کے درمیان حمل و نقل کا
راستہ تھا۔

اس وقت قلعہ کے اندر خشک کنوؤں اور ویران زمینات کے آثار
موجود ہیں۔ کسی زمانے میں یہ کنوئے کھیتی کو سیراب اور آبادی کو پانی سربراہ
کرتے ہوں گے اور زمین کھیتوں سے لہلہاتی ہوگی۔

اس وقت صرف بارہ دری بالاحصار اور ایک دو محلات اچھی حالت
میں ہیں۔ مشہور ہے کہ بارہ دری کے کسی ایک گوشے میں زمین دوز راستہ کا
خفیہ دروازہ بھی ہے جو پانچ میل تک اندر ہی اندر ہوتا ہوا گوشہ محل تک
چلا گیا ہے۔ یہ زمین دوز راستہ وقت ضرورت بادشاہ کی قلعہ سے فراری
کے لئے رکھا گیا تھا اور اس کا علم خود بادشاہ اور چند خاص امراء کے سوائے
کسی کو نہ تھا۔

ایک مورخ نے ہندسہ چودہ [۱۴] کو ابوالحسن کی زندگی سے عجیب انداز میں

وابستہ کیا ہے۔ اپنی عمر کے چودہ سال ابوالحسن نے بچپن میں گزارے۔ دوسرے چودہ سال حضرت سید شاہ راجو حسینیؒ دوم کا خاص معتقد رہا۔ تیسرے چودہ سال حکومت کی اور آخری چودہ سال قید میں رہا

فتح گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) اور تاریخ وفات (۱۶۹۹) صرف بارہ سال کی درمیانی مدت ہے۔ چونکہ ابوالحسن کی تاریخ ولادت صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکی اور یہ لحاظ حساب شمسی و قمری ہر ایک ہجری اور عیسوی سال میں کچھ دنوں کا فرق پیدا ہوتا ہے اس لئے چودہ سال نظر بندی بعید از قیاس نہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب

قطب شاہی تہذیب کے اثرات
حیدرآباد کی موجودہ زندگی پر

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر — رکھیا جیوں توں دریا میں من یا سمیع

تین سو چھیاسی (۳۸۶) سال پہلے محمد قلی نے شہر حیدرآباد کو بسانے کے بعد یہ شعر کہا تھا۔ اگرچہ یہ شعر کہے ہوئے ابھی سو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا لیکن قطب شاہی تہذیب کی حکمرانی حیدرآبادیوں کے دلوں پر تا دیر باقی رہی اور شاید اب بھی ہے۔

آج سے سو برس پہلے میکنزی نے جب ضلع چتور کا گزیٹیر مرتب کیا تو اس نے اس بات پر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور ہے بھی یہ بڑی حیرت کی بات کہ اس زمانے تک نہ صرف شہر حیدرآباد بلکہ آندھرا، تلنگانہ اور رائل سیما کے دور دراز اضلاع میں بھی لوگوں کے دل تانا شاہ کی محبت سے لبریز تھے جن لوگوں نے کم از کم ربع صدی پہلے کا حیدرآباد دیکھا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس شہر میں قطب شاہی تہذیب سے لوگوں کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔

قطب شاہی دور کی کہانیاں بوڑھوں اور بچوں میں یکساں طور پر مقبول تھیں۔ شہر حیدرآباد کی انفرادیت قطب شاہی تہذیب کے آب ورنگ سے نکھری ہے۔ یہ ایوان (ایوان اردو) جس میں آپ ہم اکٹھا ہوئے ہیں قطب شاہی تہذیب کے ایک عظیم دلدادہ ڈاکٹر زور کا تعمیر کیا ہوا ہے۔ یہ ایوان ڈاکٹر زور کی شخصی تمنا کا اظہار نہیں ہے بلکہ حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب کے ان پرستاروں کی تمنا کی نمائندگی بھی کرتا ہے جو علم و ہنر اور دانشوری کے روشن میناروں کی حیثیت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔

قطب شاہی تہذیب سولہویں اور سترھویں صدی کے دوران مخصوص حالات میں پروان چڑھی ہے اس کا گھر گولکنڈہ تھا۔ یہ سلطنت کم و بیش موجودہ آندھرا پردیش کے تمام علاقے پر پھیلی ہوئی ایک دیسی ریاست کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی دولت و خوش حالی کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا میں اس کے چرچے تھے۔ آج بھی انگریزی زبان میں لفظ گولکنڈہ (GOLCONDA) کے معنی دولت و خوشحالی کے ہیں۔ گولکنڈہ میں چلنے والا چاندی کا سکہ جو کبھی کاسو کہلاتا تھا اب انگریزی میں لفظ کیش بن گیا ہے جو بے تکلف انگریزی اور دوسری زبانوں میں برتا جاتا ہے۔ گولکنڈہ نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا جہاں کی ایک اہم تجارتی منڈی کا مقام رکھتا تھا۔ مغرب میں ڈنمارک ہالینڈ، اور انگلستان سے لے کر مشرق میں چین و جاپان سے اس کے تجارتی تعلقات نے اس کی تہذیبی اہمیت کو بہت بڑھا دیا تھا۔ قطب شاہی دور میں دنیا کے مختلف ممالک کے باشندے یہاں کثیر تعداد میں آئے۔ ان میں خاص طور پر ایرانی، ترک، تاجیک، افغان، عرب، آرمینی جیسے ایشیائی باشندوں کے

علاوہ کثیر تعداد میں حبشی، ولندیزی اور انگریز یہاں آباد تھے۔ حبشیوں، آرمینوں عربوں، ایرانیوں اور یورپی اقوام کی اچھی خاصی بستیاں آباد تھیں جن کا اندازہ ان کے نام پر موسوم محلوں اور ان کے قبرستانوں سے ہوتا ہے قطب شاہی دور میں شہر حیدرآباد کو کاسموپولیٹن شہر کی حیثیت حاصل تھی۔ اس تہذیب کا سب سے اہم ورثہ جو آج بھی ہم کو حاصل ہے وہ اس شہر کی تہذیب میں قبولیت اور پذیرائی کی صلاحیت ہے۔ دنیا کی کسی قوم یا فرد یا کسی علاقے کا باشندہ ہو جب حیدرآباد میں قدم رکھے تو اپنی اجنبیت کے باوجود وہ قدم قدم پر ایسی یگانگت بھی محسوس کرے گا جس سے اس کی اجنبیت کا احساس جلد سے جلد دور ہو جاتا ہے یہ کیفیت جیسا کہ میں نے عرض کیا قطب شاہی تہذیب کا ورثہ ہے کیونکہ قطب شاہی دور میں تہذیب اور نسلوں کا جس قدر اختلاط گولکنڈہ میں ہوا ہے وہ اس سے پہلے یا اس کے بعد اس علاقے میں اس قدر بڑے پیمانے پر شاید ہی ہوا ہو۔ گولکنڈہ میں جس دکنی محاورے کی نشو نما ہوئی ہے اس میں دنیا کی متعدد زبانوں کے اثرات شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو یا دکنی گولکنڈے میں ایک ایسے محاورے کے طور پر پھیلی اور پھولی جو نہ صرف ہندستان کے مختلف علاقوں بلکہ یورپی علاقوں سے آنے والوں کا ایک مشترک وسیلۂ اظہار بن گئی۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ آیا ہوا برطانوی سیاح پادری ایک واقعہ لکھتا ہے کہ جب ایک مسلمان افسر کی زیادتی کی شکایت اس سے بڑے افسر کے پاس کی گئی تو عہدہ دار ماتحت نے اپنی غلطی کا انکار کر دیا جس پر افسر اعلیٰ نے کہا "کیا مسلمان جھوٹ بولتا ہے؟" پادری کہتا ہے کہ یہ فقرہ کہ کیا مسلمان جھوٹ بولتا ہے زبان زد خاص و عام تھا۔ اس جملے میں زبان کی صفائی

اور بول چال کی روانی خود یہ بتلاتی ہے کہ حیدرآباد میں خاص و عام اردو بولا کرتے تھے۔ یوروپی سیاحوں کے یہاں گولکنڈہ کی اردو بول چال اور محاوروں کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

گولکنڈہ کی تہذیب کے جو اثرات آج بھی حیدرآباد کی تہذیب میں باقی ہیں ان کو تین بڑے زمروں میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، ایک تو حیدرآباد کی زبان دوسرے اس شہر کی ساخت دپرداخت اور تیسرے یہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور ان کے بعض محاورات اطوار، جہاں تک زبان کا معاملہ ہے صرف اردو ہی نہیں بلکہ تلنگی بھی قطب شاہی تہذیب سے متاثر ہے۔ یہاں کے اردو محاورے میں جہاں دنیا کی مختلف زبانوں کے اثرات موجود ہیں وہیں اس کا لہجہ تلنگی زبان کی روانی کے ساتھ بہا چلا جارہا ہے۔ اردو میں تلنگی کی روانی قطب شاہی دور کی شاعری میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے محمد قلی کی شاعری کے بیسیوں پہلوؤں میں اس کے لہجے اور آہنگ کی تیز روی ایک اہم وصف ہے۔ گفتگو کی روانی لفظوں کے مکمل تلفظ کی متحمل نہیں ہوسکتی عربی الفاظ جن کا املا صوتیات سے متعین نہیں ہوا بلکہ املے سے تلفظ متعین ہوا ہے جب حیدرآبادی صوتیات کی زد میں آتے ہیں تو ان کے تلفظ کے عربی پیچ وخم ٹوٹ کے رہ جاتے ہیں اور لفظ کا تلفظ سپاٹ اور رواں ہو جاتا ہے جیسے "مصحف" کی بجائے "مصف" "مسجد" کے بجائے "مجید" حیدرآباد کی روزمرہ بول چال میں روانی حیدران کن ہے اس کے علاوہ بول چال کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں اب قطب شاہی دور کا محاورہ بہت کچھ باقی ہے۔ آزادی ہندستان کے بعد

دکھن ملک کھن دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سر ہور دکن تاج ہے
دکھن ملک بہو تیج خاصہ اہے
تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

ملا احمد بھی وجہی کا ہم عصر تھا۔اب تک اس کی صرف دو کتابیں قصۂ لیلیٰ مجنون (سنہ ۱۶۰۰ء) اور احوال مصیبت اہل بیت دستیاب ہو گئی ہیں[1]۔اس نے ۱۶۵۰ء سے قبل وفات پائی۔ابن نشاطی نے بھی پھولبن میں اس کو یاد کیا ہے۔اور اس کے کلام کی تعریف کی ہے اس کا کلام وجہی کے ہم رنگ ہے۔مثنوی لیلیٰ مجنون کا سبب تالیف اس طرح بیان کرتا ہے۔

جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر
منجے غم کی بندگی سے آزاد کر

دیئے امر اعلیٰ کہ یہ باغ لاؤں
جو پالوں اسے شاہ امریت ناؤں

جو میں شاہ کا امر سر پر سیتا
ترت باغ لانے شتابی کیتا

بہو تیک پریشانی روزگار
اگر منجہ ہے طاقت سو بار

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ اردو ادب" (جلد اول) میں احمد کی ایک غزل شائع کی ہے۔(محمد علی اثر)

سے ہندستان کے مختلف علاقوں کا تہذیبی میل جول بہت بڑھ گیا ہے جس کے زیر اثر علاقائی تہذیبوں کی انفرادیت گھٹتی گئی ہے۔ جن لوگوں نے سابق ریاست حیدرآباد میں شہر حیدرآباد کی بول چال سنی ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ گولکنڈہ کا محاورہ حال حال تک زندہ تھا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب یہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اردو زبان وادب کے کسی طالب علم کو اس پر کام کرنا چاہئے کہ حیدرآباد میں مختلف محاوروں اور لسانی تبدیلیوں کے کون کون سے دور رہے ہیں اور موجودہ دور میں اس کے قطب شاہی عناصر کس حد تک باقی ہیں۔

حیدرآباد کی تہذیب میں جو دوسرا اہم قطب شاہی اثر کارفرما ہے وہ شہری منصوبہ بندی کا ہے شہر حیدرآباد کی جب بنیاد رکھی گئی تو وہ ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت رکھی گئی تھی اس کے لئے مقامی ہندستانی معماروں کے علاوہ ایران اور عراق کے ممتاز معمار بلائے گئے۔ ماحول اور زمین پیمائوں نے ان کی مدد کی۔ ایک باقاعدہ شہر منصوبہ بندی کے بعد یہ شہر بسایا گیا۔ پہلا قدیم شہر تو گولکنڈہ میں شاہی مقبروں کے شمال میں بسایا گیا تھا جو بڑھتے بڑھتے پرانے پل تک چلا گیا تھا نیا شہر چارمینار کے ساتھ بسایا گیا جو پھیلتا ہوا سعیدآباد تک نکل گیا گولکنڈہ سے سعیدآباد تک۔ شہر کا پھیلاؤ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پھیلاؤ کا رجحان ہمیشہ افقی رہا ہے یہ آج بھی باقی ہے۔ موجودہ شہر حیدرآباد جو ۲۶ مربع میل پر پھیلا ہوا ہے اب میٹرو پولیٹن شہر کی حیثیت سے (۲۰۰) مربع میل پر پھیلنے والا ہے۔ وسیع اور کشادہ مکانوں، بڑے بڑے صحن اور خانہ باغوں کا شوق حیدرآباد میں قطب شاہی دور کا تحفہ ہے نئے جمہوری دور میں اب خانہ باغوں کی جگہ عوامی باغ لے رہے ہیں اور لیتے جائیں گے۔ حیدرآباد کی

جتنی بڑی سڑکیں اس وقت موجود ہیں وہ سب کی سب قطب شاہی دور کا تحفہ ہیں۔ قطب شاہی دور کا طرز تعمیر ہندوستانی ایرانی، عراقی اور یوروپی طرز تعمیر کے مختلف عناصر پر مشتمل تھا جس کے نتیجے میں یہاں طرز تعمیر کا ذوق ہمیشہ ایک رنگا رنگ کیفیت پیش کرتا رہا ہے۔ آج بھی حیدرآباد کے ذوق تعمیر میں دنیا کے مختلف علاقوں کی طرز تعمیر کے طریق جھلکے پڑتے ہیں۔ معاشی و مادّی تفاوت نے قطب شاہی دور میں بھی طرز تعمیر کو "بلندش بنہایت بلند و پستش بنہایت پست" کی حالت میں رکھا۔ یہ کیفیت آج بھی ہے کہ آج جہاں نئی وضع کے نہایت خوبصورت مکان تعمیر کئے جا رہے ہیں وہیں ردّے کی دیواریں بھی اٹھائی جا رہی ہیں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ردے کا طریقہ تعمیر اس شہر میں قطب شاہی دور سے چلا آرہا ہے۔

قطب شاہی تہذیب کے اثرات اس شہر کے رہن سہن اور اخلاق وعادات پر بھی نمایاں ہیں میری رائے میں بعض اثرات پسندیدہ ہیں اور بعض ناپسندیدہ۔ قطب شاہی تہذیب میں منکسرت انکساری اور دوست داری کے اوصاف بہت نمایاں ہیں۔ اس کا تذکرہ ایشیاء اور یوروپ کے مختلف سیاحوں کی تحریروں میں ملتا ہے۔ یہ اعلیٰ صفت حیدرآبادیوں میں ہر دور میں رہی ہے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت آج بھی زیادہ ہے۔ ان اوصاف نے صحیح معنوں میں اس شہر کو مروت کا شہر بنا دیا ہے۔ انہی انسان دوستی کے زیر اثر حیدرآباد میں مذہبی تشدد پسندی غلو اور علحدگی پسندی کو کبھی فروغ حاصل نہیں ہوا۔

قطب شاہی دور میں ان خوبیوں کے ساتھ چند کمزوریاں بھی پیدا ہو چکی

تھیں جن میں سب سے نمایاں سہل انگاری اور لذت کوشی تھی یہ کیفیت ہندستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت آج بھی یہاں زیادہ ہے۔ لوگوں کے دل خلوص و محبت سے بھرے ہیں، طبیعتیں اونچے مذاق کی حامل ہیں دوستی اور صلح جوئی کی کیفیت عام ہے لیکن کام کرنے کے انداز، راستہ چلنے کے ڈھنگ، نشست و برخاست تک ہر عمل میں سستی کی سی کیفیت ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے لوگوں کو وقت کی صحیح قدر و قیمت کا احساس نہیں ہے۔ جب میں حدیقۃ السلاطین کی دلکش عبارت میں گولکنڈہ کی تہذیب کو جیتا جاگتا دیکھتا ہوں تو اس میں بھی یہی کیفیت پاتا ہوں۔ تاہم قطب شاہی دور سے اس شہر کی یہ روایت ہے کہ یہاں جو لوگ کام کرنے والے نکلے وہ بلا کے کام کرنے والے نکلے۔

کتب خانہ آصفیہ، سالار جنگ میوزیم، اسٹیٹ آرکیوز اور خود ادارہ ادبیات اردو میں قطب شاہی دور کی جو قلمی کتابیں محفوظ ہیں وہ اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ قطب شاہی تہذیب نے اس شہر کو نہ صرف اردو زبان کا ایک اسلوب اور فن تعمیر چند پیرائے یا رہن سہن کے چند اطوار دیئے ہیں بلکہ قطب شاہی دور نے چند ایسی اہم چیزیں بھی حیدرآباد کو دی ہیں جو ایک عالمگیر تمدن کے فروغ کی ضامن ہیں یہ عناصر اعلیٰ قدروں پر مشتمل ہیں ان میں زرتشتی یونانی اور اسلامی اثرات زیادہ اہمیت کے حامل ہیں زرتشتی فلسفہ قطب شاہوں سے پہلے گولکنڈہ کی وید آشنا برہمن سوسائٹی کے لئے غیر مانوس نہیں تھا۔ لیکن قطب شاہی دور میں زندگی کے چھوٹے اور بڑے معاملات میں خیر و شر معیار فکر بھی بن گئے اور طریقہ استدلال بھی، حیدرآباد کے مسلمان ہوں

یا ہندو اس زرتشتی طرز فکر نے ان کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اسی طرح گولکنڈہ میں یونانیت کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا ہے۔ بقراط، سقراط، افلاطون، ارشمیدس، اقلیدس، بطلیموس، زینو اور دوسرے متعدد یونانی فلسفیوں کے افکار و کارنامے گولکنڈہ کے نظام تعلیم میں داخل تھے اور یہاں کے دانشوروں کے زیر بحث رہتے تھے یہی وہ دانشور ہیں جن کی تعلیمات آج بھی مختلف علوم کے وسیلے سے ہماری یونیورسیٹیوں میں شامل درس ہیں۔ اسلام کا یہ تصور کہ بنی نوع انسان نفس واحد سے پیدا ہوئی ہے اور خدائے واحد کا تصور گولکنڈے میں مقبول ہوا تھا۔ اور آج بھی تمام تلنگی علاقہ میں نہایت مقبول ہے۔

ان چند اشارات سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ قطب شاہی دور نے آندھرا پردیش کو ایسے کئی تحفے عطا کئے جو انسانیت، دوستی اور محبت ہی کے ضامن نہیں ہیں بلکہ یہاں کے فرد کو کسی بھی عالمی تہذیب میں فکر و عمل کی مسابقت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ قطب شاہی تہذیب کے جو اثرات آج باقی ہیں ان میں زیادہ تر وہ عناصر ہیں جو تہذیبی رنگا رنگی کے گلدستے کے لئے رشتہ شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سید مسعود احمد رضوی

قطب شاہوں کی مہریں اور دستخط

قطب شاہی کتب خانوں کی کتابوں اور فرامین پر اب تک بادشاہوں کے جو دستخط اور قسم قسم کی مہریں نظر آئیں، ان کی تفصیلات کو تاریخ گولکنڈہ کے طالب علموں کے استفادے کے لئے شائع کرنا ضروری ہے۔

سالار جنگ میوزیم کمرہ نمبر (۱۸) میں جو قلمی کتابیں رکھی ہوئی ہیں ان کے منجملہ شوکیس نمبر ۱۱ میں دیوان حضرت علی کرم اللہ وجہ ۹۱۸ھ کا مکتوبہ موجود ہے جس کا میوزیم نمبر (۲۰۸) ہے۔ اس کتاب میں ہر شعر کے نیچے فارسی شعر میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شاہان گولکنڈہ کے کتب خانہ کی ہے جس پر ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی مہریں ثبت ہیں۔ یہ مہریں صاف ہیں اور الفاظ آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ اتنی صاف مہریں کسی اور کتاب پر اب تک شاید دستیاب نہ ہو سکیں۔ تینوں مہریں ایک ہی صفحہ پر ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ بانی شہر حیدرآباد کی مہر میرے حد علم تک اب تک پڑھی نہ جا سکی تھی اور شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی ہو کہ اس بادشاہ کی مہریں کمیاب بھی ہیں اور

جو بھی مل سکی تھیں وہ زیادہ واضح نہ تھیں ۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ سالار جنگ میوزیم کے سہرے سہرا رہا کہ بانی شہر حیدرآباد کی مہر کا سجع معلوم کیا جاسکا ۔ اس کے لیے زیادہ تر مولوی قدرت رحیم صاحب کتاب مشرقی سالار جنگ اسٹیٹ قابل مبارکباد ہیں کہ ان کی مساعی کامیاب رہیں ۔

ابراہیم قطب شاہ کی مہر تو بہت ہی کمیاب ہے ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں جو نمائش منعقد ہوئی تھی اس میں مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی کی مملوکہ کتاب "دیوان جامی" بھی رکھی گئی تھی جس میں ابراہیم قطب شاہ کی مہر موجود ہے لیکن اس کے الفاظ زیادہ تر صاف اور واضح نہیں ۔ سالار جنگ میوزیم میں جو مہر ہے وہ صاف اور صریح ہے ۔

ابراہیم قلی قطب شاہ ۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ

مہر بطور طغریٰ	شہے کہ نقش نگیں مہر حب آل مقیم
	بود سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم

محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ

مہر بطور طغریٰ	ملک جہاں مرا کہ بزیر نگیں شدہ
	از حکم بادشاہ جہاں آفریں شدہ
دستخط	العبد محمد قلی قطب شاہ
چھوٹی مہر	غلام علی محمد قلی قطب شاہ

سلطان محمد قطب شاہ ۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ

مہر بطور طغریٰ	مہر سلیماں ز حق گشتہ میسر مرا
	نقش نگین دل است حیدر صفدر مرا

دستخط	العبد محمد - قطب شاہ
"	العبد الخاص لمولاہ سلطان محمد قطب شاہ
چھوٹی مہر	بندۂ شاہ نجف سلطان محمد قطب شاہ

سلطان عبداللہ قطب شاہ - ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ

مہر بطور طغریٰ	بندہ شاہ ولایت علی
	سلطان عبداللہ قطب شاہ
"	مدد علی محمد اللہ
	سلطان عبداللہ را
دستخط	ابو المظفر سلطان عبداللہ قطب شاہ
آخری مہر	ختمہ بالخیر والسعادة

سلطان ابوالحسن تانا شاہ - ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ

مہر بطور طغریٰ بارہ برجی	موید کہ بنا یید حق شہ دکن است
	بجان محب علی قطب شہ ابوالحسن است
دستخط	سلطان ابوالحسن قطب شاہ
چھوٹی مہر	ختمہ بالخیر والسعادة

پروفیسر عبد المجید صدیقی

خاندان قطب شاہی

۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء

اس خاندان کا بانی سلطان قلی قطب شاہ ہے جو ترکستان کے ایک بڑے قبیلے قراقونیلو کا رکن تھا یہ وہ قبیلہ ہے جس میں قرایوسف سکندر ثانی اور جہاں شاہ جیسی زبردست شخصیتیں پیدا ہوئیں اور جس نے ترکستان کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی تھی۔ سلطان قلی کے باپ اور دادا پیر قلی اور اویس قلی ہمدان کے رئیس تھے، لیکن پندرھویں صدی میں ان کو ایک دوسرے قبیلے سے جس کا نام آقو نیلو تھا، ایسا نقصان پہنچا کہ ان کو ہمدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ چنانچہ سلطان قلی اور اس کا چچا اللہ قلی دونوں ۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء

میں بیدر آ گئے اور سلطان محمد شاہ بہمنی کے دربار میں باریاب ہوئے۔ اللہ قلی تو ہمدان واپس ہوگیا لیکن سلطان قلی نے سلطنت بہمنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت بیدر میں طبقہ داری کشمکش جاری تھی جس کی وجہ سے سلطان قلی کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تاہم اس نے کسی فرقہ وارانہ رقابت میں حصہ نہیں لیا بلکہ اہل ملک اور شاہی خاندان کے ساتھ پوری وفا داری کی اور محض اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کی۔ ۸۹۹ھ/ ۱۴۹۳ء میں اس کو قطب الملک کا خطاب ملا، اور ۹۰۱ھ/۱۴۹۶ء میں تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا۔ محمود شاہ بہمنی کے انتقال (۹۲۴ھ/ ۱۵۱۸ء) کے بعد اس نے خود مختاری کا اعلان نہیں کیا، حالانکہ شمال کے صوبہ دار ملک احمد۔ یوسف عادل خاں۔ فتح اللہ ۸۹۵ھ/ ۹۰ ۱۴ء میں خود مختار ہو چکے تھے۔ چونکہ اس کا خطاب قطب الملک تھا اس لئے جب یہ ۹۲۴ھ/ ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کی وفات کے بعد خود مختار ہوا تھا تو ا سے قطب شاہ کہنے لگے۔ گولکنڈہ اس خاندان کا پایۂ تخت تھا۔

سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے طویل عہد حکومت میں اس سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے جانشین

جمشید قطب شاہ کے عہد میں جو اپنے باپ اور بھائیوں کو قتل کر کے تخت نشین ہوا تھا کوئی اضافہ نہیں ہوا اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم قطب شاہ اپنے بھائی سے ڈر کر بیجانگر میں جلاوطن ہوگیا تھا۔ یہ جمشید کے انتقال کے بعد ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء میں واپس آیا اور تخت پر قابض ہوا۔ اس عہد میں یہ سلطنت بہت مستحکم ہوگئی۔ اور اور جب ۹۷۲ھ/ ۱۵۶۵ء میں سلطنت بیجانگر کا خاتمہ ہوگیا تو قطب شاہی سلطنت کو جنوب میں پھیلنے کا اچھا موقع ملا ابراہیم قطب شاہ کے جانشین محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جو ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا تھا، اس سلطنت میں غیر معمولی تمدنی ترقیاں ہوئیں جو محمد قطب شاہ کے عہد میں جو محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا پایہ تکمیل کو پہنچیں اس طرح یہ سلطنت بہت اقبال مند ہوگئی۔ لیکن نظام شاہی سلطنت کے جانے کے بعد سے اس کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی بقا نظام شاہی سلطنت کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لئے جب ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۳ء میں آخرالذکر کا خاتمہ ہوگیا تو عادل شاہوں کے ساتھ قطب شاہوں پر آنچ آگئی

والدِ گرامی حکیم شیخ محبوب صاحب اور والدہ محترمہ کے نام

سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ تا ۱۶۲۵ء) جو محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ شاعری سے زیادہ علم وفضل کا دلدادہ تھا۔ کتابیں جمع کرنے، ان کو توجہ سے پڑھنے اور ان پر اپنی رائے اور دستخط ثبت کرنے کا اس کو بڑا شوق تھا خود محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی اسکنے جمع اور مرتب کیا تھا اور اس پر اردو میں ایک طویل منظوم دیباچہ لکھا تھا جس میں محمد قلی قطب شاہ کی طبیعت سخن طرازی کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی تھیں وہ ظل اللہ تخلص کرتا تھا۔ اس نے اپنے دیباچہ کے آخر میں محمد قلی کی اس خوبی پر زور دیا ہے کہ وہ دوسرے شاعروں کی طرح خودستائی نہیں کرتے تھے اور ہر مقطع میں حضرت علی رضہ کا نام ضرور لاتے تھے۔ کہتا ہے ؎

رہیا جائے نہ شاعران من منیں
بنا کہئے صفت شعر کے فن منیں
مگر شاہ کہے بیت پچاس ہزار
دھرے وصف اپس سون کہن بھوت عار
جو مقطع میں ہر ایک اپس شعر کے
لئے ہیں سو حضرت علی ناؤں اپلے
نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام
بغیر ان علی کا لئے باج نام

محمد قطب شاہ کے اردو اور فارسی کلام کے نمونے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کا اردو کلیات ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔

سلطان محمد کے دور کے اردو شاعروں میں غواصی بہت مشہور ہوا۔ ۵۵

چنانچہ ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء میں جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا کمسن بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت نشین تھا اس سلطنت کو مجبوراً مغلوں کا حکم بردار بننا پڑا عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۳ء میں اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ کیونکہ مرحوم کا کوئی بیٹا زندہ نہیں تھا۔ اگرچہ بڑا داماد سید احمد تخت کا دعویدار تھا، لیکن ملک نے ابوالحسن کی تائید کی جو حکومت کا بہت اہل تھا۔ اس نے مغلوں کے سیلاب کے مقابلے میں جو شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ آیا تھا اپنی سلطنت کو بچانے کی پوری کوشش کی لیکن یہ بار آور نہیں ہوئی بالآخر ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب کے ہاتھوں سے اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

ابوالحسن کو قلعہ دولت آباد میں قید کر دیا گیا۔ اس خاندان کے آٹھ بادشاہ گزرے ہیں۔

شجرۂ قطب شاہی

- (١) سلطان قلی قطب الملک ١٥١٨ء تا ١٥٤٣ء
  - حیدر قلی
  - قطب الدین
  - (٢) جمشید قطب شاہ ١٥٤٣ء تا ١٥٥٠ء
    - (٣) سبحان قلی ١٥٥٠ء
  - عبدالکریم
  - دولت قلی
  - (٤) ابراہیم قطب شاہ ١٥٥٠ء تا ١٥٨٠ء
    - عبدالقادر
    - حسین قلی
    - (٥) محمد قلی قطب شاہ ١٥٨٠ء تا ١٦١٢ء
      - حیات بخشی بیگم زوجہ سلطان محمد قطب شاہ
    - مرزا عبدالفتاح
    - مرزا خدابندہ
    - مرزا محمد امین
      - (٦) سلطان محمد قطب شاہ ١٦١٢ء تا ١٦٢٦ء
        - (٧) عبداللہ قطب شاہ ١٦٢٦ء تا ١٦٧٢ء
          - دختر زوجہ سید محمد
          - دختر زوجہ شہزادہ ابن عالمگیر سلطان مرزا
          - دختر زوجہ ابوالحسن قطب شاہ ١٦٧٢ء تا ١٦٨٧ء (معزول ہوا)
        - ابراہیم مرزا
        - علی مرزا
        - کمال مرزا
        - خدیجہ سلطانہ زوجہ محمد عادل شاہ
      - دختر زوجہ شاہ محمد عرب شاہ
        - شاہ خواندکار
    - چاند سلطانہ زوجہ ابراہیم عادل شاہ ثانی

غواصی شخصیت اور فن کے متعلق پاکستانی نقادوں کے تاثرات

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

"محمد علی اثر نے دکنی شعر و ادب کے تاریک گوشوں کی چھان بین بڑی محنت اور انہماک سے کی ہے۔ غواصی کی شخصیت کو اس کے دور کے سماجی اور ادبی پس منظر میں متعین کرنے کے علاوہ غواصی کے حالات زندگی، مثنویاں، غزلیں اور قصائد در باعیات، قدیم اردو شاعری میں غواصی کا مقام اور انتخاب کلام کے ابواب شامل ہیں۔ فاضل مصنف نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا حق بھی بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ قدیم اردو اور دکنی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے "غواصی کی شخصیت اور فن" کا مطالعہ نہ صرف سنگ میل ثابت ہوگا بلکہ اس سے بہت سے تاریک گوشے بھی اجاگر ہوں گے قدیم اردو ادب سے واقفیت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کارآمد ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔" (سب رس کراچی جولائی ۸۷ء)

ڈاکٹر جمیل جالبی

"آپ کی کتاب "غواصی شخصیت اور فن" میں نے شوق سے پڑھی آپ میں تحقیقی کام کرنے کی اچھی صلاحیت ہے۔ اس کتاب کو آپ نے بڑے سلیقے اور محنت سے لکھا ہے۔"

ڈاکٹر عبادت بریلوی

"آپ نے غواصی پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ کتاب دیکھ کر جی خوش ہوا۔"

اطہر سعید

"محمد علی اثر نے غواصی کی شخصیت و فن پر بڑے متوازن انداز میں یہ کتاب تحریر کی ہے اور اس کے کلام کا اچھا انتخاب کیا ہے۔ ان کی ادبی کاوش یقیناً لائق ستائش ہے۔"

شمع جلتی رہے (رپورتاژ) از ڈاکٹر محمد علی آثر

اردو میں کانفرنسوں اور سمیناروں کے رپورتاژ لکھنے کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان رپورتاژوں میں کانفرنس کی اصل روداد کو ضمنی حیثیت دے دی جاتی ہے اور کانفرنس کی بنیادی تخصیصوں اور بعض چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات پر جو کانفرنس کے دوران پیش آتے ہیں رپورتاژ نگار زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ محمد علی آثر نے اس رپورتاژ میں کانفرنس کی اصل روداد کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ یہ روداد بے جان اور خشک رپورٹ بن کر نہ رہ جائے چنانچہ اس رپورتاژ کا مطالعہ کرتے ہوئے سیمینار کے اجلاسوں کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم

ملاقات (شعری مجموعہ) از ڈاکٹر محمد علی آثر

محمد علی آثر کے مجموعہ کلام کو سرسری طور پر بھی دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اردو شاعری کی روایات کی پاسداری کے باوجود عصری حسیت بھی رکھتے ہیں۔ آثر کی شاعری میں نئی لفظیات کا شاعرانہ استعمال، نئی تراکیب اور نئے استعارے بھی ملتے ہیں، لیکن اس کے باوجود نہ تو شعر بعید از فہم ہوتا ہے۔ اور نہ تو جدت کی وجہ سے جدیدیت زدہ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست

"انتخاب"

اردو ادب میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر صابرہ سعید	25/00
شبلی نقادوں کی نظر میں	ناز صدیقی	20/00
فکر اقبال	مغنی تبسم	20/-00
مرزا علی لطف حیات اور شاعری	ڈاکٹر اکبر علی بیگ	30/-00
نظم طباطبائی حیات اور شاعری	ڈاکٹر اشرف رفیع	30/-00
شمع جلتی رہے	ڈاکٹر محمد علی اثر	5/-00
غنچۂ لب بستہ	ملک الشعراء حضرت اوج یعقوبی	20/-00
گرفت نظر	ملک الشعراء حضرت اوج یعقوبی	4/-00
موسم سنگ	مضطر مجاز	15/-00
ملاقات	ڈاکٹر محمد علی اثر	7/-00
شعلۂ نم	راز عابدی	10/-00
انتخاب باغ	صالحہ سلطانہ	10/-00
کوہ ندا	عوض سعید	12/-00
تیرے بغیر	اسماء سلطانہ	25/-00
نقش حیات	طٰہٰ آفندی	8/-00
انور	فیاض علی	20/-00
خوشے	ارشد علی خاں	10/-00
ہارا ہوا پرندہ	مظہر الزماں خاں	10/-00
انڈین کا جو	شائق شاہ	8/-00
راستے کی کہانی	خالق شاہ	8/-00
ظہور رتہ تیب	ڈاکٹر سکندر حسین	12/-00

(اسٹاکسٹ)

الیاس ٹریڈرس پبلشرز و بکسیلرز

شاہ علی بنڈہ روڈ حیدرآباد (۵۰۰۰۰۲)

اردو کتب

کی

طباعت کے لئے

ہماری خدمات

حاصل فرمائیے

الیاس ٹریڈرس

پبلیشرز اینڈ بک سیلرز

شاہ علی بنڈہ روڈ، حیدرآباد

(۵۰۰۰۰۲)

اگرچہ محمد قلی کے دور ہی سے ایک علیحدہ دبستان سخن بنا چکا تھا۔ مگر وجہی کی ملک الشعرائی کے آگے وجہی کا چراغ جل نہ سکا۔ اس کے کلیات میں بعض غزلیں محمد قلی کی غزلوں کی زمینوں میں ہیں اور ایک آدھ غزل تو دونوں کے دیوان میں بہ تبدیل تخلص موجود ہے۔ یہ کلیات ابھی غیر مطبوعہ ہے ایک مثنوی چندر بدن و مہیار بھی اسی دور میں لکھی تھی جو ابھی چھپی نہیں ہے لہ

غواصی کی مشہور مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال (سنہ ۱۰۲۴ھ) سلطان محمد قطب شاہ ہی کے عہد میں لکھی گئی تھی مگر۔ ان کا انتقال ہو جانے پر اس کے کمسن جانشین سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام غواصی نے معنون کر دی چنانچہ اس کے دیباچہ میں جہاں بادشاہ وقت کی مدح لکھی ہے اس میں پہلے اس نے سلطان محمد کا نام اس طرح لکھا تھا ۔

سو سلطان محمد قطب شاہ گنبھیر
جگ آدھار ہے ہور جگ دستگیر

لیکن جب اس بادشاہ کا اچانک مختصر سی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔ تو غواصی نے اس شعر کو بدل دیا اور باقی شعر وہی رہنے دیئے جو یہ ہیں ۔

جو سلطان عبداللہ آفاق گیر

سلکھن شہنشاہ گردوں سریر
چندرا چو دھواں خسروی برج کا

لہ غواصی کی اس مثنوی (مینا ستونتی) کو پروفیسر غلام عمر خاں نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ (محمد علی اثر)

امولک رتن حسن کے درنج کا

سکل بادشاہاں میں اس کا ہے ناول

اسی قطب کا قطب تارا ہے چھاول

غواصی کی تیسری مثنوی طوطی نامہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں لکھی گئی۔ یہ غالباً اس کی آخری طویل نظم تھی۔ اس وقت تک وہ مذہب و تصوف کی طرف مائل ہو چکا تھا اور چند سال بعد ہی انتقال کر گیا۔ مشہور مثنوی کا اس نے طوطی نامہ میں ترجمہ کیا تھا جو بہت مشہور رہا۔ غواصی اصل میں قصیدہ گو شاعر تھا۔ اور گولکنڈہ کے کسی اور شاعر کے اس پایہ کے قصیدے موجود نہیں ہیں عبداللہ قطب شاہ نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی اور سنہ ۱۶۳۴ء میں اس کو سفیر بنا کر بیجاپور روانہ کیا جہاں کے دربار اور شاعروں میں اس کی خاطر خواہ قدر و منزلت کی گئی اور وہ کثیر انعام و اکرام حاصل کر کے گولکنڈہ واپس ہوا۔

حسن شوقی اسی دور میں سلطان محمد قطب شاہ کی علم دوستی کا شہرہ سن کر حیدرآباد آیا تھا۔ اس کا ذکر بیجاپور کے شاعروں میں گزر چکا ہے لیکن وہ گولکنڈہ میں بھی بہت مقبول رہا اور یہاں کے شاعروں میں اپنا رنگ جماتا رہا اور غالباً محمد قطب شاہ کی تعریف میں قصیدے اور اس کی فرمائش پر کوئی مثنوی بھی لکھی لیکن یہ اب ناپید ہے۔[1]

اس نے ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء سے پہلے انتقال کیا۔ کیونکہ اس سال جب ابن نشاطی نے پھول بن لکھی تو اس میں جہاں دوسرے مشہور شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کا نام

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی نے حال ہی میں حسن شوقی کا دیوان شائع کیا ہے۔ (محمد علی اثر)

بھی لیا ہے اور متوقع ہے کہ اگر حسن شوقی زندہ ہوتا تو میرے کلام کی بہت داد دیتا۔

سلطان محمد کی وفات کے بعد جب اس کا کمسن شہزادہ عبداللہ حیدرآباد کا بادشاہ بنا (۱۶۲۵ تا ۱۶۷۲ء) تو قطب شاہی دربار میں علم وفضل کے مقابلہ میں پھر سے اردو شاعری کو ترجیح حاصل ہوگئی اور عہد محمد قلی کے شاعروں کی بن آئی۔ وجہی اور غواصی جیسے اساتذہ سخن جو محمد قلی کی وفات کے بعد سے دلگیر ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے پھر دربار میں بلائے گئے اور شاہی انعام واکرام سے بہرور ہونے لگے۔ چنانچہ وجہی نے اپنی باریابی کا ذکر سب رس کے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے۔

"صباح کے وقت۔ بیٹھے تخت۔ یکایک غیب تے کچھ
رمز پاکر۔ دل میں اپنے کچھ لیاکر۔ وجہی نادر فن کوں۔
دریا دل۔ گوہر سخن کوں۔ حضور بلائے پان دیئے۔ بہت مان دیئے
ہور فرمائے کہ انسان کے وجود تے کچھ عشق کا بیان کرنا۔
اپنا نادل عیاں کرنا۔ کچھ نشان دھرنا۔ وجہی بھوگنی گن
بھریا تسلیم کر کر سر پر ہاتھ دھریا۔"

وجہی کی طرح غواصی بھی سلطان عبداللہ کی قدر دانی شعر وسخن سے اتنا متاثر ہوا کہ مثنوی طوطی نامہ میں اس واقعہ کا اظہار کیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے شعر یہ ہیں ؎

کہیں یوں بحق علی ولی
کہ پھر جگ میں آیا ہے محمد قلی
ڈوبے تھے ہنرمند سو پھیر کر
نکل آئے تجھ دور میں تیر کر

دیا جیو میں راگ ہور رنگ کوں

کیا دور سینیاں پو کے زنگ کوں

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد میں جتنے بلند پایہ شاعر اور ادیب جمع تھے اور جیسی اعلیٰ درجہ کی کتابیں اردو نظم و نثر میں لکھی گئیں اور علم فضل اور شعر و سخن کی جس طرح قدر و منزلت کی گئی اس پر بجائے خود ایک علٰحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

خود سلطان عبداللہ قطب شاہ اردو اور فارسی کا ایک اچھا شاعر اور ماہر موسیقی تھا اور اس کا اردو دیوان بھی موجود ہے۔ اور سلسلۂ یوسفیہ میں چھپ چکا ہے۔ اس نے بھی محمد قلی کی طرح مختلف موضوعوں پر لکھا ہے لیکن اس کے کلام میں اتنی گہرائی اور وسعت نہیں ہے۔ البتہ زبان زیادہ صاف ہے۔

عبداللہ قطب شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کے نورس نامے کے جواب میں اس موضوع پر ایک طویل منظوم کتاب بھی اردو میں لکھی تھی جو ایک خانگی کتب خانہ میں موجود ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے دو اور درباری شاعر ملک خوشنود اور جنیدی بھی قابل ذکر ہیں۔ ملک خوشنود کی ابتدائی زندگی قطب شاہی دربار میں گذری تھی۔ لیکن بعد کو سلطان عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم کے جہیز میں وہ بطور غلام بیجاپور روانہ کر دیا گیا تھا لیکن حیدرآباد کے اس غلام نے عادل شاہی دربار میں آہستہ آہستہ بہ حیثیت شاعر جو جگہ حاصل کر لی اس کا ذکر بیجاپوری اردو ادب میں گذر چکا۔

جنیدی کا نام علی اکبر تھا اور عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۰ء میں اس کو سرنوبت کے عہدے پر سرفراز کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو جنیدی نے ملازمت

ترک کر دی تھی اور برہان پور میں مقیم ہوگیا تھا۔ اس نے سنہ ۱۶۵۴ء میں مثنوی ماہ پیکر لکھی تھی۔

اس عہد کے دوسرے شعرائے اردو میں ابن نشاطی بہت بڑا فن کار گذرا ہے جس نے سنہ ۱۶۵۵ء میں اپنی مشہور مثنوی پھول بن لکھی جس میں نہایت سادگی اور پرکاری کے ساتھ اکثر و بیشتر صنعتوں کو استعمال کیا ہے

ابن نشاطی دراصل ایک صاحب ذوق انشاء پرداز تھا اور شاعری اور سخن گستری اس کا پیشہ نہیں تھا۔ وجہی یا غواصی کے برعکس اس کو شاہی دربار سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا عوامی شاعر تھا اور دربار سے زیادہ عوام ہی میں اس کو شہرت نصیب ہوئی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

حضور یاں میں مرا اگر سلک اچھتا
گہر ریزہ اسلتے میرا کلک اچھتا
فراغت اس تے گر ٹک ہنج کوں ہوتا
یے موتیاں خوب میں اسلتے پروتا
بڑیاں کے ناو اچھتا تو بڑا این
سبھا کا دکھاتا بات میں فن
زمانہ ناسمج کو قدر میرا
نچھا یا بے دلی سوں صدر میرا

ابن نشاطی نے اپنے عنفوان شباب میں اپنی مثنوی پھول بن لکھی تھی اور اس میں اپنے ہم عصروں یا پیش رو اساتذہ سخن کی طرح اس نے کوئی شیخی یا تعلی نہیں کی ہے بلکہ جگہ جگہ عجز و انکساری سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے حریفوں پر چوٹ کے

بجائے اپنے پیش رو اساتذۂ سخن کے موجود نہ ہونے پر اس لئے اظہار افسوس کرتا ہے کہ اگر وہ اس تصنیف کو دیکھتے تو اس کی سچی قدر کرتے ۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
کہ دیتا شاعری کی کچھ مری داد

اہے صد حیف جو نیں سید محمود
کتے پاتی کوں پانی دود کوں دود

نہیں اس وقت پر وہ شیخ احمد
سخن کا دیکھتے باندھیا سو میں عد

حسن شوقی اگر ہوتو الحال
ہزاروں بھیجتا رحمت منج اپرال

اچھے تو دیکھتا ملا خیالی
یو میں برتیا ہوں سو صاحب کمالی

واقعہ یہ ہے کہ ابن نشاطی حیدرآباد کے ادب اور سخن گستری کے اس دور کا ایسا صاحب کمال تھا جس نے شاعروں اور ادیبوں کو درباری اور سرکاری قدر دانی سے بے نیاز ہوکر شعر و سخن میں معروف رہنے کا راستہ سمجھا دیا۔ چنانچہ اس کے بعد کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام ملتے ہیں جن کی تصنیف و تالیف کا شاہی سرپرستی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا ان میں سید بلاقی شاہ راجو میراں جی خدانما فاروقی اور میراں یعقوب کے کارنامے اب تک مشہور ہیں جو عہد عبد اللہ قطب شاہ کا تحفہ ہیں ۔

اسی دور کا ایک شاعر قطبی بھی تھا جس نے شیخ یوسف دہلوی کی کتاب تحفۃ

النصائح کا اردو ترجمہ سنہ ۱۶۳۷ء میں کیا تھا۔ یہ ۱۵۰۰ شعر کی ایک مذہبی نظم ہے اور ابھی تک نہیں چھپی۔

سلطان اس دور کے ایک صوفی تھے جن کا کلیات اردو موجود ہے لیکن یہ سارا کلام تصوف و عرفان کے مسائل اور تخیل سے معمور ہے۔[1]

سید بلاقی عبداللہ قطب شاہ کے مقربین سے تھے ان کی ایک مذہبی مثنوی معراج نامہ ۱۶۶۹ء (۱۵۰۰ ابیات) لکھی جو چھپ چکی ہے۔ یہ اصل میں کسی فارسی معراج نامہ کا ترجمہ ہے۔

شاہ راجو۔ اس عہد کے ایک با اثر مرشد اور صوفی تھے۔ ان کو تصوف و عرفان کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دخل تھا اور شعر و شاعری میں بھی ان کی مختلف نظمیں اور مرثیے بیاضوں میں ملتے ہیں۔ اس عہد کے خواص و عوام کی طرح بعض شاعر بھی ان کے مرید و معتقد تھے جن میں طبعیؔ اور عابدؔ قابل ذکر ہیں۔

عابد نے تصوف و عرفان کے موضوعوں پر مختلف نظمیں لکھی تھیں۔ ان کو شاہ راجو نے عابد شاہ کا لقب عطا کیا تھا انھوں نے اپنی ایک مثنوی گلزار السالکین کے دیباچہ میں اپنے مرشد کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

مرا پیر مجھ تن کوں بتلا دیا
اسی تن میں احمد کوں دکھلا دیا
اسی نور کوں سے بھرا تن منے
تو پایا خدا تن کے گلشن منے

---

[1] حال کی تحقیق کے مطابق سلطان کا تعلق دبستان بیجاپور سے ہے (دیکھئے "دکنی غزل کی نشو و نما" مقالہ از محمد علی اثر (قلمی)

الہٰی بحق شفیع الامم

تو رکھ شاہ راجو پہ اپنا کرم

الہٰی بحق وصی مصطفےٰ

تو رکھ تندرست انکے تنیئں تا بقا

الہٰی بحق حسین و حسن!

تو رکھ ان کو آفات سے نت جتن

اس مثنوی کے علاوہ عابد شاہ نے خواجہ بندہ نواز کی فارسی کتاب معالجات بندہ نواز کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

میراں جی حسن خداوند خدا نما بھی حیدرآباد میں تصوف اور شعر و ادب کے رسیا گذرے ہیں۔ ان دونوں میں فرق اتنا تھا کہ شاہ راجو دین کے ساتھ دنیا کو بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ اور میراں جی خدانما دنیا کو چھوڑ کر یعنی عبداللہ قطب شاہ کی ملازمت ترک کرکے دین کی طرف راغب ہوئے تھے انہوں نے کئی اردو رسالے اور نظمیں لکھیں۔ رسالہ وجودیہ شرح تمہیدات عین القضات اور شرح مرغوب القلوب ان کی وہ اردو نثر کی کتابیں ہیں جو اب تک محفوظ ہیں[1]۔

عورتوں کو چکی پیسنے وقت گانے کے لئے انہوں نے ایک چکی نامہ بھی لکھ دیا تھا۔ جو بہت مقبول ہوا اور حیدرآباد کے بعض گھرانوں کی عورتیں اب تک اسکو گاتی ہیں۔ اس کا ایک بند یہ ہے ؎

اول اللہ ناؤں صفت حق کا مٹھا وں

یاد ہے میرے جی میں ہر دم تیرا ناؤں

---

[1] ۔ چند سال قبل ڈاکٹر حفیظ قتیل نے "میراں جی خدانما" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ (محمد علی اثر)

لاالہٰ کہنا الا اللہ میں رہنا!

نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

اللہ آپی گنج خفی ظاہر ہونے آیا

نبی صاحب کے برقعے میں آپس کوں دکھلایا

لاالہٰ کہنا الا اللہ میں رہنا

نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

ان ہی خداوند خدا نما کے ایک شاعر مرید شاہ فاروقی نے چکی نامہ کی طرز پر ایک اور نظم عورتوں کے لئے لکھی تھی جو غالباً چلے کے وقت یا کسی اور تقریب میں گائی جاتی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے پیر کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

خداوند شاہ دیں قدرت نیاہم میں ندرت پیر ملے رسول حضرت دیکھ سلطان سبحان

ہمیں ناؤں پر ہیں قربان

فکر کر فاروقی لیائے سب گنیاں پائے شاہ کا جلوہ دل دل سمائے سلطان سبحان

ہمیں ناؤں پر ہیں قربان

میراں جی خدا نما کے ایک اور مرید میراں یعقوب بھی اردو کے بہت اچھے ادیب تھے انہوں نے سنہ ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء میں برہان الدین اولیاء برہان الدین اولیاء اورنگ آبادی کی کتاب شمائل الاتقیا کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ انہوں نے اس میں اپنے مرشد کا ذکر اس طرح کیا ہے اس سے اس کے اسلوب کا اندازہ ہو سکے گا۔

" موحداں کے پیشوا۔ مریداں کے دستگیر۔ طالباں کے رہنما۔ بوجھنہارے علم لدنی کے۔ سوجھنہارے حقیقتاں دین و دنیا کے۔ پیر پیراں سید میراں حسینی قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں پایا۔ ہور باطن کے عالم تھے

ترتیب

تعارف

پروفیسر غلام عمر خاں — ۷
صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

ادب

پیش لفظ — ۱۰

۱۔ دلبستان گولکنڈہ کا سماجی اور ادبی پس منظر
ڈاکٹر محمد علی آثر — ۱۲

۲۔ دلبستان گولکنڈہ میں شعر و ادب کا نشو و نما
ڈاکٹر زور — ۲۳

۳۔ کلاسیکی دکنی شاعری ۔ خصوصیات و رحجانات
پروفیسر غلام عمر خاں — ۵۱

۴۔ گولکنڈہ کی مثنویاں
پروفیسر سروری — ۶۱

۵۔ قطب شاہی دور میں اردو ادب
نصیر الدین ہاشمی — ۷۲

۶۔ وجہی ۔ قطب شاہی عہد کا ایک باکمال شاعر و ادیب
ڈاکٹر جمیل جالبی — ۸۱

۷۔ غواصی ۔ دلبستان گولکنڈہ کا ایک عظیم سخنور
ڈاکٹر محمد علی اثر — ۱۰۸

۸۔ محمد قلی کی شاعری
ڈاکٹر زور — ۱۱۵

۹۔ اردو غزل قطب شاہی عہد میں
ڈاکٹر محمد علی اثر — ۱۱۹

۱۰۔ دکنی رباعیاں ۔ قطب شاہی عہد میں
ڈاکٹر جمال شریف — ۱۴۲

۱۱۔ قطب شاہی دربار میں ایرانی شعراء
محمد اکبر الدین صدیقی — ۱۵۲

۱۲۔ قطب شاہی عہد میں تلگو کی سرپرستی
جمال کنڑ یوی — ۱۵۷

> ظاہر کے عالم میں پایا۔ ہمیشہ ان کی عنایت کی نظر سوں پرورش پاتا
> تھا۔ ہور دن دن اس شعور ہور اس ہوش میں آتا تھا۔ جب بلوغت
> میں آکر دست بیعت نعمت پایا۔ تب ارشاد و تلقین کی لذت
> سوں اگھایا۔ شریعت طریقت کے رنگ رنگ کے مزے چکھے ہور معرفت
> وحقیقت کے منس منس کے تماشے دکھائے۔

میراں جی اور شاہ راجو دونوں قطب شاہی حیدرآباد کے دوئم آخر کی بہت بڑی شخصیتیں تھیں۔ ان دونوں کے عالیشان گنبد اب تک حیدرآباد میں موجود ہیں۔

ج ۔ دورِ انتشار ۱۶۷۲ سے ۱۶۸۷ء

عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانہ میں اورنگ زیب کے حملہ کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت میں انتشار پیدا ہو چکا تھا اورنگ زیب سے سنہ ۱۶۶۶ء میں جو صلح ہوئی وہ صلح نہ تھی بلکہ قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ چنانچہ اس تاریخ سے عبداللہ نے اپنی ایک نئی مہر "ختم بالخیر والسعادۃ" بنائی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ سلطنت کا خاتمہ خیر و خوبی سے ہوگیا۔ اورنگ زیب کا سفیر ہر معاملہ میں دخل دیا کرتا اور قطب شاہیوں کی آزادی اور سربلندی اور وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی جوت دبیا کی ختم ہوگئی اور وہ زیادہ تر مذہبی تصنیف و تالیف اور مرثیہ نگاری کی طرف مائل ہوگئے۔

ایک ایسے ذہنی انتشار کے دور میں عبداللہ کا انتقال ہوا اور اس کے داماد ابوالحسن نے جرأت کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ابوالحسن بھی شاہ راجو کا ایک مرید تھا جن کو انہوں نے حسب عادت تمام مریدوں کی طرح خطاب تاناشاہ اس وقت عطا کیا تھا جبکہ وہ پریشان حال اور غریب تھا اور ان کی خدمت گزاری میں مصروف۔ یہ خطاب اتنا مشہور اور مقبول ہوا کہ جب ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں ابوالحسن اپنے خسر عبداللہ قطب شاہ کی وفات پر قسمت کی یاوری سے ابوالحسن قطب شاہ کے لقب سے حیدرآباد کا بادشاہ بنا اور پندرہ سال تک بڑے تزک

و اہتمام کے ساتھ بادشاہ رہا۔ اہل حیدرآباد نے اس کو تانا شاہی کے نام سے یاد کیا اور آج بھی یہ نام اردو زبان میں ضدی اور عیاش اور نازک دماغ اور ظالم غرض مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ابوالحسن کی یاد خواہ بری طرح ہی سہی کیوں نہ ہو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ بدقسمت اور بدنام ابوالحسن دراصل اس پروپگنڈہ کا شکار ہے جو اس کی سلطنت چھیننے کے لئے اس کے مخالفوں نے پھیلا رکھا تھا۔ جہاں تک علم و ادب اور شعر و سخن کا تعلق ہے وہ اپنے پیشرو بادشاہوں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔ اور جس طرح سلطان عبداللہ نے ملا عبدالحکیم کی تاریخ قطب شاہی کا تکملہ حدیقۃ السلاطین ملا نظام الدین احمد سے لکھوایا تھا۔ ابوالحسن نے مؤخرالذکر کا تکملہ حدائق السلاطین علی ابن طیفور سے لکھوایا اس تاریخ کے دیباچہ میں علی ابن طیفور نے ابوالحسن کے عمدہ خصائل تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ تانا شاہ نے علی ابن طیفور کے علاوہ متعدد فارسی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی اور خود وہ اردو کا بہت اچھا شاعر تھا۔ اگرچہ انتزاع سلطنت کی وجہ سے اس کا دیوان محفوظ نہ رہا تاہم تذکروں میں اس کے اشعار محفوظ رہ گئے۔ اس کی ایک غزل اور نظم درج ذیل ہے جس سے معلوم ہوگا کہ اس کے یہاں زبان کی روانی کے علاوہ تخیل کی رعنائی بھی موجود ہے۔

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کر مری انجمن میں آ

کب لگ رہے گا جیوں لب تصویر بے سخن
اے شوخ خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ

چاہتا ہوں وصف قد میں کروں مگر شعر کی
اے معنیٔ بلند شتاب ہوں من میں آ

اے جان بوالحسن توں اچھے خوش لنک سنتے
بند قبا کوں کھول کے ہمن چمن میں آ

نظم

تجھ مکھ کوں کوئی چندر کہتے کوئی سورتیں انور کہتے
کوئی حسن کا بندر کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

تجھ لب کوں کوئی شکر کہتے کوئی شہد سوں بر تر کہتے
کوئی خضر جیاں پردر کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

کوئی جیو کی پیاری کہتے کوئی سوں اچھوں ناری کہتے
نیاریاں میں کوئی نیاری کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

تجھ چک کوں کوئی کنجن کہتے کوئی ساحر پرفن کہتے
کوئی عقدہ الجھن کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

جوبن کوں تجھ کوئی گنج کہتے یاد سنیاں سچ کہتے
یاد بھرے ہیچ کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

ابوالحسن تاناشاہ کا ایک پیر بھائی طبعی بھی اس دور کا ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اس نے سنہ ۱۰۸۱ھ/ ۱۶۷۰ء میں ایک کتاب "بہرام و گل اندام" لکھی تھی۔ اس وقت ابوالحسن بادشاہ نہیں تھا البتہ بادشاہ وقت کا چہیتا داماد تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم میں ابوالحسن کے بادشاہ کے بعد طبعی نے ابوالحسن کی مدح کے اشعار اضافہ کئے تھے۔ اس کے دیباچہ میں اپنے اور بادشاہ کے مرشد شاہ راجو کی تعریف میں متعدد بیتیں لکھی ہیں۔ یہاں اس "مدح شاہ راجو" کی چند ابیات درج کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ طبعی ابن نشاطی کے بعد حیدرآباد کا سب سے بڑا استاد سخن گذرا ہے اور اس نے ابن نشاطی کے نقش قدم پر چل کر بادشاہ کے دربار سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ حالانکہ وہ اس کا پیر بھائی بھی تھا۔ اور آسانی سے

ملک الشعرا بن سکتا تھا۔

ولی توں بڑا ہے لکر شاہ راجو
چل آیا ہے شہ تیرے گھر شاہ راجو

خبر تیری معلوم نئیں بے خبر کوں
خبر دار جلنے خبر شاہ راجو

توں مخدوم سید محمد کی کھن کا
بہت بدل ہے گہر شاہ راجو

کرامت ہوا سب کوں معلوم ظاہر
توں باطن میں کر یک نظر شاہ راجو

دکن کا کیا بادشاہ بوالحسن کوں
بڑا تخت دے کر چھتر شاہ راجو

ترے عشق کا چوٹ کھایا سو چڑھ کر
اتر نا نہیں ہے اثر شاہ راجو

خدا پاس اجابات کرتا ہے طبعی
دعا تج کوں شام سحر شاہ راجو

طبعی کی یہ مثنوی دکھنی اردو کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ زبان کی سلاست اور شاعرانہ نزاکتوں میں طبعی اپنے پیشرو اساتذہ وجہی، غواصی اور ابن نشاطی تینوں پر بھی سبقت لے گیا ہے۔ وجہی کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا۔ اور جب طبعی اپنی یہ مثنوی لکھ رہا تھا تو وجہی ایک رات اس کے خواب میں آیا اور پوری مثنوی سن کر کہانی بات پیدا کی ہے۔ طبعی کہتا ہے ؎

لگیا میں جو یو مثنوی بولنے
یو موتیاں نِخل ڈھال تیوں رو لنے
یو وجہی مرے خواب میں آئے کر
مکھ اپنا سورج نا وو دکھلانے کر
سراسر سنیا جو مری مثنوی
کہیا بات طبعی ہے تیری نوی
ہر خوش حال سن کر یو باتاں مرے
ایس کے ہاتاں میں ہاتاں مرے
بڑے پیار سوں اپنا دے یو مثل
سنیا سو پڑیا خواب سے میں اچھل

یعنی وجہی نے طبعی کو اپنا مثل یا ثانی قرار دیا ہے جو بالکل صحیح ہے کیونکہ جہاں ابن نشاطی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دلبستان غواصی کا پیرو اور جانشین تھا۔ طبعی صحیح معنوں میں جانشین وجہی سمجھا جاسکتا ہے۔

طبعی اور ابوالحسن تاناشاہ کے دور کے حیدرآبادی ہمعصروں میں امین، خواص سیوک اور افضل کی کتابیں مذہبی موضوعوں پر لکھی گئی ہیں اور اس وقت موجود ہیں ۱۰۹۰ھ/ ۱۶۷۹ء میں امین نے قصہ ابو شحمہ اور خواص نے قصۂ حسینی منظوم کیا تھا سیوک کا جنگ نامہ محمد حنیف سنہ ۱۰۹۲ھ /۱۶۸۱ء میں لکھا گیا اور شاہ افضل قادری نے محی الدین نامہ ۱۰۹۵ھ/ ۱۶۸۷ء میں یعنی اسی سال لکھا جس سال کہ اورنگ زیب نے حیدرآباد کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ یہ سب کتابیں ادبی اعتبار سے طبعی اور ابن نشاطی کے کارناموں کے معیار کو نہیں پہونچتیں۔ البتہ افضل قادری اس دور کا ایک اچھا بوڑھا شاعر ہے

جو دلستان وجہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے سلطان عبداللہؒ کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے تھے وہ خود کو غائباً غواصی کا مدمقابل سمجھا تھا۔ اس کے ایک قصیدے کے چند شعر یہ ہیں

مرا مکھ بھاگ لوچن لب تے پایا ہے موہن سندر
جلا سورج گلا چندر ستارہ جوت رنگ عنبر

نین گھائل ہے دل زخمی سو تن مجروح سینہ ریش
لو فذ برچھا فرنگ سو کا پلک کچھو ا بھتوان خنجر

سکی الی چتر سلطان عبد اللہ غازی سوں
کہ جگ آدھار جگ سنگار جگ جھلکار جگ پرور

دہادانی دہا گیانی دہا چاتر دہا جانی
بلند طالع بلند دانش بلند ہمت بلند اختر

دلبری ہور شجاعت کے پلے تعریف لکھنے کے
ملک کاتب فلک کاغذ قلم کہکشں بدل مسطر

تجھ ایسے شاہ کوں ہونا سو وجہی سار کا شاعر
بینٹ عاقل بینٹ کامل بینٹ گیانی بینٹ گنبھر

خدا ہور مصطفےٰ ہور مرتضیٰ ہور کل ولی رکھتے
ترے کوٹاں ترے شہر اں ترے قلعے ترے کشور

دکھن میں شعر تھا افضل وے ایسا نہ تھا حقا
یتا نرم یتا گرم یتا شیریں یتا دلبر

اسی دور میں ایک شاعر محب نے ایک مثنوی "معجزہ فاطمہ" لکھی جو ۱۰۷۷ھ

میں تکمیل کو پہونچی۔ اس شاعر نے بھی اپنی مثنوی کے آغاز میں اپنے بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ کی ایک ایسی مدح لکھی ہے جو اب تک کی پھیلائی ہوئی افواہوں کی تردید کرتی ہے کہ ابوالحسن تاناشاہ ایک عیاش اور نااہل بادشاہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہ افواہ خود حیدرآباد تک پہونچ چکی تھی۔ چنانچہ اس شاعر نے دشمنوں کی مخالفت کا ذکر کیا ہے یہ مثنوی ابوالحسن کی تخت نشینی کے پانچویں سال لکھی گئی تھی۔ چونکہ یہ مثنوی ابھی چھپی نہیں ہے اس لئے اس کے چند شعر بطور نمونہ درج ہیں۔

کہ اے نامور قطب شاہ بوالحسن
عطا تجھ کئے پیر تخت دکن

توں پیتے ستی یاد حق کی شراب
دندے کا ہے دل جل کے آگ پر کباب

تجھے پیر کا حق تے سایہ اہے
تو ہر کام میں فتح پایا اہے

تو ہے عدل میں آج نوشیروال
سکیں عدل تج تے سگل خرماں

سخاوت میں دیکھوں تو اے شہ تجے
توں حاتم تے افضل ہو دستا مجے

جو کوئی دند تج سوں کریں اختیار
تو وہ جوں ہے افراسیاب اکوں مار

لیے سر پو جن تیرے فرمان کوں
نوازے اسے توہی بھرمان سوں

سپاہی پیارے ترے مددار

کریں رنج سوں ہر ایک کار ہزار

تو کیوں نا ہوے زیر تیرے غنیم

جو اس دھات اچھے تیرے لشکر تے سیم

محمد حسینی دئے نج کوں راج

مبارک اچھو نج کوں یو تخت و تاج

اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب غلام علی خاں لطیف قزلباش کا "ظفر نامہ محمد حنیف" ہے یہ شاعر دراصل سپاہی پیشہ تھا۔ اور غالباً عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اب بوڑھا ہو کر خانہ نشین ہو چکا تھا۔ اسی بے کاری کے زمانے میں زوال سلطنت قطب شاہی سے صرف تین سال پیشتر سنہ ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں ایک بے مزہ سی مثنوی لکھی تھی۔ جس میں اس دور انتشار کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔ لطیف نے اس مثنوی میں اپنے خیالات اور سنہ تصنیف وغیرہ جس طرح درج کئے ہیں وہ ان کے چند اشعار سے ظاہر ہوں گے۔ اور ان سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ کوئی اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں تھا۔

کہ فی المجلہ کر بولتا ہوں عیاں

مرتب کیا ہوں کہاں سوں بیاں

تھا جب دور سلطان شہ ابوالحسن

شہر حیدرآباد ان کا وطن

کیا جب سفرنامہ کا میں بیاں

مرتب کئے لگ سونا چپ رہتا

سنہ یک ہزار و نود یا پنج پر
بنا کر مرتب کیا یو اچھے سر
قزلباش قرد نیلو کا زاد ہوں
و لے زادۂ حیدر آباد ہوں
ہوں سلطان عبد اللہ کے دور کا
شجاع اور سخا ہوں بڑے ملور کا

غلام علی اس عہد کا ایک اور شاعر تھا جس نے فارسی سے ترجمہ کرنے کے عام رواج کو چھوڑ کر ملک محمد جائسی کی ہندی نظم پدماوت کا سنہ ۱۰۹۱ھ میں اردو ترجمہ کیا غالباً اس جدت کا خیال خود ابوالحسن قطب شاہ کی تحریک پر پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ غلام علی اس بادشاہ کے مقربین میں تھا اور اس نے اپنی مثنوی میں اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے اگر چہ یہ مثنوی ہندی پدماوت کا ترجمہ ہے لیکن اس میں ہندی کے الفاظ کم نظر آتے ہیں غلام علی نے اپنے عہد کی فصیح اردو میں یہ کتاب مرتب کی ہے اور یہ محض ترجمہ نہیں ہے اس لئے اصل پدماوت میں جگہ جگہ اضافہ کیا ہے اور ہر واقعہ کے آخر میں اپنی طرف سے شعری نتیجے بھی نکالے ہیں وہ اپنے پورے نام غلام علی کو بطور تخلص استعمال کرتا تھا۔

ابوالحسن تاناشاہ کے آخر عہد میں فائز نے ایک مثنوی رضوان شاہ روح افزا کے نام سے حیدرآباد میں سنہ ۱۰۹۴ھ میں مرتب کی تھی۔ یہ اس دور کی آخری بڑی کتاب ہے شاہ قلی خاں شاہی حیدرآباد کا رہنے والا اور قطب شاہی لشکر کا ملازم تھا۔ رفتہ رفتہ ابوالحسن تاناشاہ کا مصاحب ہو گیا۔ وہ اس کی زمینوں میں غزلیں لکھا کرتا تھا یہ شعر جو شاہی

کی نظم کا ایک ٹکڑا سمجھا جاتا ہے بعض تذکروں میں اس نام سے درج ہے۔

ملنا متن کا غیر سوں کوئی جھوٹ کوئی سچ مچھ کہتے
کس کس کا موں موندوں سخن کوئی کچھ کہتے کوئی کہتے

جب حیدرآباد فتح ہوا تو یہ لاپتہ ہو گیا۔ لیکن اہل حیدرآباد اس کے کلام کے حافظ تھے۔ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے اس کو وردِ زبان کر لیا۔ اور بطور سوغات دور دور لے گئے۔ یہ اس دور کا بہترین مرثیہ گو بھی تھا۔ اس کے کئی مرثیے موجود ہیں

ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں جو شاعر باہر سے حیدرآباد آئے ان میں شجاع الدین نوری کا ذکر بھی ضروری ہے جو سادات گجرات سے تھا۔ یہ حیدرآباد میں سید مظفر وزیر تاناشاہ کے لڑکے کا اتالیق تھا۔ اس کی کوئی نظم تو نہیں ملی البتہ تذکرہ میر حسن وغیرہ میں ایک آدھ شعر اور بعض بیاضوں میں مرثیے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس وقت حیدرآباد میں کئی اور شاعر مثلاً قادر، مرزا، روحی وغیرہ بھی موجود تھے اور چونکہ یہ زوال و تباہی حیدرآباد کے بعد بھی اس کا ماتم کرنے کے لئے عرصہ تک زندہ رہے۔

کلچر

۱۳- گولکنڈہ کا تمدن
پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۱۶۹

۱۴- گولکنڈہ کا کلچر
پروفیسر ہارون خاں شروانی ۱۸۴

۱۵- قطب شاہی عہد کے چند بزرگان دین
پروفیسر سید محمد ۱۹۵

۱۶- قطب شاہی مسجدیں
غلام ربانی ۲۱۱

۱۷ محلات قطب شاہی
ڈاکٹر روز ۲۲۳

۱۸- قطب شاہوں کے عہد میں تشکیل شہری اور فن تعمیر
ضیاء الدین نظامی ۲۳۶

۱۹- صوفیائے گولکنڈہ
ڈاکٹر سلیمان صدیقی ۲۴۳

۲۰- گولکنڈہ کی خواتین
ڈاکٹر اشرف رفیع ۲۵۶

۲۱- قطب شاہی حور خیمن
نجمہ صدیقہ ۲۶۳

۲۲- قطب شاہی مقبرے
غلام ربانی ۲۷۲

۲۳- قلعہ گولکنڈہ
سید ضیاء الحق ۲۷۸

۲۴- قطب شاہی تہذیب کا اثر حیدرآباد کی موجودہ زندگی پر
ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب ۲۸۵

۲۵- قطب شاہی مہریں اور دستخط
سید مسعود احمد ۲۹۳

۲۶- قطب شاہی خاندان
پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۲۹۶

پروفیسر غلام عمر خاں

کلاسیکی دکنی شاعری

خصوصیات و رجحانات

قدیم دکنی شاعری کی نشو و نما کا زمانہ تقریباً چار صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے، دکنی شاعری کے اولین نمونے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ اور اٹھارویں صدی کے وسط تک، دکنی کے سرمایہ میں بلند پایہ شعرا کے کلام سے اضافہ ہوتا رہا۔ سترھویں صدی، دکنی شاعری کا سنہرا دور ہے جس نے محمد قلی، وجہی، غواصی، نصرتی اور ہاشمی جیسے شاعر اردو کو دیئے۔ کلاسیکی دکنی شاعری سے، میری مراد، بڑی حد تک سترھویں صدی کی دکنی شاعری ہے۔ انگریزی ادب کی معاصر تاریخ میں یہ شیکسپیر اور ڈرائیڈن کا عہد ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں دکنی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں، ان میں صوفی شعراء کی مثنویوں کے علاوہ "کدم راؤ اور پدم راؤ" اور اشرف بیابانی کی مثنوی "نوسرہار" قابل ذکر ہیں۔ شاعری کے ان نمونوں کو

اردو زبان کی تاریخ میں لسانی نقطہ نظر سے اہمیت حاصل ہے، ادبی اعتبار سے ان کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ لیکن سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے، دکنی ایک بولی کی حیثیت سے گزر کر مستقل ادبی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اور شاعری کے ایسے کارنامے اس عہد میں تخلیق ہوئے، جن پر اردو زبان، آج بھی بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ اگرچہ اردو کے عام قاری کے لئے، زبان کی قدامت، ان ادبی شہ پاروں کی تحسین کی راہ میں حائل ہے۔

کلاسیکی دکنی شاعری کی عام خصوصیات اور رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بعد کے دور کی اردو شاعری کے رجحانات اور میلانات پر بھی نگاہ رکھیں۔ میری مراد ۱۷۰۰ء کے بعد دہلی اور شمالی ہند میں نشوونما پانے والی اردو شاعری سے ہے۔ اس طرح ایک تقابلی نظر کے ذریعہ، ہم دکھنی شاعری کی قابلِ امتیاز خصوصیات کی نشاندہی کرسکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو شاعری کو بہ آسانی دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ قدیم دور جو دکنی کا دور ہے۔ پندرھویں اور سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے اور ۱۷۰۰ء کے کچھ بعد ختم ہو جاتا ہے دوسرا دور ۱۷۰۰ء سے شروع ہوتا ہے، جو ولی کے سفر دہلی کا زمانہ ہے، اور ۱۸۵۷ء کے بعد ختم ہو جاتا ہے

۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو شاعری، دو مختلف شعری روایات کے زیر اثر پروان چڑھتی رہی ہے ایک ہندستانی شاعری کی روایت ہے

اور دوسری فارسی شاعری کی روایت ۔ کلاسیکی دکنی شاعری پر ہندوستانی شاعری کی روایت کا اثر غالب ہے ۔ جبکہ ۱۷۰۰ عیسوی کے بعد دہلی اور پھر لکھنو میں نشو و نما پانے والی شاعری' بالکلیہ فارسی شاعری کی روایت کے تابع رہی ہے ۔ دکنی کے شعراء نے بھی فارسی شعر و ادب سے استفادہ کیا ہے ۔ شاعری کی ساری اصناف' غزل' قصیدہ' مثنوی' رباعی وغیرہ فارسی سے مستعار ہیں ۔ فارسی کی بحریں بے کم و کاست' دکنی میں قبول کر لی گئیں ۔ دکنی کی متعدد مثنویاں' فارسی کی مثنویوں کے خاکوں پر مبنی ہیں لیکن جہاں تک شاعری کی روح' اور اس کے مواد کی پیشکش کا تعلق ہے ۔ دکنی کے کلاسیکی شعرا بڑے صحت مند ادبی مذاق کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اپنی شعری تخلیقات میں وہ فارسی کورانہ تقلید کو کبھی روا نہیں رکھتے ۔ ان کے تخلیقی رویہ میں بڑی خود اعتمادی' اور آزادہ روی کی شان نظر آتی ہے ۔ فارسی شاعری میں امرد پرستی کی روایات کے زیر اثر محبوب کو ہمیشہ مذکر تصور کیا جاتا ہے اسی روایت کے اتباع میں ۱۷۰۰ عیسوی کے بعد شمالی ہند میں نشو و نما پانے والی اردو شاعری میں بھی' محبوب کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا رہا ہے ۔ لیکن دکنی کے شعرا نے ابتدا ہی سے اس غیر حقیقی رجحان سے انحراف کیا ۔ دکنی شاعری میں' مرد کی مخاطبت صنف نازک سے ہوتی ہے ۔ یا پھر قدیم ہندوستانی روایت کے مطابق' اظہار محبت' عورت کی طرف سے ہو تو مخاطب مرد ہوتا ہے ۔ دکنی شاعری کے اولین نمونوں سے لے کر ولی کے ابتدائی دور کے کلام میں' ہر جگہ' محبوب کی صورت میں' ایک ہندوستانی عورت کا تصور ملتا ہے جس کے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش

کے دلچسپ مرقعے، ہر شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں۔۔۔ محمد قلی نے اپنی غزلوں میں ان بیسیوں حسیناؤں کے نام بھی گنائے ہیں، جو اس کے محل کی زینت تھیں۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مرتبہ کلیات محمد قلی میں ایک مستقل باب "بارہ پیاریاں" کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ جس میں محمد قلی کی وہ مسلسل غزلیں یکجا کردی گئیں ہیں، جن میں شاعر نے اپنی بارہ محبوب سکھیوں کے غمزہ وجمال کی داد دی ہے۔

کلاسیکی دکنی شاعری کی ایک بنیادی خصوصیت، حقیقت نگاری کا میلان ہے۔ شعرا اپنے مشاہدات، تاثرات اور جذبات کو بے جا تکلف اور تصنع کے بغیر، راست اور سادہ لیکن پُر زور اور موثر اسلوب میں پیش کرتے ہیں، پُر تکلف اسلوب سے گریز، اور فطرتِ انسانی کا موثر اظہار ہر زبان کے ابتدائی دور کے فن کاروں کا نمایاں وصف رہا ہے۔ انگریزی میں چاسر اور شیکسپیر بھی انھیں خصوصیات کے لیے ممتاز ہیں۔

حقیقت نگاری کے رجحان کا ایک پہلو یہ ہے کہ کلاسیکی دکنی کے فن کار، اپنی شاعری کا مواد اطراف و اکناف کی زندگی، مقامی ماحول، اور مقامی روایات سے حاصل کرتے ہیں وہ سارا مواد جو ان کے جمالیاتی تجربہ کا جزو ہے۔ ان کی تخلیقات میں بڑی دیانت داری کے ساتھ منعکس ہوتا ہے محمد قلی کی غزلوں کا مطالعہ کیجیے تو ان میں آپ کو، کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے اور پپیہے کی پکار بھی۔ بادل کی گرج کے ساتھ مینڈک کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں، اور رات کو جھینگر کی آواز بھی۔ کہیں شاعر اپنی سکھیوں کے ساتھ بسنت کھیلتا نظر آتا ہے سکھیاں رنگ کی پچکاریوں میں شرابور ہوگئیں ہیں۔

محل کے در و دیوار رنگین ہو گئے ہیں، بلکہ سارا ترلوک رنگین نظر آتا ہے۔ کدم کی خوشبو سے فضا معطر ہے، کہیں عود اور برمکی کی لپٹیں آ رہی ہیں، اور عبیر و گلال کی بارش ہو رہی ہے، کہیں پھولوں پر بھونرے منڈلا رہے ہیں، اور شاہزادہ اس کی سکھی، ہاتھ میں ہاتھ دیے گلے میں پھولوں کی مالا پہنے، سر دین میں گھوم رہے ہیں۔

پپیہا گاڈتا ہے میٹھے بینا ں
مدھر رس دے، ادھر پھل کا پیالا
گروج بادل تھمے، دادر گیت گاوے
کویل کوکے سو پھل بن کے خیالا
پیاری ہور پیا، من میں سوہت سے
تمر دین میں نڈھیں، گل پھول مالا

شادیاں منگل مناؤ، خوشیاں کدم کھاؤ
چو دھیر عبیر عبیر ھیلاؤ، دھند کار برمکی کا

بسنت کے پھول کھلے ہیں بات رنگیلے
ہموہ حیران دیکھ اس تاہیں مانی
کنستی کے جھولے پہنتے ہیں اد کھدیر
کہ جیوں پھل پر ڈے بھونرا سو گیانی

کوہک کویل بسنت کے راگ گائی
کہ پائی ہے، ای رُت میں سُکھ نشانی

بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں
کہ اسمان رنگ شفق پایا ہے سارا
جوبن کے حوض خانے رنگ مدن بھر
سورو ما ادم چڑ کیاں لاسے دھارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ
رنگیلا ہو رہیا ترلوک سارا

یہ ہے محمد قلی کا تغزل —— اردو کا ایک عام طالب علم جو دہلی اور لکھنو کی شاعری کی فضاء میں سانس لینے کا عادی ہے جب قدیم زبان کی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے محمد قلی، غواصی یا وجہی کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو یہاں اسے اپنائیت اور یگانگت کا خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ گویا وہ کسی اجنبی ماحول سے، اپنے وطن میں واپس لوٹ آیا ہو۔ یہ احساس بالکل فطری ہے، کیونکہ یہاں قاری کو اپنے جمالیاتی مشاہدات کا حقیقی عکس نظر آتا ہے۔

شعرائے دہلی نے ولی کی تقلید میں فارسی کی بجائے، اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا، تو کچھ عرصہ تک زبان واسلوب میں وہ دکن کے شاعروں کی پیروی کرتے رہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں، دہلی کی اُردو بولی، شعرائے دہلی کے

الفاظ میں "گنوارو" زبان تھی' اور دکنی' ایک ترقی یافتہ ادبی زبان
لیکن کچھ عرصہ بعد' مرزا مظہر کی سرکردگی میں جو لسانی مہم شروع ہوئی' اس
کے نتیجہ کے طور پر' زبان میں' ہندستانی اصل کے سینکڑوں الفاظ کو'
جن سے دکنی عبارت بنی تھی' متروک قرار دیا گیا۔ اور اردو میں فارسی اور
عربی الفاظ کا بے ہنگم داخلہ شروع ہوا۔ اس تحریک نے اردو زبان کے
فطری ارتقا کو سخت نقصان پہنچایا۔ بات صرف فارسی اور عربی کے
الفاظ کے استعمال تک محدود نہیں رہی' تشبیہات' استعارات' تلمیحات
غرض فارسی شاعری کا تمام تر متخیلہ (IMAGERY) تدریجی طور پر
شعرائے اردو کی تخلیقی سرگرمیوں کا ماخذ بن گیا۔ جس رجحان کا آغاز
دہلی میں ہوا تھا' لکھنو میں پہونچ کر اس نے اور شدت اختیار کرلی۔ اس
رجحان کا نقطۂ عروج ہمیں غالب جیسے شعرا کے ہاں ملتا ہے' جن کی
صرف زبان ہی فارسی کے غیر معتدل اثر سے گراں بار نہیں' بلکہ ان کا تمام
تر فن' فارسی شاعری کے متخیلہ پر مبنی ہے بعض اوقات وہ' تلاش و
جستجو کے ساتھ' ایسا نایاب مواد اپنے اشعار میں پیش کرنے کی کوشش
کرتے ہیں' جو کسی کلاسیکی فارسی شاعر کے کلام میں' ان کی نظر سے گزرا
ہو' شاعر دل ہی دل میں' اپنی اس کاوش پر نازاں ہے۔ معاصرین اس قسم
کے اشعار پر "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کی پھبتی کستے ہیں۔ لیکن شاعر
کو ستائش کی تمنا ہے اور نہ صلے کی پروا!' وہ خوش ہے کہ "میری بات
سمجھنی محال ہے":

فارسی سے مغلوب ذہن کے تخلیقی رویہ کا تجزیہ دشوار نہیں

ہے۔ یہ شعرا رہتے بستے تو ہندوستان میں تھے، ان کے جمالیاتی تجربہ کا مواد "فطری طور پر ہندستانی زندگی" اور مقامی روایات پر مشتمل ہے۔ لیکن جب وہ شعر کہتے ہیں تو اپنے جمالیاتی تجربہ کی تعبیر، یا اس تجربہ کی ترسیل و ابلاغ کا عمل فارسی کے متخیلہ کے توسط سے انجام دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مقامی ماحول کے نظارہ کے لئے ایرانی شاعری کا چشمہ استعمال کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بھی فن کاری کا ایک نقطہ نظر ہے، لیکن اس محدود اور مفید نقطہ نظر نے اردو شاعری کے فطری اور صحت مند نشو و نما میں منفی رول انجام دیا ہے۔ صفِ اول کے شعرا کی تقلید میں، دوسرے اور تیسرے درجہ کے سینکڑوں شعرا نے غیر حقیقی اور بے جان شاعری کے دواوین کے انبار لگا دیئے۔ جنھیں جدید اردو شاعری کے علمبردار، حالی نے "دفترِ عفونت" اور "ناپاک دفتر" سے تعبیر کیا ہے۔

اردو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے جن ادوار سے گزرتی رہی ہے، ان ادوار کی زبان کا ریکارڈ، جہاں تک دکنی کے دور کا تعلق ہے اس عہد کی شاعری کے سرمایہ میں محفوظ ہے۔ لیکن دلی اور لکھنو کے دبستانوں کی شاعری، اپنے عہد کی حقیقی زبان، زندہ زبان کا احاطہ نہیں کرتی۔ شاعری میں اسی ذخیرہ الفاظ کا استعمال جائز تھا، جس کی نظیر فارسی کے اساتذہ کے کلام میں موجود ہو۔ مقامی پھول اور پرندے، دریا اور پہاڑ تاریخی اور افسانوی مواد کے حوالے ہماری شاعری میں اسی لئے بار نہیں پا سکے کیونکہ فارسی کے کلاسیکی شعراء کے ہاں ان کی

سند نہیں ملتی ـــــ اسی طرح ہماری سماجی زندگی کے بیسیوں پہلو ایسے ہیں جن کی ترجمانی شاعری بالخصوص غزل میں ناممکن تھی صرف نظیر اکبرآبادی یکہ و تنہا ایسا شاعر ہے جس نے اس روش کے خلاف بغاوت کی۔ اس نے اپنی شاعری کے دروازے اپنے عہد کی زندہ زبان کے لئے بند نہیں کئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نظیر کے کلیات میں ہمیں ایسے سینکڑوں الفاظ ملتے ہیں جن کا ریکارڈ معاصر اردو شعرا کے ہاں نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ اردو کی مروجہ لغات میں بھی یہ الفاظ بار نہیں پا سکے تھے۔

کلاسیکی دکنی شاعری کا کوئی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا، اگر غواصی کا ذکر اس میں شامل نہ ہو، جو دکنی کا عظیم ترین شاعر ہے۔ مثنوی نگاری اور غزل گوئی میں (اور یہی دو اصناف، دکنی میں مقبول تھیں) دکنی کا کوئی شاعر اس کے مرتبہ کو نہیں پہونچتا۔ غواصی کے کلام میں، دکنی زبان اور شاعرانہ فن کاری نئی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک صنف غزل کا تعلق ہے تغزل و سرمستی، جذبات کا سوز و گداز، زبان و بیان کی بے ساختگی اور لطافت اور شگفتگی اشعار کی نغمگی اور موسیقیت یہ وہ خصوصیات ہیں، جہاں غواصی، دور حاضر کے مقبول متغزلین حسرت اور جگر کے مقابلے میں بھی منفرد نظر آتا ہے۔ اس کی بعض غزلیں، جو علوے جذبات بلند آہنگی، کیف و مستی سرخوشی و سرشاری اور شعور ذات کی رفیع جمالیاتی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں، حافظ اور خسرو کی اسی رنگ و آہنگ کی غزلوں کی ہم پایہ ہیں

بہ حیثیت مجموعی، اردو شاعری کے نشو و نما پر نگاہ ڈالی جائے

تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی سے سترھویں صدی کے آواخر تک اردو شاعری حقیقت نگاری، سادگی اور زور واثر کی خصوصیات سے متصف، صحت مند خطوط پر نشوونما پا رہی تھی، دلی میں مرزا جان جاناں مظہر کی تحریک کے بعد اس کی سمت میں انحراف پیدا ہوا۔ اور وہ اپنی قدیم شاہراہ سے مڑ کر ایک دوسری ڈگر پر چل نکلی۔ اور ۱۸۵۷ء تک فارسی شاعری کی غیر معتدل اور کورانہ تقلید میں ایک مخصوص سمت میں آگے بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے بعد، مغربی علوم وفنون کی لہرنے سرسید اور حالی کی تحریک کی صورت میں اس کے غیر فطری نشوونما پر روک لگادی۔ اور اردو شاعری کا دھارا، پھر اپنا رخ بدل کر اسی سمت میں بہنے لگا، جو کلاسیکی دکنی شاعری کی سمت تھی۔ یعنی حقیقت نگاری، سادگی اور زور واثر کے رجحانات۔

تعارف

اردو زبان کی تاریخ میں دبستانِ گول کنڈہ اور دبستانِ بیجاپور کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو بعد کے زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کو حاصل ہوئی۔ اردو کی نشو و نما کے ابتدائی مراحل میں گول کنڈہ اور بیجاپور کے عوام، اہل علم، حکمرانوں اور صوفیوں میں عوامی رابطہ کی اس زبان کو فطری ارتقا کے مواقع میسر ہوئے، اور دو سو برس کے عرصہ میں، اردو ادبی اور علمی زبان کے مرتبہ کی حامل ہو گئی۔ اس دوران میں وجہی اور غواصی، نصرتی اور ہاشمی جیسے شاعر اور ادیب ہی پیدا نہیں ہوئے، بلکہ طب، موسیقی، بیطاری اور جنسیات جیسے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ شعر و ادب کے مجموعوں اور علوم و فنون کی ان کتابوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، جو مخطوطات کی صورت میں ذیلی برّاعظم ہند اور یورپ کے کتب خانوں میں بکھری پڑی ہیں، اور ہنوز محققین کی توجہ کی محتاج ہیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی کا یہ سارا علمی اور ادبی سرمایہ اس مخصوص کلچر کی دین تھی، جس کی بنیاد، دکن میں بہمنی عہد میں رکھی گئی، اور جس کا تسلسل اور ارتقاء قطب شاہی اور عادل شاہی عہد میں جاری رہا۔ سولھویں صدی کے اواخر میں اکبر اعظم نے سرزمین ہند میں ایک ملے جلے کلچر کو فروغ دینے کی

پروفیسر عبدالقادر سروری

گولکنڈہ کی مثنویاں

محمد قلی غالباً پہلا اردو شاعر ہے جس کی غزلوں کا دیوان دستیاب ہو سکا ہے اس ضخیم کلیات میں مختلف اور گوناگوں موضوعات پر نظمیں موجود ہیں۔ لیکن اس نے نظم کا کام بھی مثنوی کے بجائے قصیدے یا غزل کی صنف سے لیا ہے۔ حمد، نعت، مذہبی تقریبوں محلات کی تعریف، نوروز اور بسنت وغیرہ پر اس کی کئی کئی نظمیں ہیں۔ جو غزل اور قصیدے کے قافیہ کی ترتیب میں لکھی گئی ہیں

محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کا پایہ قدیم ادب میں نہایت بلند ہے وہ بے مثل شاعر اور انشا پرداز تھا "سب رس" جو اس کی انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ غالباً اردو کی سب سے پہلی ٹھیٹ ادبی تصنیف ہے۔

انشاپردازی میں وجہی کا ایک خاص اسلوب تھا، جس میں لفظی صنعتوں اور معنوی خوبیوں کو نہایت عمدگی سے سمویا گیا ہے۔ وہ پے در پے مقفیٰ اور مسجع جملے لکھتا چلا جاتا ہے، لیکن عبارت کی روانی میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ اس کے کئی جملے ایجاز خیال اور نزاکت اظہار کے لحاظ سے ضرب المثل کی اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں صرف محمد حسین آزاد کا اسلوب وجہی کے اسلوب سے مناسبت رکھتا ہے۔

اس قابل قدر کارنامہ کو مولوی عبدالحق نے نہایت عالمانہ مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا تھا، لیکن اب اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں اور یہ کارنامہ تقریباً ساری یونی ورسیٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔

وجہی کی انشا پردازی کی طرح اس کی شاعرانہ قابلیت بھی بے مثل تھی۔ اس کی مثنوی "قطب مشتری" محمد قلی کے زمانہ شہزادگی کے عشق کی داستان مانی گئی ہے۔ اس مثنوی کے نسخے کمیاب تھے لیکن مولوی عبدالحق مرحوم نے اسے انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کر کے، اب سارے طالبان ادب تک پہنچا دیا ہے۔ ڈاکٹر نور اس کے مصنف کے بارے میں اپنی تصنیف "اردو شہ پارے" میں رقمطراز ہیں۔ وجہی کئی باتوں کے لحاظ سے دکھن کا ایک واحد ادیب ہے اس کا موضوع خود اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے اور شاعروں کی طرح دوسروں سے مضمون اخذ نہیں کیا۔

میر تقی میر کی طرح وجہی بھی بہت نازک مزاج تھا۔ چنانچہ نوجوان شاعروں پر اس نے "قطب مشتری" میں جا بجا چوٹیں کی ہیں۔ نوعمر شعرا جو وجہی کا ہدف رہے ہیں ان میں غواصی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ "قطب مشتری" کے کردار "سب رس" کی طرح مثالیہ ہیں اور ان میں اجرام سماوی کے سارے نام "قطب" کی رعایت سے لائے گئے ہیں ذیل میں قطب مشتری سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ اس سے وجہی کی قادر کلامی کے علاوہ شعر کے متعلق اس کا بلند معیار بھی ظاہر ہوتا ہے۔

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات — کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس ۲۵ — بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیری بات میں — پڑیا جائے کیوں جز لگر ہات میں

جسے بات کے ربط کا نام نیں — اسے شعر کہنے سوں کچھ کام نیں
نکو کرتو لئی بو لنے کا ہوس — اگر خوب بولے تو یک بیت بس
اسی لفظ کوں شعر میں لیائے توں (زیادہ) — کہ لیایا ہے استاد جس لفظ کوں
اگر فام ہے شعر کا تج کوں چھند — چنے لفظ لیا ہور معنے بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور ہے — دلے سبھی مزا بات کا اور ہے
اگر خوب محبوب جیوں سور ہے — سنوارے تو نورٌ علیٰ نور ہے
اگر لاکھ عیباں اچھے نار میں — ہنر ہود سے خوب سنگار میں
ہنر مشکل اس شعر میں بوج ہے — کہ تھوڑے اچھیں حرف معنی سو کئے
دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کہ — کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار کر
کہاں بات وہ چنچل ہور چلبلی — کہ دل کوں تو خواں سوں کرے گد گلی
سخن گو وہ ہے جس کی گفتار تھے — اچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے
نکر بول مضمون تو ہور کا — کہ کا لا ہے دو جگ میں موں چور کا
چتیا چوری کر چورا پے ساد ہوئے (دوسرے) (چھپا) — دغاباز اچکے کوں مانے نہ کوے
چھپا کر چرانا نہ کے چور کئی — یو باتاں سمجھتے سو ہیں ہو رگئی

محمد قلی کے عہد کی دوسری اہم مثنوی "لیلیٰ مجنوں" ہے جس کا مصنف محمد قلی کے زمانہ کا ایک شاعر احمد ہے۔ عرب کے اس عاشق و معشوق کی غیر فانی داستان محبت سینکڑوں دفعہ دہرائی جاچکی ہے لیکن اس قصۂ کہن کا لطف کبھی کم ہونے نہیں پاتا۔ اور ہر زمانے کے شعراء اس کو نئے نئے انداز سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ احمد کی "لیلیٰ مجنوں" کے مخطوطے کمیاب ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے پاس اس کا ایک نامکمل مخطوطہ موجود تھا جس سے کچھ اقتباسات موصوف نے "پنجاب میں اردو" میں

دیئے ہیں۔ ذیل کے اشعار "پنجاب میں اردو" سے نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ حصہ سبب تالیف سے متعلق ہے۔

جو منج بخت کو فتح یاور ہوا | سو منج بخت کا بیوک ابر ہوا
جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر | منجے غم کی بندگی تھے آزاد کر
دیتے امر عالی کے یہ باغ لاوں | جو پانوں اسے شہ امریت ناٹوں
جو حکم شہ کا امر سر پر لیتا | ترت باغ لانے شتابی کیتا
بہو تیک پریشانی روزگار | اگرچہ منجے ہے علالت سو بار
بہو تیک شغلاں سیتی رات دن | نہ تھی منج فرصت بجلا یک بن
دے آس دھر شہ کے فرمان پر | لگیا تن سنگارن بہو قصہ دھر
دھریا عشق کی باس اس کے بن پھول | جو اس باس پر جوں بھنورجگ کو بھول
سو کچ عشق کوں اب جگت میں جگاؤں | جو گھر گھر تے لیلیٰ و مجنوں اجاؤں
جو لیلیٰ و مجنوں تھے بولوں پران | سو تازہ کروں اب انو کھا پران

حافظ محمود شیرانی نے احمد کے معاصر ایک اور شاعر عاجز کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" جو سنہ ۱۹۲۶ء کی تصنیف ہے اب دستیاب ہو گئی ہے اور ڈاکٹر غلام عمر خاں استاد اردو جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ اسے مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کے ساتھ مکتب میں پڑھنے کی تفصیل اس مثنوی سے ذیل میں درج کی جاتی ہے

کئے مشورت دو یکیلے ہو کر | دیکھے ایک کو ایک باہم دگر
لئے دل یکس کا سو یک بات میں | اچھیں ایک ہر ایک کی بات میں
نظر لوح پر نا اچھے ایک تِل | یکس کوں دیکھے ایک ہو دل بدل

دو تختی سو لیلیٰ کے مکھ کی کرے ‏ دنوں والقلم ابرواں دیکھ پڑے

کھڑے مل سو دونوں الف لام میم ‏ ہوئے مبتلا نت الم سوں ندیم

نہ سمجھے الف قیس کوں قد بغیر ‏ نہ لیلیٰ دراں کس سوں کھیلے دگر

محمد قطب شاہ کے دربار کی ادبی چہل پہل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کے عہد کے بہت کم کارنامے دستیاب ہوتے ہیں۔ صرف ایک شاعر حسن شوقی کا ذکر "اردو شہ پارے" کے مصنف نے کیا ہے "پھول بن" کا مصنف ابن نشاطی اپنے پیش رو اساتذہ کے ذکر میں حسن شوقی کا بھی نام لیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شوقی بلند پایہ شاعر تھا چنانچہ اس کی دو مثنویاں قابل ذکر ہیں۔ ان سے اس کی طبیعت کی جدت اور قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ پہلی مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" میں اس نے اپنے عہد کی اس تاریخی جنگ کے حالات شاعرانہ انداز سے بیان کئے ہیں۔ جو بیجانگر کے راجہ رام راج اور دکن کے دوسرے مسلمان حکمرانوں کے درمیان ہوئی تھی۔ دوسری مثنوی "میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" کا موضوع بھی ایک تاریخی واقعہ ہے۔ محمد عادل شاہ کی شادی اس کے وزیر مصطفیٰ خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ شوقی نے اس شادی کی تفصیل لکھی ہے اور واقعات کو نظم کرتے ہوئے اس زمانے کی رسم و رواج اور معاشرت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس عہد کے اختتام سے پہلے ایک اور شاعر کا ذکر ضروری ہے جس کا تعلق اس میں شک نہیں کہ گولکنڈہ سے نہیں تھا۔ تاہم اس نے اپنی نظم اسی زمانے میں لکھی یہ محمد افضل ہیں جن کی "بکٹ کہانی" مشہور ہے۔ قدیم اردو شاعری کا نشوونما زیادہ تر دکن میں ہوا۔ اس لئے بعض تذکرہ نگاروں نے افضل کو بھی دکنی سمجھا۔ لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ پانی پت کا رہنے والا تھا۔ اس لحاظ سے غالباً یہ اس زمانے کا واحد

شاعر ہے جس کا دکن سے تعلق نہیں ہے۔ "بکٹ کہانی" کوئی بسیط کہانی نہیں بلکہ "بارہ ماسہ" ہے جس میں ایک فراق زدہ عورت سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر مہینے میں اپنے برہ کا دکھڑا اثر انداز پیرایہ میں بیان کرتی ہے۔ یہ نظم بھی مثنوی کی شکل میں ہے اور اب اسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے مرتب کرکے شایع کردیا ہے۔ بقول شیرانی اس نظم میں فارسی بندشیں جا و بے جا باندھی گئی ہیں۔ ایک مصرعے کی بندش آدھی فارسی میں ہے آدھی ہندی میں حتیٰ کہ افعال وضمائر فارسی سے بھی بے تکلف کام لیا گیا ہے اور فارسی سے جا و بے جا مدد لینے کی ضرورت اس کا ثبوت ہے کہ شمال میں اردو میں مربوط نگاری ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ دکن میں اردو زبان دراصل اس وسعت کے ساتھ مختلف موضوعات کے لئے استعمال کی جاتی رہی تھی کہ لکھنے والوں کو ایک طرح کی مہارت حاصل ہوگئی تھی اور انھیں خواہ مخواہ فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

"بکٹ کہانی" کا ایک اقتباس ذیل میں منقول ہے۔

سنوں سکھیو بکٹ میری کہانی	بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا	برہوں کی آگ سے سینہ جراتا
بتاتی لوگ مجھ بوری (بادلی) کہیں ری	خردگم کردہ مجنوں کہیں ری
نہیں اس دور کا دارو کسی کن	بچھے حیراں سبھی حکماء ذو فن
اری جس شخص کوں یہ دیولا گا	سیاناں دیکھ اس کوں دور بھاگا
اری یہ ناگ جس کوں ڈنگ لاوے	نیا دے کا درد جیورا کو آوے
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے	کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

دہی جانے کے حس کے تن لگی ہے ۔ برہوں کی آگ تن من میں دکی ہے
بوائیکی نہیں جس شخص کوں پیر ۔ چہ داند درد دیگر را در بے پیر
پھٹی بوری باولی برہوں بیراگ سہتی ۔ جلے جیو رام رانت آگ سیتی
نہیں یک دم مجھے دن رین میں چین ۔ اندھیری ہو چلی روت میری تین

سلطان عبداللہ کے عہد کے شعراء میں غواصی اور ابن نشاطی دو نہایت بلندپایہ مثنوی نگار ہوئے جنھوں نے مثنوی کے فن کو خاطر خواہ ترقی دی محققین ان دونوں کے کارناموں کو اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے کمال کی وجہ سے انھیں نہ صرف اپنے زمانے کے بلکہ اردو زبان کے غیر فانی شعراء میں شمار کرتے ہیں ۔

غواصی کی ایک مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" کا ماخذ الف لیلہ کا مشہور قصہ ہے ۔ یہ دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ اسلوب کی سلاست، روانی اور شعری نزاکتوں کی بدولت یہ قدیم مثنویوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر ترقی یافتہ مثنوی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی تصنیف کا سنہ ۱۰۳۵ھ ہے یہ مثنوی اب مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی سرپرستی میں مولوی میر سعادت علی رضوی صاحب ایم اے (عثمانیہ) کی ترتیب اور تصحیح کے ساتھ شایع ہو چکی ہے ۔

غواصی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" سنسکرت کے مشہور حلقہ قصص "شکا سپ تتی" سے ماخوذ ہے ۔ لیکن غواصی کا ماخوذ فارسی ترجمے تھے ۔ یہ چار ہزار اشعار کی نہایت طول طویل مثنوی ہے جس کی تصنیف کا سنہ ۱۰۵۹ھ ہے

ذیل میں "سیف الملوک" سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو سبب تالیف سے متعلق ہے ۔

میرا گیان عجب شکرستان ہے
جو اس تے مٹھا سب ہندستان ہے

چنتے ہیں جو طوطی ہندستان کے
بھکاری ہیں منج شکرستان کے

شکر کھا میرے شکرستان تھے
مٹھے بول اٹھے ادا لیں گیان تھے

نزاکت کوں میں آپ لٹی خیال تھے
دکھایا ہوں باریک کر یال تھے

دیا تازگی شعر کی دھات کوں
سحر کو دکھایا ہر یک بات کوں

لطافت منے میں سخن سنج ہوں
دھرن ہار یک غیب کے گنج ہوں

جو ہیں ہم سے طبع آزمائی کروں
تو سیاریاں اُپر بیشوائی کروں

کہوں نازے مضموں یک تل منے
کہ بے حد اُبلتے ہیں منجہ دل منے

ہنر کی گڑی کا سو میں باگ ہوں
بچن کے اتم گنج کا ناگ ہوں

سکے کوں ملنے میرے طور میں
کہ رستم ہوں میں آج کے دور میں

میری جیب اک کھرگ ہے آپ دار
سدا تیز پانی دھرے بے شمار

زبانی
عطارد سو گلک ہے مجھ بات کا
دوات ہے سو میرا چندر رات کا

گگن ساتوں دفتر میرے شعر کے
تارے سو جوہر میرے شعر کے

جو کچھ تشبیہاں خوب معقول ہیں
میرے خیال کے بن کے وہ پھول ہیں

میری طبع کا جھاڑ جم لاوے بار
کھلے پھول تس کوں ہزاراں ہزار

"مینا ستونتی" غواصی کی ایک دلچسپ مثنوی ہے، جسے ڈاکٹر غلام عمر خان استاد اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے بڑے سلیقے سے مرتب کرکے شایع کیا ہے۔

غواصی کے کارناموں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ عہد آفریں ثابت ہوئے۔ ان کی بدولت قدیم مثنوی نگاروں کے سامنے مثنوی کا ایک بلند معیار قائم ہوگیا جو فارسی کی ترقی یافتہ مثنوی کے تمام فنی نکات اور مخصوص ہندستانی ذہانت کا مجموعہ تھا

غواصی کی شہرت اس کی زندگی ہی میں دور دور تک پھیل گئی تھی ۔ چنانچہ بیجا پور کا مشہور شاعر مقیمی اپنے آپ کو اس کا خوشہ چیں بتلاتا ہے ۔ اور مقیمی بیجا پور میں ترقی یافتہ مثنوی نگاروں کا پیش رو ہے ۔ چنانچہ اس کے معاصرین میں امین خود کو مقیمی کا شاگرد سمجھتا تھا ۔ اردو کے قدیم ترین تذکرہ نگار بھی جو بہت سے قدیم شعراء کے حالات سے ناواقف تھے ، غواصی کی شہرت سے روشناس ہو چکے تھے ۔

مثنوی کے فن کو ترقی دینے میں غواصی کا معاصر ابن نشاطی بھی اس کے دوش بدوش تھا ۔ گو اس کو وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی جو غواصی کو نصیب تھی ۔ انھیں دونوں کی کوششوں سے اردو مثنوی فارسی کی مد مقابل بن گئی اور متاخرین نے انھیں کو اپنا نمونہ بنایا ۔

ابن نشاطی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں ۔ لیکن اس قدر پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا مستند انشا پرداز اور شاعر تھا ۔ اس کی شہرت کی بنیاد اس کی مشہور اور مقبول مثنوی "پھول بن" ہے جس کو اردوئے قدیم میں کلاسیکی مثنوی کا رتبہ حاصل ہو چکا ہے ۔ یہ ۱۰۶۶ھ کی تصنیف ہے ۔

"پھول بن" کا ماخذ ابن نشاطی نے ایک فارسی مثنوی "بساتین" بتایا ہے لیکن یہ محض ترجمہ یا تلخیص نہیں ہے ۔ بلکہ مصنف نے قصے کے خاکے کو اپنے زمانے اور ماحول کے چوکھٹے میں بٹھایا ہے چنانچہ اس کے اشخاص قصہ ، طرز معاشرت کے لحاظ سے اس کے عہد کے انسان ہیں ۔ مثنوی میں جگہ جگہ قطب شاہی سلاطین کے محلات اور باغوں سے جزئیات اخذ کیے گئے ہیں ۔ انداز بیان اور سلاست میں یہ غواصی کی مثنوی سے مختلف نہیں ہے ۔ "پھول بن" سنسکرت اور عربی کے قصوں مثلاً بید پائے کے حکایات اور "الف لیلہ" کے قصہ در قصہ کے اصول کی داستان کا عمدہ نمونہ ہے ۔ یہ مثنوی بھی

مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی جانب سے مرتب اوراق ہذا کی ترتیب کے ساتھ شایع ہو چکی ہے اور اس کا ایک اڈیشن انجمن ترقی اردو (کراچی) سے جناب شیخ چاند محمد نے اپنے مقدمہ اور ترتیب کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ذیل میں بلبل کے جال میں گرفتار ہونے کا واقعہ مثنوی سے اخذ کر کے درج کیا جاتا ہے ابتدا میں آسمان کی شکایت کی گئی ہے

فلک ایک دام ہے دانے سو تارے　　کہ کاماں دام کے ہیں اس میں سارے
فلک کے دام تے غافل نہ اچھنا (رہنا)　　کبھی اس کام تے غافل نہ اچھنا
ہے خاصا فعل اس کا بے وفائی　　سدا حاصل ہے اس تے بے صفائی
صبا اوٹ کو مہرح (صبح، سورج) کے تئیں جلائے　　ہنم کے چاند کوں نس دن گلائے
ستاریاں کوں کد عیش رکھتا کد عیش نیں　　بدل کو امن دیتا نیں گھڑی کہیں
ثریا ہو جو کئی بیٹھے ہیں ڈیرے　　نبات النعش کر ان کوں بکھیرے
اہے ہیں یار دو جن ایک تن ہو　　سٹے جوزا کے بھنے ان کوں کر دو
خوشی سوں بیٹھ جو گئی یگ پیارے　　ہو کر عقرب انوں کو ڈنک مارے
وہ بلبل جو دیکھا یک بار دانے　　پڑے ہیں جا بجا اس ٹھار دانے
کہا طالع دیتے ہیں آج یاری　　کئے ہیں بخت مجہ سوں سازگاری
مگر کیا برج میں میرے چندر ہے　　ستارے کام ہے مجہ پر نظر ہے
بہت راحت سوں کھا کر آج چارا　　کروں گا پھول کا بارے نظارا
گیا کھانے کوں وو جو بیگ بیگ رک　　پڑا یا پھاند اگلے میں آ یکا یک

اس زمانے کے دوسرے مثنوی نگاروں میں سے ایک جنیدی بھی تھا جس کی مثنوی "قصہ ابوشحمہ" صنعتی کے "قصۂ بے نظیر" کی طرز کا قصہ ہے۔ سنہ ۱۰۹۰ھ میں مرتب ہوئی اور عام طور پر اس کے مخطوطے دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن اس کی دوسری مثنوی

جس مہم کا آغاز کیا تھا، اس کے اولین نقوش بھی بہمنی خاندان کے عظیم حکمران فیروز شاہ بہمنی کے دورِ حکومت میں ملتے ہیں۔

گول کنڈہ یا حیدرآباد میں جو تمدنی اور ثقافتی فضا پیدا ہوئی تھی، وہ زوال گول کنڈہ کے بعد بھی، عہدِ آصفی کی بدولت مسلسل نشو ونما پاتی رہی۔ گذشتہ پانچ چھ دہوں میں حیدرآباد کے محققین نے گول کنڈہ کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ لیکن بیجاپور کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۶۸۶ء کے بعد اردو زبان اور کلچر کا یہ عظیم مرکز گویا مستقل طور پر ایک پس ماندہ علاقہ ہو کر رہ گیا۔ جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے گول کنڈہ اور بیجاپور دونوں دبستانوں کی خدمات یکساں اہمیت کی حامل ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی فنونِ لطیفہ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بیجاپور کا پلہ بھاری ہے۔ آج بھی بیجاپور کی بنجر سرزمین میں فنِ تعمیر کے جمیل و جلیل شاہکار اپنے شاہوں کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ بیجاپور کی گشت کیجئے تو قلب شہر اور نواح میں پھیلے ہوئے فنِ تعمیر کے جلیل اور پرشکوہ نمونوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ بیجاپور کسی زمانے میں دیووں کا شہر تھا، جہاں آج صرف انسان بستے ہیں۔ دبستانِ بیجاپور کی علمی اور ثقافتی خدمات پر ابھی تک اردو میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک قرض ہے جسے اہلِ حیدرآباد، اور جامعہ عثمانیہ کے محققین ہی کو چکانا ہوگا۔

دبستانِ گول کنڈہ کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے بارے میں چیدہ چیدہ مواد تاریخی اور ادبی کتابوں، مضامین اور مقالوں میں دستیاب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثرؔ نے مختلف کتابوں اور رسالوں سے اس موضوع پر ضروری مواد کو منتخب اور مرتب کر کے پیشِ نظر کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ یہ کتاب تاریخ و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں، اور خصوصی طور پر قدیم زبان و ادب کے طلباء اور محققین کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ مضامین اور کتابوں کے اقتباسات جو ڈاکٹر اثرؔ نے منتخب کئے ہیں، ان سے دبستانِ گول کنڈہ کے تاریخی پس منظر، شعر و ادب کی نشو ونما، شاعری کے مخصوص رجحانات، اور ممتاز

"ماہ پیکر" اب نایاب ہے جس کا ذکر اسٹیوارٹ نے اپنے کیٹلاگ میں کیا ہے۔

قطب شاہی خاندان کے آخری حکمران سلطان ابوالحسن کا عہد جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے علم وادب کی پیداوار اور ترقی کے لحاظ سے کچھ ہمت افزا نہیں تھا۔ تاہم وہ ذوق ادب جو گذشتہ دو سو سال کے عرصہ میں پایہ تخت اور ملک کے طول وعرض میں پھیل چکا تھا اس کے آثار اب بھی باقی تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے شعراء میں طبعیؔ کو خاص شہرت حاصل تھی۔ طبعیؔ ایک مشہور مثنوی "بہرام اور گل اندام" کا مصنف ہے جس کو بعض محققین غواصیؔ اور ابن نشاطیؔ کی مثنویوں کا ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں طبعیؔ گولکنڈہ کا آخری بڑا شاعر ہے اس کے بعد مثنوی نگاروں میں اس پایہ کا شاعر پیدا نہ ہوسکا۔

"بہرام اور گل اندام" کا ماخذ بہرام گور کے فارسی قصص ہیں۔ "بہرام اور حسن بانو" جو اس سے چند سال پہلے کی تصنیف ہے انداز بیان بسیط شاعرانہ توضیحات اور بیانات میں اس کی مثنوی کو نہیں پہنچ سکتی۔ طبعیؔ کی مثنوی غواصیؔ اور ابن نشاطیؔ کے دبستان کی مثنوی ہے جس میں اس طرز کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

طبعیؔ کا ایک معاصر فائز تھا جس نے ۱۰۹۵ھ میں "قصہ رضوان شاہ روح افزا" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ ظاہری اعتبار سے یہ ابن نشاطیؔ اور طبعیؔ وغیرہ کی مثنویوں کا چربہ ہے۔ لیکن اس میں وہ شاعرانہ بلند پردازی اور لطف گویائی نہیں ہے جو اس دبستان کی مثنویوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

غلام علی اس عہد کا ایک اور قابل ذکر شاعر ہے جس نے ملک محمد جائسی کی "پدماوت" کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ وہ بلند پایہ شاعر تو نہیں تھا، تاہم اس نے اپنی مثنوی کو دلچسپ اور پڑھنے کے قابل بنانے کی امکانی کوشش کی ہے۔

نصیر الدین ہاشمی

قطب شاہی دور میں اُردو ادب

اگرچہ دکن میں اردو کا آغاز بہمنی دور سے ہو چکا تھا ۔ مگر ادبی حیثیت سے قطب شاہی دور میں جو ترقی ہوئی وہ بڑی تابناک اور درخشاں ہے۔ قطب شاہی بادشاہوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے باعث اردو نظم اور نثر کے شہ کار مرتب ہوئے جو آج تک باقی ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا رہا ہے ۔

قطب شاہی بادشاہوں میں سے آخری چار بادشاہ یعنی سلطان محمد قلی قطب شاہ سلطان محمد عبداللہ اور تانا شاہ نہ صرف شعراء اور ادیبوں کے سرپرست تھے ۔ بلکہ خود بھی صاحب کمال شاعر تھے ۔ خصوصاً سلطان محمد قلی قادر الکلام شاعر تھا ۔

شاعری

قطب شاہی شعراء نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی وغیرہ کے میدان کو انھوں نے اپنی خیال آرائی کی جولانگاہ بنایا ہے ۔ اور چمنستان شعر و سخن کو سدا بہار پھولوں سے آراستہ کیا جن کی مہک آج تک اردو شاعری کی فضاء کو معطر کئے ہوئے ہے ۔

مثنوی

قطب شاہی دور کی مثنویوں کو اولاً دو اقسام پر منقسم کر سکتے ہیں یعنی فارسی سے ترجمہ کی ہوئی مثنویاں اور دوسری اپجی مثنویاں ۔ اول الذکر مثنویوں کا زیادہ ذخیرہ ہے ۔

فیروز کا توصیف نامہ۔ احمد کی لیلیٰ مجنوں۔ غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، چندا او لورک۔ ابن نشاطی کی پھول بن۔ طبعی کی بہرام و گل اندام۔ جنیدی کی ماہ پیکر۔ عاجز لیلیٰ مجنوں۔ سیوک کا جنگ نامہ۔ لطیف کا ظفر نامہ۔ باقی کا معراج نامہ۔ افضل کا محی الدین نامہ، غلام علی کی پدماوت۔ فائز کا قصہ رضوان شاہ۔ رازی کی تحفۃ النصائح وغیرہ سب کی سب فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ مگر ان شعرا نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ کمی و بیشی کر کے اپنا لیا ہے۔ ان کا ترجمہ، ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ذاتی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

دوسری اچھی مثنویاں۔ ان میں وجہی کی قطب مشتری خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے۔ وجہی نے اپنے زمانہ کے ولی عہد یعنی ہونے والے بادشاہ سلطان محمد قلی کو ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور قطب مشتری کی عشقیہ داستان لکھی ہے۔ شاہ راجو کا سہاگن نامہ اور دوسری تصوف کی مثنویاں بھی اچھی مثنویاں ہیں۔

قطب شاہی مثنویوں کو مضامین کے لحاظ سے تاریخ و سوانح، رزمیہ، عشقیہ و محبت، تصوف، پند و نصائح اور اخلاق پر منقسم کر سکتے ہیں۔

تاریخی یا سوانحی مثنویوں میں فیروز کی مثنوی توصیف نامہ، افضل کی مثنوی محی الدین نامہ قابل تذکرہ ہیں۔ ان دونوں میں قادریہ خاندان کے پیر طریقت حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے حالات و مناقب اور کرامات وغیرہ نظم کئے گئے ہیں۔ شمالی ہند میں جس طرح خواجہ معین الدین اجمیری کے معتقدین کی تعداد زیادہ ملتی ہے اسی طرح دکن میں حضرت جیلانی کے معتقدین زیادہ ہیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آغاز اردو ادب ہی سے حضرت جیلانی کے حالات مناقب اور کرامات لکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اگرچہ توصیف نامہ اور محی الدین نامہ مکمل سوانح عمریاں نہیں ہیں مگر پھر بھی ان کو اسی موضوع کے تحت پیش کرنا ضروری ہے۔

تصوف، پند و نصائح، فقہ اور عقائد اور اخلاقی مثنویوں میں تحفۃ النصائح

سہاگن نامہ، معجزہ فاطمہ، نورنامہ، معراج نامہ وغیرہ قابلِ تذکرہ ہیں۔ ان مثنویوں میں مذہبی پیرایہ میں حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی اور اچھے کردار اختیار کرنے کا سبق دیا گیا۔

جنگ نامہ، ظفرنامہ رزمیہ مثنویاں ہیں۔ ان میں محمد بن حنیفہ کو ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان مثنویوں کے علاوہ جو مثنویاں عشق و محبت کی داستانوں پر مشتمل ہیں ان میں جنگ کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اگرچہ یہ واقعات فرضی ہیں مگر جنگ وجدل اور معرکہ کی خونچکاں حکایت بڑی چابک دستی سے نظم کی گئی ہے۔ ان مثنویوں میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ مقابلہ کی روداد، معرکہ کا طریقہ، لڑائی کا نقشہ، قلعہ پر دھاوا، شب خون حملہ کی کیفیت بڑی جنگ کے ساتھ بحری جنگ وغیرہ کا حال سلیقہ سے لکھا گیا ہے۔

عشق و محبت کی جو مثنویاں ہیں ان میں قطب مشتری بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس میں قطب شاہ اور مشتری کا افسانہ نظمایا گیا ہے۔ وجہی نے اپنے تخیل کی پرواز کو بڑے اچھے انداز میں ظاہر کیا ہے۔ شاعر کے کمال فن کا اعتراف کرنا لازمی ہے۔ دوسری مثنویوں میں بزم کی رنگین محفل آرائی، عیش وطرب کی پر لطف داستاں، شاہد وساقی کی دلکشی، ہجر وفراق کی الم ناکی، وصال کی دلچسپ روداد سامنے آتی ہے۔ ان مثنویوں میں مناظر قدرت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ صبح وشام، طلوع وغروب، جنگل وبیاباں، گل وگلزار، بہار وخزاں، سمندر اور ریگستان کی عکاسی بڑے اچھے طریقے سے کی ہے گویا اصلی منظر کا فوٹو آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے

ان مثنویوں میں تسلسل بیان کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ مربوط ہیں۔ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ ملا ہوا ہے۔ کیرکٹر اور اتحاد کے کیرکٹر کے لحاظ سے ان کو کامیاب کہا جاسکتا ہے۔

عشقیہ مثنویوں کے قصے اکثر ایسے ہیں کہ عاشق معشوق سے کہیں خواب میں، یا تصویر یا کسی قصے میں دوچار ہوتا ہے اور پھر اس کی تلاش میں نکل جاتا ہے، مصیبتوں کو جھیلتا، پریشانیاں سہتا، دشت و بیاباں کی خاک۔ چھانی کرتا، ملکوں، ملکوں کی سیر و سیاحت کرتا سحر اور جادو میں پھنستا، دیووں اور پریوں سے معرکے کرتا، طلسم کشائی کرتا ہوا منزل مقصود پہونچ کر کامیاب ہوتا اور اپنے دیس کو واپس لوٹتا ہے۔

ان عشقیہ مثنویوں میں جہاں جنگ و جدل کی روئداد ہے وہاں روزمرہ معاشرت کا حال بھی درج ہے۔ ان سے اس زمانے کے رسم و رواج اور کلچر کا پتہ چلتا ہے اس وقت کی تہذیب، شائستگی اور معاشرت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

مثنویوں کے دوسرے لوازم کے لحاظ سے ان کو جانچا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نقص بہت کم ہیں انہوں نے کسی جز کو مبہم نہیں چھوڑا، جزئیات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے، حسن ترتیب کے معیار سے پرکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مسالہ کو عمدگی سے ترتیب دیا ہے اور قابلیت کے ساتھ واقعات کو مربوط کیا ہے ان سے ان کی نکتہ سنجی کا ثبوت ملتا ہے۔

بہرحال دور قطب شاہی میں مثنویوں کو بڑی ترقی ہوئی اور آج تک ان مثنویوں کو اردو کی مثنویوں کے ذخیرہ میں بلند مرتبہ دیا جاتا ہے۔

قصیدہ

تاریخوں سے اس امر کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ دکنی شعراء نے قصیدوں کا بڑا ذخیرہ مرتب کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ کے دست برد سے قصیدوں کا بڑا حصہ تلف ہو گیا ہے۔ ہم کو صرف سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ اور غواصی کے قصیدے ہمدست ہوئے ہیں۔ ان میں قصیدوں کے پورے لوازم ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے قصیدوں

میں نعت، منقبت، مدح حضرت علی، ماتم حضرت امام حسین علیہ السلام اور بادشاہ کی مدح میں پرواز تخیل دکھایا ہے۔ قصیدوں میں تمہید کی خوبی، گریز کا حسن، مدح اور ستائش میں خیالات کی بلندی قابل داد ہے۔ دعا پر یہ ختم ہوتے ہیں۔ قصیدوں میں تشبیہوں کی ندرت، استعاروں کی جدت، خیالات کی بلندی، مضامین کا طمطراق، الفاظ کی شان وشوکت موجود ہے۔

غزل جس زمانے میں دکنی شعراء نے غزل گوئی کا آغاز کیا تھا اس وقت فارسی شعرا کے تین طبقے گزر چکے تھے۔ رودکی، اسدطوسی، فردوسی، خاقانی انوری، نظامی، سعدی اور حافظ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ان کی غزلیں ایران سے نکل کر ہندوستان اور دکن تک پہونچ گئیں تھیں اور خود ہندستان میں خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم کی زمزمہ خوانی فضاء میں گونج رہی تھی۔ ان لوگوں کے کلام نے جو حسن وعشق کی روئیداد سے لبریز اور محبت والفت کی داستان سے مملو تھا دکن کے غزل گو شعرا کے لئے نمونہ کا کام دیا ہے۔

قطب شاہی عہد شعرا کی غزلیں اب تک ہمدست ہوئی ہیں ان میں سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، غواصی اور شاہ سلطان کی غزلیات شامل ہیں

غزل اپنی ساخت کے لحاظ سے بہت سارے موضوع قلم بند کرنے کی اجازت دیتی رہی ہے۔ مذہب، اخلاق، سیاست، معاشرت سب کچھ اس کے موضوع ہوتے ہیں۔ مگر اس کا غالب رجحان عشق ومحبت ہے۔ اس لئے غزل کو تغزل کا دوسرا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ولی کے بعد شمالی ہند میں جو غزل گوئی ہوئی وہ اصلیت سے دور ہوتی گئی۔ ان کا معشوق اکثر وبیشتر فرضی ہوتا تھا یا پھر بازاری، لیکن دکھنی شعرانے جو غزل سرائی کی ہے۔ اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اصلیت کو ہاتھ

سے جانے نہیں دیا۔ خصوصاً سلطان محمد قلی اور سلطان عبداللہ جو رنگین مزاج اور عاشقانہ طبیعت کے مالک تھے چونکہ شاہی قصر اور ایوان بلکہ خود گولکنڈہ اور شہر حیدرآباد حسن اور رعنائی کے مرکز تھے اس لئے فرضی معشوق کی ضرورت نہیں تھی۔

سلطان محمد قلی اپنے بچپن سے ایک عاشق مزاج اور رند مشرب شاہزادہ تھا جس کی ابتدائی زندگی سے لے کر مرنے تک معشوقوں میں بسر ہوئی۔ سلطانی محل میں ہر ایک ملک اور ہر مذہب کی عورتیں جمع تھیں۔ اگر ان میں دکن اور گجرات کی نازک بدن اور گل اندام رانیوں کی فراوانی تھی تو وہیں ایران اور ترکستان کی گل رخسار اور گل رخ حرموں کا بھی جمگھٹ تھا۔ ہر وقت عیش و نشاط کی محفل گرم رہا کرتی۔ دلکش نغمہ نوازی دماغ کو مسرور کرتی قلب کو سرور پہنچاتی ' مے ناب کے دور مدہوش کرتے۔ بقول ڈاکٹر زور اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں خوبی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں ان میں کئی ملکوں اور کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنینیں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش اور زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کا مظاہرہ کرتی رہتی تھیں۔ سلطان محمد قلی کے غزلوں میں عشق و محبت کی روئداد معشوق کا سراپا یعنی حسن و عشق کی شیریں اور پر تکلف رنگین داستان کے ساتھ وصال کے پر کیف و سرور موقع ایسے عریاں الفاظ میں پیش کئے ہیں کہ کسی مصور کو بھی ایسے عریاں فوٹو پیش کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

راز و نیاز کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو سلطان محمد قلی کی جولانی قلم سے چھوٹ گیا ہو۔

اسی طرح اس کے نواسہ سلطان عبداللہ کا دور حکومت بھی اس کے نانا کی

دیا دیتا زہ کرتا تھا۔ جب بادشاہ اس قسم کے شاہد و ساقی پسند ہوں تو ظاہر ہے کہ اہل ملک بھی حسن و عشق کے میدان میں جولانیاں پیش کئے بغیر نہیں رہتے۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ چالیس ہزار رقاصائیں اور ماہر موسیقی اس زمانہ میں حیدرآباد و گولکنڈہ میں موجود تھے۔ بہرحال غزل گو شعراء کے لئے خیالی اور فرضی معشوق کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ حقیقت نگاری کرتے تھے۔

غزل کی نشو و نما، ارتقاء اور مقبولیت کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ غزل اس وقت مقبول عام ہوتی اور پسند کی جاتی ہے جبکہ وہ عاشقانہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہو۔ جن اشعار میں محبت کا عنصر غالب ہوتا ہے وہ بہت زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔

قطب شاہی غزلوں میں یہی پہلو نمایاں رہا ہے۔ اس عہد کی غزلیں "غم جاناں" کی تفسیر کرتی ہیں۔ غم دوراں کا ماتم ان کے غزلوں میں نہیں ملتا۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ غزلوں کا جو ذخیرہ ہمدست ہوا ہے وہ سلطان محمد قلی، غواصی، سلطان عبداللہ اور حضرت شاہ سلطان کا ہے۔ ان میں ایک طرف عشق مجازی کی داستان سنائی گئی ہے تو وہاں عشق حقیقی کا بھی رجحان ملتا ہے۔ خود سلطان محمد قلی کا بیان ڈاکٹر زور کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے۔

"میرے عشق مجازی کو دیکھ کر نقاش ازل نے مجھ پر رحم کیا۔ مجھے استاد نے ایک اور ہی تعلیم دی اور میں نے کچھ دیکھ کر ہی زنار باندھا ہے۔ میرے دل میں جو درد ہے اس کو اغیار نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اپنے عشق حقیقی کو کب تک چھپاؤں جب کہ منصور سا عاشق بھی اس کو چھپا نہ سکا۔"

خواجہ حافظ اور عمر خیام کو بعض اصحاب رند خراباتی تصور کرتے ہیں اور

بعض صوفی صافی تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح سلطان محمد قلی کو بھی وہی درجہ اور مرتبہ دیا جا سکتا ہے جو حافظ یا عمر خیام کو دیا جا سکتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ نے بھی خواجہ حافظ کی غزلوں کا ترجمہ کیا ہے اور اپنے نانا کے نقش قدم کی پیروی کی ہے۔ شاہ سلطان ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کا دیوان تصوف سے مملو ہے۔ غواصی نے بھی اپنے عہد کی پیروی کی ہے۔

قطب شاہی دور کے شعرا نے اصناف شاعری کی دوسری شاخوں یعنی رباعیات، مخمس، مثلث وغیرہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی صراحت یہاں متروک کی جاتی ہے۔

مرثیہ قطب شاہی دور میں مرثیہ کو بھی ترقی ہوئی ہے چونکہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اہل بیت رسالت سے بڑی محبت تھی اور وہ دل و جان سے ان پر فدا تھا۔ نہ صرف اس کے پایہ تخت حیدرآباد بلکہ اضلاع اور دیہات میں عاشور خانے بنائے گئے تھے جہاں ماہ محرم میں مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں مرثیے پڑھے جاتے تھے اور واقعات شہادت سنائے جاتے۔ اس زمانے کے اکثر شعراء نے مرثیے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ خاص مرثیہ گویوں کی ایک جماعت تھی جو صرف مرثیے لکھا کرتی اور سناتی تھی۔

سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، غواصی، کاظم، مرزا وغیرہ کے مرثیے ہم دست ہو چکے تھے اب نواب سالار جنگ کے کتب خانہ سے عبدالجلیل جلیل کے مرثیوں کا ایک مجموعہ ہمدست ہوا ہے جو (۳۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مرثیے، سلام، نوحے وغیرہ درج ہیں۔

بیجاپور کے مرثیے گو شعرا نے عنوانات کے تحت مرثیے لکھے تھے مگر گولکنڈہ کے

شعراء نے اس کی پیروی نہیں کی ہے۔ ان کے مرثیے اکثر بلا عنوان ہیں لیکن ان میں اصغرؑ کا ماتم' قاسمؓ کی شادی' شہر بانو کا الم بے کس' دے بس زینب' ظلم دشت کربلا کے مضامین ملتے ہیں جو اپنے سوز و گداز رنج و الم کے لحاظ سے اردو مرثیوں میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں صفائی کے ساتھ ترنم اور تسلسل بھی موجود ہے۔ اسلوب بیان کی شگفتگی کے ساتھ ان میں نہ صرف مرثیہ پن ملے گا بلکہ ادبیت بھی موجود ہے۔ بعض میں مکالمہ کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ زمانہ مابعد میں لکھنؤ میں مرثیوں کو جو ترقی ہوئی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر دکنی شعراء نے اپنے مرثیوں میں مرثیہ پن کی جو بات رکھی ہے وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ مرثیوں کی تاریخ میں ان کو بلند مقام دیا جانا چاہیئے۔

نثر نگاری شاعری کے بعد جب ہم نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ قطب شاہی دور میں نہ صرف تصوف' فقہ' اور عقائد کے مسائل اردو نثر میں لکھے گئے ہیں بلکہ طویل افسانہ بھی نثر میں لکھا گیا۔ وجہی وہ خوش نصیب اور خوش قسمت شخص ہے کہ جہاں اس کی نظم قطب مشتری دونوں رسم الخط میں طبع ہوئی وہاں اس کی نثر کی داستان "سب رس" بھی دونوں میں شائع ہو کر ہمدردان اردو سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔

قطب شاہی دور کو اردو کی تاریخ میں اس لئے زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے کہ نہ صرف شاعری کے میدان میں ترقی اور وسعت ہوئی بلکہ نثر نگاری میں بھی ترقی ہوئی اور پہلی نثر کی داستان اسی دور میں لکھی گئی۔

قطب شاہی دور کا اردو ادب اپنی گوناگوں ترقی کے لحاظ سے تاریخ اردو میں آب زر سے لکھا جائے گا جس کو زمانہ مٹا نہیں سکتا۔ نہ صرف آندھرا پردیش میں بلکہ جہاں جہاں اردو مروج ہے قطب شاہیوں کی اردو نوازی درخشاں رہے گی۔

شعراء کے کارناموں کے علاوہ قطب شاہی عہد کی ثقافتی اور تمدنی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے ۔

ڈاکٹر محمد علی اثر ایک نوجوان محقق ہیں ۔ دکنی زبان و ادب پر ان کا مطالعہ وسیع ہے اس سے قبل گولکنڈہ کے ملک الشعراء غواصی پر ان کی ایک کتاب منظر عام پر آچکی ہے جسے علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے ۔ اثر صاحب کا اہم تحقیقی کام "دکنی غزل کی نشو و نما" ہے یہ مقالہ جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے دکنیات کے ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ محمد علی اثر ایک وقف شدہ طالب علم ہیں اپنی اسی خوبی کی بدولت وہ نوجوان لکھنے والوں میں ممتاز نظر آتے ہیں ۔ سستے نام و نمود کے ماحول میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ کے علمی اور تحقیقی معیار کا پاس رکھا ہے ۔ پیش نظر کتاب ایک وقیع علمی کاوش ہے جس کے لئے ڈاکٹر محمد علی اثر قابل مبارک باد ہیں ۔

(پروفیسر) غلام عمر خاں
شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

۱۹/جون ۱۹۸۱ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

ملا وجہی ــــ قطب شاہی عہد کا ایک باکمال شاعر و ادیب

ملا اسداللہ وجہی[1] (م۔ ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء) محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء بھی تھا اور بادشاہ کی طرح پُرگو رندِ شاہد باز بھی۔ وہ فارسی کا شاعر بھی تھا اور شاعری اور نثر میں بھی اس نے اپنے کمالِ فن کا اظہار کیا ہے۔

وجہی کے بچپن میں محمود، فیروز اور خیالی کی شہرت، نئے طرزِ سخن کے باعث سارے گولکنڈہ میں پھیل چکی تھی۔ "سب رس" کے ایک قلمی نسخے کے ترقیمے میں لکھا ہے کہ مولانا وجہی چشتی کے پیر شاہ علی متقی کے پیر میاں شاہ باز این ہمہ چشتی گزراست[2]۔ علی متقی ملتانی ۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء میں وفات پاتے ہیں اور محمود کے پیر میاں شاہ باز ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء میں۔ گویا وجہی شاعروں کی اس نسل و روایت سے تعلق رکھتا ہے جو محمود اور فیروز کے فوراً بعد ابھری یہ بعایت "پیروی فارسی" کی روایت تھی جس میں فارسی اسالیب، اصنافِ سخن اور بحور کو

---

[1] دیوان وجیہہ، فارسی مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں یہ شعر ان کے تمام تخلص پر روشنی ڈالتا ہے

اسم اسداللہ وجہی است تخلص آرایش و مگانِ چشم بازا کلام است

[2] تذکرہ مخطوطات (جلد دوم) ادارہ ادبیات اردو صفحہ ۲۲۳

اپنانے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا جا رہا تھا کہ شاعری میں سلاست ہونی چاہیئے۔ شعر میں ربط ہونا چاہیئے اور ایسے الفاظ شاعری میں استعمال کرنے چاہیں جنھیں اساتذہ استعمال کر چکے ہیں۔ لفظ و معنی کا باہمی رشتہ شاعری کی خوبی ہے۔ الفاظ منتخب اور معنی بلند ہونے چاہئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وجہی دوسرے دکنی شعراء کی طرح صرف دکنی معاصرین سے اپنا مقابلہ نہیں کرتا، بلکہ سارے "ہندستان کے شعراء سے کرتا ہے۔

نہ پہنچے نہ پہنچا ہے گن گیان میں
سو طوطی منج ایسا ہندوستان میں

وجہی سے کئی تصانیف یادگار ہیں "دیوان وجہیہ" (فارسی) کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ مثنوی قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء) اور نثر میں "سب رس" (۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء) شائع ہو چکی ہیں ان کے علاوہ قدیم بیاضوں میں چند غزلیں بھی ہماری نظر سے گزریں جو "قطب مشتری" اور "سب رس" کی غزلوں کے علاوہ[1] ہیں۔ ایک اور تصنیف "تاج الحقائق" بھی وجہی سے منسوب کی جاتی ہے جو یقیناً وجہی کی تصنیف نہیں ہے۔ کہیں کہیں سب رس اور تاج الحقائق کے موضوعات ایک دوسرے سے ضرور ٹکرا جاتے ہیں لیکن یہ وہ موضوعات ہیں جو اس زمانے میں عام تھے اور ان کی تاویل ہر شخص اپنے اپنے انداز میں کرتا تھا۔ تاج الحقائق[2] کی ابتدا ہی میں لکھا ہے کہ "کلام مولانا وجیہہ الدین محمد۔۔۔ جنو کی بات خدا کی بات میں سند" اس کتاب کو ۱۸۵۷ء میں سید البصار علی شاہ ابن سید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

---

[1] نیاز فتح پوری مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ "کلیات وجہی" کے نام سے ایک مخطوطہ نیشنل میوزیم کراچی پاکستان میں موجود ہے جو باوجود کوشش کے مجھے نہ مل سکا۔ (جمیل جالبی)

[2] تاج الحقائق (قلمی) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

اکبر علی شاہ قادری نے عام فہم زبان ہندی میں لکھا اور اس کا سبب تالیف آخر میں یوں بیان کیا۔

"یہ کتاب حضرت مولانا وجیہہ الدین صاحب قدس سرہٗ نے دکنی زبان میں لکھی تھی، سو اس کے الفاظ دکھنی ہر شخص کی سمجھ میں برابر نہیں آتے تھے۔ سو اس فقیر الحقیر نے پرتو سے بزرگوں کے اس رسالہ دکھنی کو ہندی زبان میں جو رواج خلق اللہ کا ہے، سو لکھا کہ اس زبان ہندی سے پڑھ کر سمجھیں اور فیض پاویں۔"[1]

ان شواہد کی روشنی میں "تاج الحقائق" کو ملا وجہی سے منسوب کرنا "تحقیقی اندھیر" ہے۔

وجہی کی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء) اردو کی قدیم ترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" بہمنی دور کی تصنیف ہے جس کا زمانۂ تصنیف ۸۲۵ھ و ۸۳۹ھ / ۱۴۲۱ء-۱۴۳۵ء کا درمیانی زمانہ ہے۔[2]

احمد گجراتی کی "یوسف زلیخا" جو محمد قلی قطب شاہ کے سامنے پیش کی گئی تھی ۹۹۸ھ / ۸۹ء سے پہلے کی تصنیف ہے۔ بیجاپور کے عبدل کا "ابراہیم نامہ" ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء کی تصنیف ہے لیکن ان سب مثنویوں کو سامنے رکھ کر جب ہم "قطب مشتری" کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ زبان و بیان کے اعتبار سے زیادہ نکھری

---

[1] تاج الحقایق: قلمی انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

[2] مخطوطات، انجمن ترقی اردو، جلد اول مرتبہ افسر امروہوی، ص ۳۷۱

ہوئی اور جدید اسلوب کی روایت سے قریب تر نظر آتی ہے

"قطب مشتری" محمد قلی قطب شاہ اور "مشتری" کے عشق کی داستان ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام "قطب مشتری" رکھا گیا ہے۔

"قطب مشتری" کے قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔ دعاؤں کے بعد ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ جوان ہوا تو اس کے حسن اور بہادری کی دھوم مچ گئی ایک رات خواب میں اس نے ایک پری رو کو دیکھا اور ہزار جان سے خوابوں کی شہزادی پر عاشق ہو گیا۔ اب جو آنکھ کھلی تو عجب عالم تھا۔ سوائے رونے کے اسے کوئی چیز نہیں بھاتی' بادشاہ کو معلوم ہوا تو بہت پریشان ہوا۔ شہزادے کے لئے کرناٹک گجرات، چین، ماچین اور ایران کی شہزادیوں کو جمع کیا اور کہا ـــ

قطب شہ کوں جیسکوئی ریجھائے گی ۔ تمام تر سب میں دو پائے گی

لیکن شہزادے پر کسی کا جادو نہ چلا۔ بادشاہ نے شہزادے سے کرید کرید کر پوچھا تو اس نے اپنے خواب کا قصہ سنایا۔ اب تو بادشاہ کو اور فکر دامن گیر ہوئی اس نے مشورے کے لئے "عطارد" کو طلب کیا۔ عطارد اپنے زمانے کا لاثانی مصور اور ساری دنیا کا سفر کئے ہوئے تھا۔ بادشاہ کی بات سن کر عطارد نے کہا کہ اس وقت دنیا کی حسین ترین دوشیزہ بنگالے کی شہزادی مشتری ہے۔ اس کی ایک بہن زہرہ ہے جو حضرت داؤد سے زیادہ خوش الحان ہے۔ اس نے کہا کہ مشتری کی ایک تصویر بھی اس کے پاس ہے تصویر لاکر بادشاہ کو دکھلائی۔ بادشاہ نے شہزادے کو دکھائی۔ تصویر دیکھ کر شہزادہ پہچان گیا کہ یہی وہ خوابوں کی پری ہے۔ اب شہزادہ اور عطارد سوداگر بن کر سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ دوران سفر میں مصائب جھیلتے ہیں۔ کبھی طوفان بلاخیز میں پھنس جاتے ہیں کہیں پہاڑ جیسے اژدہوں سے مقابلہ ہوتا ہے' کہیں عابد و عابدہ سے ملاقات

ہوئی ہے اور کہیں بادشاہ مغرب کی بیٹی ہے۔ چلتے چلتے ایک ایسے مقام سے بھی گزرتے ہیں جہاں ایک راکسس رہتا تھا۔ شہزادہ اس کے قلعے کی طرف جاتا ہے تو وہاں اسے ایک آدم زاد ملتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ یہ راکسس جہاں بھی آدم زاد کو دیکھتا ہے پکڑ لیتا ہے اسے بھی اسی نے قید کر رکھا ہے اور وہ حلب کے بادشاہ سرطان خان وزیر اعظم اسلاخان کا بیٹا ہے۔ مریخ خان نام ہے خواب میں ایک پری رو کو دیکھ کر عاشق و دیوانہ ہو گیا ہے اور اسی پری رو کی تلاش میں جس کا نام زہرہ ہے اور جو بنگالہ کی شہزادی ہے، نکلا ہے جو لوگ ساتھ تھے وہ دغا دے گئے۔ اب میں اکیلا اس خرابے میں قید ہوں۔ پوچھنے پر محمد قلی نے اپنا حال بیان کیا اور کہا کہ اب ہم دونوں دوست ہیں۔ اور ان دو مچھلیوں کی طرح ہیں جو ایک ہی جال میں پھنس گئی ہوں ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے سے راکسس آتا دکھائی دیتا ہے۔ شہزادہ آیۃ الکرسی کا حصار باندھتا ہے اور جنگ کر کے راکسس کو قتل کر دیتا ہے۔

اب یہ بحر سفر پہ روانہ ہوتے ہیں اور "قطعہ گلستاں" میں پہونچتے ہیں جو پریوں کا علاقہ ہے یہاں مہتاب پری شہزادی پہ عاشق ہو جاتی ہے اور شہزادے کو محل میں بلواتی ہے۔ شہزادہ دوران ملاقات راکسس کو ہلاک کرنے کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ یہ سن کر مہتاب بڑی خوش ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ آج وہ بھی آزاد ہو گئی ہے۔ اس پر محفل عیش کا حکم دیا جاتا ہے اور شراب کا دور چلتا ہے۔ مثنوی میں وجہی یہ شعر لکھتا ہے۔

کہ معشوق جاں نیں وہاں بھائے کیوں	پیالا پیا بن پیا جائے کیوں

شہزادہ مہتاب پری کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہوتا ہے تو عطارد قطب شاہ سے بنگالہ جانے کی اجازت طلب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد شہزادے کو وہاں

بلوائے گا۔ عطارد بنگالہ پہونچتا ہے اور شہزادی کے محل کے قریب ایک جگہ لے کر مصوری شروع کر دیتا ہے۔ اس کے کمالِ فن کی شہرت سارے ملک میں پھیل جاتی ہے اور مشتری اسے بلوا کر محل کو آراستہ کرنے کا حکم دیتی ہے۔ عطارد دن رات لگ کر محل کو آراستہ کرتا ہے۔ مشتری دیکھتی ہے تو دنگ رہ جاتی ہے۔ اتنے میں اس کی نظر ایک تصویر پر پڑتی ہے؟ عطارد بتاتا ہے کہ قطب شاہ کی تصویر ہے لیکن ایک پری اس پر عاشق ہو گئی ہے مشتری بے حس کر رونے لگتی ہے۔ عطارد یہ دیکھ کر کہتا ہے کہ وہ اسے جلد بلوادے گا اور شہزادے کو بلوانے کے لئے آدمی بھیجتا ہے۔ جیسے ہی شہزادے کو اطلاع ملتی ہے وہ مہتاب پری سے اجازت لے کر روانہ ہو جاتا ہے۔ مہتاب اسے بطور نشانی "ترنگ باد پا" دیتی ہے بنگالہ پہونچ کر مشتری سے ملاقات ہوتی ہے۔ شراب کا دور چلتا ہے اور دونوں اتنے مست ہو جاتے ہیں کہ عطارد کو کہنا پڑتا ہے کہ اے شہزادے ع

تیرا مال ہے توں اُتاول نہ کر

شہزادہ مریخ خاں کا حال بھی بیان کرتا ہے اور طے ہوتا ہے کہ زہرہ سے شادی کر کے بنگالہ کی بادشاہی مریخ خاں کو دے دی جائے۔ اس کے بعد قطب شاہ مشتری کے ہمراہ دکن روانہ ہوتا ہے اور وہاں ان دونوں کی دھوم دھام سے شادی ہوتی ہے اور باپ اپنی سلطنت قطب شاہ کو دے دیتا ہے۔ وجہی نے وصال کا جو بھرپور نقشہ رمزیہ انداز میں کھینچا ہے وہ اردو شاعری میں یکتا اور بے مثال ہے۔

اب اس قصے کو داستانوں کے عام مزاج و ہیئت سے ملا کر دیکھئے تو اس میں سوائے جزئیات کے کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ یہ عمل قرونِ وسطیٰ کے سارے ادبیات میں تہذیبی فرق کے ساتھ یکساں ملے گا۔

"قطب مشتری" شاعری کے اس معیار پر پوری اترتی ہے جس کا اظہار مثنوی کے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ابتدائی حصے میں "در شرح شعر گوید" اور "وجہی تعریف شعر خود گوید" کے تحت کرتا ہے۔ اس مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت روانی و ربط ہے۔ ایک شعر دوسرے شعر میں اس طرح پیوست ہے جیسے ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں۔ اسی وجہ سے اسے روانی اور تیزی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ داستانی مثنوی میں روانی اور بہاؤ کا تخلیقی عمل مثنوی کی کامیابی داستان آفرینی کے لئے از بس ضروری ہوتا ہے۔ جب ہم نے مثنوی کے چند حصوں کو ایک ایسے شخص سے پڑھوا کر سنا جس کی مادری زبان دکنی تھی، تو وجہی کے لہجے کے بھاؤ اور تیور کے اتار چڑھاؤ سے نہ صرف قصے میں دلچسپی بڑھ گئی بلکہ شعر کی موسیقی و آہنگ نے بھی ہمیں متاثر کیا۔ زبان کی قدامت اور اجنبیت کے پردے اٹھ گئے، شعریت کا احساس گہرا ہو گیا اور زبان و بیان سلیس نظر آنے لگے "قطب مشتری" کی سلاست کا احساس اس وقت اور ہو سکتا ہے جب اسے اس دور کے دوسرے شعراء کے کلام کے ساتھ پڑھا جائے اس وقت یہ بات محسوس ہو گی کہ یہاں زبان و بیان نکھر رہے ہیں، زبان منجھ کر صاف ہو رہی ہے۔ الفاظ میں جذبہ و معنی کو سمیٹنے کی قوت بڑھ رہی ہے اور "ہیروی فارسی" کی روایت تیزی سے فاصلے طے کر رہی ہے۔

"قطب مشتری" میں ایک فن کارانہ شعور کا بھی احساس ہوتا ہے۔ معلوم ہے کہ شاعر تخلیق کرنے سے پہلے جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟ یہ شعور ہمیں محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں نہیں ملتا، وہ ایک چڑیا کی طرح گاتا چلا جاتا ہے لیکن وجہی کے ہاں یہ شعور، شعر کو بنانے سنوارنے پر زور دینے کے عمل میں نظر آتا ہے۔ ایک جگہ خود بھی کہتا ہے

اگر خوب محبوب جیوں سور ہے　　سنوارے تو نور علیٰ نور ہے

تخلیقی عمل کے اسی شعور نے وجہی کے ہاں سلاست بیان کو پیدا کیا ہے۔ آج "قطب مشتری" صرف تاریخی اہمیت کی حامل ہے لیکن جب اسے آج سے تقریباً چار سو سال

پہلے کے دور میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور اس کا مقابلہ اس دور کی شاعری سے کرتے ہیں تو وجہی قدیم دور میں صف اول کا شاعر اور یہ مثنوی اس دور میں ایک کارنامہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ دور گولکنڈہ میں فارسی رنگ و آہنگ کی جذب پذیری کا دور ہے۔ تہذیب کا بیرونی ڈھانچہ اور اس کا باطن دونوں فارسی طرزِ احساس کو تیزی سے قبول کر رہے ہیں۔ وجہی فارسی طرزِ احساس کی اسی روایت کے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جو آگے چل کر ولی دکنی کی روایت ریختہ سے جا ملتی ہے۔

"قطب مشتری" نہ صرف نئی روایت، مثنوی کی ہیئت، قرونِ وسطیٰ کے داستانوی مزاج، نئے رنگِ سخن اور زبان و بیان کے جدید اسلوب بلکہ شاعری کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اس میں جذبات و احساسات کو موزوں الفاظ اور خوب صورت تشبیہات کے ذریعے پیش کرنے کا عمل ملتا ہے۔ حسبِ ضرورت منظر کشی بھی ہے اور بات کو اثر آفرینی کے ساتھ بیان کرنے کا سلیقہ بھی۔ جذبات کے رنگا رنگ پہلوؤں کو اپنے بیانیہ انداز میں اس خوب صورتی سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے میں شاعرانہ مسرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مشتری قطب شاہ کی تصویر دیکھتی ہے اور عاشق ہو جاتی ہے آنسو آنکھوں سے جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو وجہی یوں بیان کرتا ہے ؎

رتن تھے سو تن پر انگارے ہوئے — کہ جیوں چاند انجھو سو تارے ہوئے
دو بادام تھے اس پنچھی نار کے — لگے دانے جھڑنے سو انار کے

آنکھوں کو دو بادام کہنا اور آنسوؤں کے جھڑنے کو انار کے دانوں سے تشبیہ دینا کتنا خوب صورت خیال ہے۔ قطب شاہ مریخ خاں سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ مشتری کی چھوٹی بہن زہرہ کے عشق میں دیوانہ ہے اور دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ وجہی اس کا اظہار اس طرح کرتا ہے ؎

تیرا ہور میرا سو یک حال ہے — دو مچھلیاں بچاریاں کوں یک جال ہے

قطب شاہ راکسس پر تیر چلاتا ہے اور وہ زمین پر گر پڑتا ہے۔ وجہی اس منظر کو یوں بیان کرتا ہے ؎

کشش کو جو شہ تیر مارے سو دو پڑیا جیوں پہ تل سیمر اپر پانو لیجو
الٹ یوں دسے زخم کھا سیمر میں کہ جیوں عکس اچھے جھاڑ کا نیر میں
فرنگ میاں لتے کاڑی شہ جان یوں نکلتا ہے کنچلی میں تے سانپ جیوں

قطب شاہ مہتاب پری سے ملاقات کرنے جاتا ہے تو وجہی مہتاب کے حسن کی یہ تصویر بتاتا ہے۔

اچھیں نین اس کیس کالے سنے کہ مچھلیاں دو نیڑیاں ہیں جالے منے
اچھلتیاں ہیں بجلیاں اچھالاں تلیں کہ نیناں جھلکتے ہیں بالاں تلیں
دسے لالک اس نین نچ یوں ستور کہ سرخی مٹی کی سفید آب پر
سٹے لال ڈوریاں سوں پتلی کجل کہ مرنگ کے گھر میں آیا زحل
سو دھن کے تن اوپر دسے یوں گہر کہ بیٹھے ہیں جگنے مگر سرو پر
یوں عیش تے پھول جیوں کھیل کر پلنگ پر وہ بیٹھے دونوں میل کر
پلنگ شاہ کے تیں جو ڈال لیائے تھے سورج چاند جیسے اسے پائے تھے
سو اس سات مل یوں وہ شہ جان تھے کہ بلقیس سو جیوں سلیمان تھے
سکی شاہ سوں ایک ہو یوں اچھے کہ مٹھائی سوں مل شکر جیوں اچھے
دسے یوں نل اس مکھ میدان میں کہ حبشی بچے ہے گلستان میں

وجہی نے مہتاب پری کے حسن کی تصویر کو ہر شعر میں ایک نئی تشبیہ کے ذریعے ابھارا ہے اور مثنوی میں جس مقام پر یہ تصویر آتی ہے وہاں یہ رنگ سخن مثنوی کے حسن حسن و اثر میں غیر معمولی اضافہ کرتا ہے وجہی کا تخیل احساس، جذبے اور کیفیت کی تصویر اتنی

پیش لفظ

اردو زبان و ادب کا دکنی دور، صحت مند ادبی رجحانات اور مخصوص شعری روایات کی وجہ سے اردو کی ادبی تاریخ میں ایک نمایاں اور منفرد مقام کا حامل ہے۔ جہاں تک دبستان گولکنڈہ کا تعلق ہے، یہاں کے فن کاروں نے اپنی تخلیقات میں دکنی شعر و ادب کے رجحانات اور روایات یعنی سادگی بیان اور حقیقت نگاری کا ایسا مظاہرہ کیا ہے، جس کی نظیر بعد کے ادوار میں مشکل سے ملے گی۔ کم و بیش تمام قطب شاہی سلاطین شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے رسیا تھے، خصوصاً محمد قلی قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ نے نہ صرف اپنے عہد کے شاعروں ادیبوں اور اہل کمال کی سرپرستی کی بلکہ خود انہوں نے بھی دکنی زبان میں طبع آزمائی کی ہے۔ سلاطین کے علاوہ قطب شاہی عہد کے دیگر شعراء اور ادیبوں میں فیروز، محمود، خیالی، وجہی، غواصی، احمد، عاجز، جنیدی، بلاقی، ابن نشاطی، شاہ راجو فائز، میراں یعقوب، عبداللہ، عابد شاہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے قدیم شعر و ادب کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔

دکنی ادب پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں بیشتر نایاب ہو گئی ہیں۔ قطب شاہی عہد کے ادب اور

صفائی کے ساتھ اتارتا ہے اور اس تصویر میں لفظوں کے ذریعہ مناسب رنگوں سے ایک ایسا "زندہ پن" پیدا کرتا ہے کہ شاعری اپنی دلکشی سے ہمیں مسحور کر دیتی ہے۔ قطعہ گلستان کی تصویر بھی، جو حسنا "سب رس" کا مقام ہے اس طور پر لفظوں سے بناتا ہے کہ مصور موقلم سے اسے کاغذ پر منتقل کر سکتا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ "اردو" ابھی "دکنی" کی منزل سے گزر رہی ہے اور "ریختہ" کی منزل ابھی تقریباً ایک صدی کی مسافت پر ہے۔ لیکن وجہی روایت کی اسی شاہراہ پر چل رہا ہے جس پر ہم آج بھی رواں ہیں۔

وجہی کی دوسری شاہکار تصنیف "سب رس"

"سب رس" (۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء) اردو میں "ادبی" نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ اس سے پہلے کی جو نثری تصانیف ملتی ہیں وہ مذہبی نوعیت کی ہیں اور ان میں وہ ادبی شان نہیں ہے جو "سب رس" کا طرۂ امتیاز ہے "قطب مشتری" محمد قلی قطب شاہ (م۔۔ ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء) کی وفات سے دو سال پہلے لکھی گئی اور "سب رس" اس کے ستائیس سال بعد عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ/ ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۲۵ء / ۱۶۷۲ء) کی فرمائش پر لکھی گئی "سب رس" کے زمانۂ تصنیف میں عمر آگہی جس کی ذہانت و شاعرانہ صلاحیتیں "قطب مشتری" کے زمانۂ تصنیف ہی میں وجہی کو پریشان کرنے لگی تھیں، اور جس پر اس نے دریدہ "قطب مشتری" میں چوٹیں بھی کی تھیں، اپنی شہرت کے بام عروج پر پہونچ کر عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء بن چکا تھا اور بے چارہ وجہی محمد قلی کی وفات کے بعد سے فقر گمنامی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ برسوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وجہی کے ہاتھ یہ ایک ایسا نادر موقع آیا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر کے بادشاہ کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کرے کہ وہ بھی کچھ ہے۔ یہ خود پرستی وجہی کی گھٹی میں پڑی تھی۔ "قطب مشتری" میں اور "سب رس" میں بھی اس نے اپنی تعریف میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

"سب رس" محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی تصنیف "دستور عشاق" (۸۴۰ھ / ۱۴۳۶ء) کے نثری خلاصے "قصۂ حسن و دل" سے ماخوذ ہے۔ فتاحی کی اس تصنیف اور اس کے موضوع کی شہرت اتنی پھیل گئی تھی کہ اس نے اسی قصے کو مسجع و مقفیٰ نثر میں جو ۵۰۴ سطروں پر مشتمل ہے دوبارہ لکھا اور ۸۴۳ھ / ۱۴۳۹ء میں اپنی دوسری تصنیف "شبستان خیال" میں بھی پیش کیا۔ یہ تصانیف اتنی مقبول ہوئیں کہ سروری (م۔ ۹۶۹ھ / ۱۵۶۱ء) نے ترکی زبان میں "شبستان خیال" کی شرح لکھی۔ ترکی زبان کے دوسرے شاعروں مثلاً جمری لامعی (۹۳۸ھ / ۱۵۳۱ء) آہی ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء اور وہالی نے بھی دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اس کی تقلید میں تصانیف کیں۔ آرتھر براؤن (ڈبلن ۱۸۰۱ء) اور ولیم پرائس نے ۱۸۲۸ء میں اسے انگریزی زبان میں شائع کیا۔ جرمنی زبان میں ڈاکٹر روڈولف ڈوراک نے ۱۸۸۹ء میں اسے شائع کیا اور اسی کے ساتھ فتاحی کی سوانح عمری، تخیلہ کے بارے میں ایک مضمون اور "قصۂ حسن و دل" کی تمثیل کا خلاصہ بھی شائع کیا۔ ادھر آر ایس گرین شیلڈ نے "دستور عشاق" کو مرتب کر کے اصل متن کو اپنے مختصر انگریزی مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں لندن سے شائع کیا۔ عہد عالم گیری میں خواجہ محمد عبداللہ نے ۱۰۹۵ھ / ۱۶۸۳ء میں مرصع نثر فارسی میں اسے لکھا (۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء میں داؤد ایلچی نے اسے فارسی میں لکھا اور بحر العرفان حسین ذوقی نے ۱۱۰۹ھ / ۱۶۹۷ء میں "وصال العاشقین" کے نام سے دکنی اردو میں نظم کیا۔ ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۲ء میں جبری بیجاپوری نے بھی اسے اپنی مثنوی کا موضوع بنایا۔ غرض کہ اپنی تاریخ تصنیف سے تقریباً تین سو سال تک یہ کتاب ایران، ترکی اور برعظیم کے اہل علم و ادب کو دعوت فکر و نظر دیتی رہی اور انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل تک یورپ کے ماہرین ادب کو متاثر کرتی رہی۔

قرین قیاس ہے کہ یہ مشہور و معروف تصنیف عبداللہ قطب شاہ کی نظر سے بھی گزری

ہوگی اور اس نے "دقائق عشق بازی" کو "حسن و دل" کے انداز میں 'دکنی' میں لکھنے کی ملا وجہی سے فرمائش کی ہوگی "عشق" اس تہذیب کا محبوب ترین موضوع تھا جس کے ہزار پہلو اور ہر پہلو کے ہزار نکتے تھے۔ وجہی نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ "سب رس" اس نے "حسن و دل" کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ لیکن موضوع کی یکسانیت، رنگِ تمثیل، اندازِ تحریر، خود قصہ حسن و دل کی اس دور میں مقبولیت اور تقابلی مطالعے سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ "سب رس"، "قصہ حسن و دل" ہی کا ثمر اردو ہے "سب رس" ایک تمثیل ہے جس کی طرف خود وجہی نے بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ "ناموس بو لیا کر اس تازے آبِ حیات کا قصہ ایگے تا دیل دھرتا ہے ایک تمثیل دھرتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ہم "سب رس" کا بہ حیثیت تمثیلی داستان و نثر جائزہ لیں ضروری ہے یہ دیکھ لیا جائے کہ تمثیل کیا ہے؟ اسے اتنی مقبولیت اس دور میں کیوں حاصل ہوئی اور اس کے بعد اردو میں تمثیل کا کوئی اور قابلِ قدر نمونہ کیوں نہیں ملتا؟ اس بات کے جواب کے لئے ہماری نظر پروفیسر عزیز احمد کے اس فاضلانہ مضمون کی طرف جاتی ہے جس میں انہوں نے تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ عزیز احمد نے لکھا ہے کہ "بیانیہ ادب کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جس میں حکایت یا بیان بیک وقت واحد دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ بیان کے ایک حقیقی معنی ہوتے ہیں اور ایک مجازی۔ حقیقی معنی کے مختلف پہلوؤں کو مجازی اجسام دے دیئے جاتے ہیں اور ان اجسام کے تعلق، حرکت یا تصادم سے حقیقی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے بیانیہ ادب کو مثالیہ (تمثیل) کہتے ہیں۔ تمثیل کی ایک قسم وہ ہے جس میں ظاہری کردار حیوانات ہوتے ہیں لیکن ہر حیوان کسی انسانی صفت کا مظہر ہوتا ہے "کلیلہ دمنہ" "انوارِ سہیلی" اور یورپ کے وہ تمام قصے

FABLIAUSE اور BESTRANIS

کے دائرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح کے ہیں مولانا روم کی مثنوی میں جانوروں والی حکایات کو بھی

اسی زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ فریدالدین عطار کی مشہور زمانہ تصنیف "منطق الطیر" اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کی مثنوی "سلامان و ابسال" اور چاسر کی تصنیف "پارلیمنٹ آف فاؤلز" بھی تمثیل کی مثالیں ہیں۔ ایسے قصوں اور تمثیل میں ایک مشترک بات یہ ہے کہ یہاں بھی قصے کی ایک ظاہری اور ایک باطنی سطح ہوتی ہے۔ ظاہری معنی مجازی ہوتے ہیں اور باطنی معنی حقیقی ہوتے ہیں اور کردار ان معنی کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان قصوں کا تعلق افلاطونی فلسفے سے واضح ہے کیونکہ یہ قصے "معین" کی ایک ناقص شکل کو پیش کرتے ہیں جس سے اصلی "معین" کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔

کسی زبان یا تمدن کا ادبی تسلسل دنیا بھر کے ادب کے تسلسل کا محض ایک حصہ ہے اور اس لحاظ سے "دستورِ عشاق" یا "سب رس" کا قصہ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ "سب رس" کے قصوں کا افسانوں کے ایک ایسے عالم گیر سلسلے سے تعلق ہے جو ایران سے آئرلستان تک پھیلا ہوا ہے یہ سلسلہ تلاش و تجسس کے افسانوں کا ہے۔ کبھی یہ تلاش کسی پھول کی ہوتی ہے جو پھول بھی ہے اور کوئی بڑی ہی بے مثل حسینہ بھی جیسے بکاؤلی" یا "رومن ڈی لاروز" کا گلاب۔ یہ ایک طرح سے رازِ عشق یا رازِ حیات یا راز حسن کی تلاش بھی ہے۔ کبھی تلاش کے قصوں میں ہیرو کا مقصود کوئی ظرف مقدس یا نایاب پتھر ہے جو اعلیٰ ترین شوکت و شاہانہ شاہانہ کا رمز ہے۔ قدیم فارسی داستانوں میں یا "فرِ شاہانہ" کی تلاش ہے۔ تلاش کے قصوں کا ایک گروہ وہ ہے جس میں چشمۂ آب حیات کی تلاش ہے یہ خضر اور سکندر کے قصوں کے علاوہ عبرانی اور اسلامی ادب میں بھی اکثر ملتا ہے۔ پھول اور چشمۂ آب حیات میں یقیناً تعلق ہے تمام علامات کی تلاش یقیناً ایک حد تک مربوط ہے بکاؤلی پھول بھی ہے چشمہ بھی ہے اور عورت بھی "سب رس" کے قصے میں چشمۂ آبِ حیوان چشمۂ دہن ہے مغربی ادب میں بھی اسی طرح کا چشمہ اکثر ملتا ہے جیسا کہ پرانے قصوں جیسے "رومن ڈی لاروز" "ہیرو" "لیلیٰ اینڈ زداق"

زمی گسا" کے چشمے اور آئینے ۔ دونوں کا مشرقی داستانوں کے چشمۂ آبِ حیوان اور آئینۂ اسکندری سے تعلق معلوم ہوتا ہے اور آئینۂ سکندری کے وہی خصائص ہیں جو جمشید کے جام جہاں نما کے ہیں ۔ مثالیہ دراصل قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت سے وابستہ ہے۔ اسی لئے "سب رس" کے بعد اردو میں مثالیہ (تمثیل) کے اور نمونے تو ملتے ہیں مگر وہ اس صنفِ ادب کا انحطاط ظاہر کرتے ہیں ۔ مثالیہ عشق کی حد تک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف اردو میں بلکہ فارسی میں بھی یہ "قصہ حسن و دل" اتفاق ہی سے لکھا گیا ۔ لیکن فارسی اور اردو غزل کے ایک ایک شعر میں اسی رودادِ عشق کے مختلف واقعات دہرائے جاتے ہیں اس لئے تعجب کی بات نہیں کہ پھر الگ سے اس قسم کے اور مثالیہ لکھنے کا کسی کو خیال نہیں آیا[۱]، "ایہام اور اشاریت نے غزل کے ذریعے رفتہ رفتہ اتنا فروغ حاصل کر لیا کہ بیانیہ ادب میں مثالی رجحان گھٹتا چلا گیا اور ادھر خود بیانیہ ادب میں طلسماتی داستان کو اتنا فروغ ہوا کہ مثالیہ کے لئے گنجائش ہی باقی نہیں رہی ۔ اس لئے "گلزار نسیم"[۲] میں ہمیں بیانیہ کے ایسے مقامات ملتے ہیں جو دراصل علامات و رموز ہیں مثلاً خود بکاولی کی رمزیت یا رموزیت سے پہلے کی مثالی خصوصیت سب بالکل محو ہو چکی ہیں اور طلسم اور داستان کا جزو بن چکی ہیں ۔ اس طرز مثالیہ اور داستان میں میں رشتہ ضرور ہے مگر یہ رشتہ انحطاط کا ہے کیونکہ رفتہ رفتہ مثالیہ کی جگہ طلسمات نے لی ہے[۳] مشرقی افسانے میں طلسمات مقصود بالذات بن گئے ۔ یہ رفتہ رفتہ اسی حیرت کدے کی تعمیر میں وہی خدوخال ابھر آئے جو مشرقی فن تعمیر مشرقی مصوری اور مشرقی غزل میں نمایاں ہیں یعنی متعین روایات اور اشکال کی بار بار تکرار جب اسلامی تمدن پر زوال آیا اور

۱-۲-۳- سب رس کے ماخذ و ملاخلات: ص ۸-۹، ص ۱۰۹، ص ۶،۷، ص ۱۰۴، ص ۱۰۹، ص ۱۱۰

مغربی تمدن کی فتح سے پہلے اس کی جگہ لینے والی کوئی اور زندہ تمدنی اساس باقی نہ رہی تو تمثیلیہ کا تو خاتمہ ہو گیا اور تلاش کا موضوع طلسمات کی نذر ہو گیا جو انحطاط کا انتہائی درجہ تھا[۵۱] یہ عمل "سب رس" میں نہیں ہے۔ یہاں تمثیل اور اس کا رنگ ڈھنگ خالص رہتا ہے۔

تمثیل کی نوعیت، خصوصیت اور "سب رس" کو آفاقی روایت کے ساتھ ملا کر دیکھنے کے بعد "سب رس" میں بیان کئے ہوئے قصے کا خلاصہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تاکہ اس کی تمثیل اور صفات واضح ہو جائیں۔ قصے کا مقام سیستان ہے۔ یہ تمثیلی مقام نہیں ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جو رستم کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے مشہور ہے مگر "سب رس" میں یہاں کے بادشاہ کا نام "عقل" بتایا جاتا ہے کائنات کے ذرے ذرے کا اس کے تابع فرمان ہونا جو ہمارے قصوں کی عام بات ہے، عقل کے سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس بادشاہ کا ایک لڑکا "دل" ہے جس کا نام تمثیل ہو بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی لیکن اس نام میں اس وقت تمثیلی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب بتایا جاتا ہے کہ عقل نے دل کو تن کی مملکت بخش دی ہے۔ اس ابتدائیے کے بعد قصہ شروع ہو جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ "عقل" کے دربار میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں اور شراب کا دور چل رہا ہے کہ "آب حیات" کا ذکر آ جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ جو شخص آب حیات پئے وہ حضرت خضرؑ کی طرح تا ابد زندہ و قائم رہے۔ یہ سن کر دل آب حیات حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے اور یہاں سے تلاش کا وہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو تمثیلی قصوں میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

---

[۵۱] ۔ سب رس کے مآخذ و مماثلات۔ ص ۱۰۹، ۱۱۰

دل کا جاسوس نظر ہے جو ہر جگہ پھرتا ہے اور ہر پل کی خبر لا کر دیتا ہے۔ چنانچہ قصّے کا دوسرا منظر یہ ہے کہ دل نظر سے آبِ حیات کا ذکر کرتا ہے اور نظر وعدہ کرتا ہے کہ اس کا پتا لگانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا۔ دل کو نظر کی باتوں سے بڑا سکون ملتا ہے۔ وہ اس کے عزم و حوصلہ کی داد دیتا ہے اور اُسے آبِ حیات کی تلاش میں روانہ کر دیتا ہے

اب نظر کا سفر شروع ہوتا ہے۔ چلتے چلتے وہ ایک نہایت خوبصورت شہر میں پہونچتا ہے جس کا نام "عافیت" ہے اور جس کے بادشاہ کو "ناموس" کہتے ہیں یہ بادشاہ بڑا مہمان نواز ہے۔ نظر اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا قصہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بغیر آبِ حیات لئے اپنے ملک "تن" میں واپس نہیں جاؤں گا۔ ناموس اس کے عزم سے متاثر ہو کر آبِ حیات کی لمبی چوڑی تعریف تو ضرور کرتا ہے لیکن اسے حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں بتاتا۔ نظر اس سے رخصت لے کر اپنی راہ لیتا ہے۔ چلتے چلتے وہ ایک اونچے پہاڑ کے پاس پہونچتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس پہاڑ کا نام زُہد ہے اور اس پر رزق نام کا ایک بوڑھا رہتا ہے۔ نظر اس بوڑھے کے پاس جا کر آبِ حیات کا پتہ دریافت کرتا ہے۔ رزق کہتا ہے کہ آبِ حیات کا چشمہ تو جنت میں ہے۔ اور تم اسے زمین پر تلاش کر رہے ہو۔ اگر تم اس کا پتا لگانا چاہتے ہو تو اس کی نشانیاں عاشقوں کے آنسوؤں میں دیکھو۔ نظر رزق کی بات مانتا تو ضرور ہے لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اسے تلاش کر کے رہے گا۔

یہاں سے چل کر نظر ایک جنگل میں پہونچتا ہے جہاں اسے ایک فلک بوس قلعہ نظر آتا ہے۔ اس قلعے کا نام ہدایت ہے اور اس کا بادشاہ ہمت ہے۔ نظر ایک مدت تک ہمت کی خدمت کرتا رہتا ہے اور ایک موقع پا کر اس سے آبِ حیات کا ذکر کرتا ہے۔

نظرا اور ہمت کے درمیان بات چیت دلچسپ ہے۔ ہمت نظر کی ہنسی اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ آبِ حیات کا پتا بتانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ جو شخص بھی اسے حاصل کرنے کا خیال رکھتا ہو اسے منع کرو۔ مجنوں، یوسف، زلیخا نے اس کی تلاش کی اور کچھ نہ پایا میں ہمت ہوں لیکن میں بھی اس کا سراغ نہ لگا سکا۔ نظر ان باتوں سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ کہتا ہے آپ "ہمت" ہیں میری مدد کیجئے، شاید آپ میرا امتحان لے رہے ہیں ردنیا میں کوئی ایسا کام نہیں ہے جو آپ نہ کر سکیں۔ نظر کی بات سے خوش ہو کر ہمت بتاتا ہے کہ مشرق میں ایک ملک ہے۔ اس کا بادشاہ عشق ہے جو ہر دل میں رہتا ہے اور جو انسان کو خدا سے بھی ملوا سکتا ہے۔ اس کی ایک بیٹی ہے جس کا نام حسن ہے ہمت حسن کے اوصاف بیان کرنے میں بالکل شاعر ہو جاتا ہے۔ یہاں تمثیل نگار حسن کی صفات کو بھی اشخاص میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ناز، غمزہ، عشوہ، ادا، دلربائی، خوش نمائی اور لطافت کو حسن کی سہیلیاں بتایا گیا ہے حسن شہر دیدار میں رہتی ہے یہاں ایک باغ ہے جس کا نام رخسار ہے جس میں دہن نام ایک چشمہ ہے۔ اس میں آبِ حیات ہے جسے حسن روز پیتی ہے ہمت شہر دیدار تک پہونچنے کی دشواریوں کا بھی ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ راستے میں تمہیں سنگسار نام کا ایک شہر ملے گا۔ اس شہر کا محافظ رقیب ہے جو عشق بادشاہ کا تابع فرمان ہے اور کسی کو ملکِ عشق کی طرف جانے نہیں دیتا۔ لیکن اگر تم سنگسار کو پار کر لوگے تو تمہیں میرا بھائی قامت ملے گا جو تمہاری مدد کرے گا۔ ہمت اپنے بھائی قامت کے نام ایک خط بھی دیتا ہے۔

نظر وہاں سے مشرق کی طرف روانہ ہوتا ہے اور جب شہر سنگسار کی سرحد پر پہونچتا ہے تو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اور رقیب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے یہاں نظر عقل سے کام لیتا ہے اور عقل سے پتھر کو بھی موم بنایا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر تمثیل میں ایک الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ شروع میں عقل کو بادشاہ بتایا گیا ہے اگرچہ وہ کسی ہاتف غیبی کی

طلسم ح یہاں آنا تو تمثیل قائم رہتی مگر نظر خود کو عقل کا پتلا بتا کر کہتا ہے کہ وہ حکیم ہے سر تا پا علم ہے اور مردہ میں جان ڈال سکتا ہے، مٹی سے سونا بنا سکتا ہے۔ رقیب جسے سونے کا بڑا لالچ ہے، یہ سنتے ہی کہتا ہے کہ مجھے بہت سا سونا بنا دو۔ اب نظر کو اپنا مقصد حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور کہتا ہے کہ سونا بنانے کے لئے دواؤں کی ضرورت ہے جو دیدار نامی شہر کے رخسار نامی باغ میں مل سکتی ہیں۔ رقیب اس کے ساتھ چل کر دوائیں جمع کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ نظر اور رقیب دونوں شہر دیدار پہنچتے ہیں۔ یہاں نظر کی قامت سے ملاقات ہوتی ہے جو اسے رقیب کے ساتھ دیکھ کر تعجب کرتا ہے۔ نظر اپنا سارا قصہ بیان کرتا ہے اور ہمت کا خط چپکے سے قامت کو دے دیتا ہے۔ خط پڑھ کر قامت سیم ساق کو حکم دیتا ہے کہ وہ رقیب کی آنکھ بچا کر نظر کو چھپا دے۔ سیم ساق نظر کو فرش فرح بخش کے نیچے چھپا دیتا ہے۔ رقیب نظر کو ہر جگہ تلاش کرتا ہے اور آخر کار مایوس ہو کر اپنے شہر واپس ہو جاتا ہے۔

نظر اب شہر دیدار کی سیر کو نکلتا ہے۔ شہر کا حسن اسے محو حیرت کر دیتا ہے۔ قامت اور نظر ابھی سیر میں محو ہیں کہ شہزادی حسن اپنی سہیلی لٹ کے ہمراہ دکھائی دیتی ہے۔ لٹ نظر کو دیکھ کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو اور اس طرح گھبرا گھبرا کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ نظر اسے اپنے مقصد سے آگاہ کرتا ہے تو وہ کہتی ہے "گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو مراد بر آئے گی" وہ نظر کو اپنے بال بھی دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو ان کو جلانا میں تمہاری مدد کو آ جاؤں گی۔ شہزادی حسن کے ساتھ ایک خادم غمزہ بھی ہے جو نظر کو دیکھ کر اس پر جھپٹتا ہے، تلوار کھینچ کر اسے مارنے ہی والا ہوتا ہے کہ نظر کے بازو پر بندھے ہوئے لعل پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ غمزہ کو یاد آتا ہے کہ

وہ اپنے بھائی کو پہچان لیتا ہے۔ دونوں بھائی جو بچپن سے جدا ہو گئے تھے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر روتے ہیں شہزادی حسن غمزہ کو بلا کر نظر کے بارے میں پوچھتی ہے غمزہ اس کا تعارف کراتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کا بھائی جواہرات پرکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

شہزادی حسن نظر کو اپنے پاس بلاتا ہے اس سے ایک انمول ہیرا پرکھواتی ہے۔ اس ہیرے میں ایک تصویر ہے جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، مگر نظر اسے دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ دل بادشاہ کی تصویر ہے اور یہ سنتے ہی حسن دل پر فدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ نظر سے تنہائی میں اپنے عشق کا حال بیان کرتی ہے اور کہتی ہے جس طرح بھی ہو مجھے دل سے ملا دو۔ نظر کے لئے اپنے مقصد کے اظہار کا موقع ہاتھ آتا ہے اور کہتا ہے کہ دل کو یہاں لانا محال ہے۔ اس کے والد عقل نے اسے تن کے قلعے میں قید کر رکھا ہے اس کو بلانے کی بس ایک ہی ترکیب ہے۔ بادشاہ آب حیات کی تلاش میں ہے اگر آپ آب حیات کا پتہ بتائیں تو وہ اسے حاصل کرنے یہاں ضرور آئے گا۔ شہزادی وعدہ کرتی ہے کہ اگر دل یہاں آ جائے گا تو وہ اسے آب حیات تک ضرور پہونچا دے گی۔ اس کے بعد وہ اپنے غلام خیال کو نظر کے ہمراہ دل کے پاس روانہ کرتی ہے اور نظر کو اپنی ایک انگوٹھی بھی دے دیتی ہے

خیال اور نظر شہر تن میں آتے ہیں۔ نظر دل سے اپنے سفر کا حال بیان کرتا ہے دل کو معلوم ہوتا ہے کہ خیال مصور بھی ہے اور اس کے پاس حسن کی تصویر ہو آتا ہے تصویر دیکھتا ہے تو دل حسن پر عاشق ہو جاتا ہے اور حسن کو حاصل کرنے کے لئے شہر تن سے روانہ ہونے کی تیاریاں کرتا ہے اس وقت عقل کا بادشاہ کا وزیر وہم یہ سوچ کر کہ اگر دل نظر اور خیال کے کہنے پر چلا تو